''چہارسُو''

..... ربِ کائنات .....

حمد وثنائے باری تعالیٰ اور نعتِ رسولؐ پاک کہنا توفیقِ الٰہی کے بغیر ممکن نہیں جبکہ عشقِ مجازی اور ارضی حوالے ہمارے مشاہدے کی بدولت شعر کہنے میں ہمارے معاون ہوتے ہیں مگر نعت گوئی کا مرحلہ کچھ اور تقاضے ہمارے سامنے لاتا ہے اور اس سے بڑھ کر حمدِ باری تعالیٰ کہنے سے پہلے عقیدۂ توحید کی حقیقت سمجھنا پڑتی ہے۔ ہم بندۂ عاجز، کم نظر اور بے عمل اس کی بارگاہ میں اظہارِ عجز ہی کر سکتے ہیں اور توفیقِ خداوندی کے بغیر ایک مصرع بھی کہنا مشکل ہو جاتا ہے یہی وجہ ہے کہ حمدیہ کلام اور مجموعہ ہائے حمد کم بہت ہی کم نظر آتے ہیں، اردو شاعری میں صنفِ نعت کو تسلیم کر لیا گیا مگر حمدیہ کلام کو تبرک کے طور پر قبول کیا گیا ہے اس کے باوصف اسے ایک صنف ضرور مانا ہے مگر اس پر تنقیدی اندازِ نظر اور لفظی اور معنوی پرکھ سے متعلق مواد نہ ہونے کے برابر ہے، سخنوروں نے غزل کے ساتھ نعت نگاری کی اور اب نعت کا تنقیدی جائزہ لینے کی ضرورت پیش آئی چنانچہ ایک تحریک کی صورت میں کام ہو رہا ہے مگر حمد کو صنفِ سخن تسلیم کیے جانے کے باوصف نقد ونظر کا دامن خالی ہے۔ حمد گوئی کی طرف بھرپور توجہ دینا ضروری ہے امید ہے کہ ہمارے شعراء اللہ تعالیٰ سے اپنی بے پناہ محبت کا ثبوت پیش کرنا لازمی تصور کریں گے۔

..... حسن عسکری کاظمی

اشاعت:۲۰۱۹ء، قیمت:۴۰۰روپے،، دستیابی:206۔ بلاک J-III، واپڈا ٹاؤن، لاہور۔

..... کوئی تو ہوتا .....

ہر چند زمانہ قدیم سے انسان ماورائی، غیر حسی، تخیلی اور توہماتی فریب کاریوں وشعبدہ بازیوں کا حقیقت کے مماثل یقین کرتا رہا ہے مگر اٹھارویں صدی میں حقیقت پسند فلاسفہ نے ان سب کو باطل قرار دے کر مکانی، وجودی، حسی، واقعاتی اور میکانکی اشیاء یا بالوجود قوتوں کی اہمیت کو باور کرواتے ہوئے توضیح کی کہ مظاہرِ فطرت جیسے دکھائی دیتے ہیں ویسے ہی ہیں ناظر کے بغیر بھی وہ اپنے وجود کے تئیں اپنے آپ میں فعال سرگرمی کے حامل ہیں اور انہیں ویسے ہی بیان کرنا چاہیے جیسے وہ ذہن پر نقش ثبت کرتے ہیں۔ زیرِ نظر کتاب کا لکھاری ایک فعال نوجوان ہے جس نے اپنے تاثرات، تجربات ومشاہدات کو حقیقت پسندانہ انداز میں سپردِ قلم کیا ہے۔ اسے سرگزشت یا داستانِ دل قرار دیا جا سکتا ہے۔ بہ باطن ایک کہانی ہے مگر بہ ظاہر متعدد اجزاء میں منقسم ہے یہ اجزاء ایک دوسرے پہ منحصر بھی ہیں اور مختلف بھی۔ ایک بات طے شدہ ہے کہ یہ سرگزشت، عذابِ دید، لذتِ آشنائی اور اذیتِ تنہائی کا استعارہ ہے جسے سادہ، عام فہم، والہانہ اور بے باکانہ انداز میں تحریر کیا گیا ہے۔ خوش آئند بات یہ ہے کہ بعض مقامات تخلیقی امکانات کا اشارہ دیتے ہیں۔ بہ ایں وجہ قلم کار سے مزید اچھے کی توقع کی جا سکتی ہے۔ اپنے ہونے کے نقشِ اول کی اشاعت پر میں انہیں مبارک باد دیتا ہوں اور بہت سی دعائیں۔

.....ڈاکٹر غلام شبیر اسد

اشاعت:۲۰۱۹ء، قیمت:۳۰۰روپے، دستیابی: مثال پبلشرز، امین پور بازار، فیصل آباد۔

..... تلاشِ جمال میں گمشدہ عورت .....

فرخندہ کا زیادہ تر سروکار ماجرا رہا ہے۔ جی ایسا ماجرا جیسے وہ محض کیمرے کی آنکھ سے نہیں بتا سکتی تھیں۔ یہ ماجرا لکھتے ہوئے وہ کہیں کہیں خود بھی راوی کے ساتھ موجود ہوتی ہیں۔ ایسے میں کہانی کہیں ٹھہر جاتی ہے اور کہیں کوئی نہ کوئی منظر قاری کے ایک نقطۂ نظر قائم کرنے کے لیے ایزاد کر دیا جاتا ہے۔ فرخندہ شمیم عمدہ مقررہ بھی ہیں، شاید یہی سبب رہا ہوگا کہ ان کی کہانیوں میں بولتے ہوئے اور توجہ کھینچتے ہوئے جملے اپنی جگہ بناتے رہتے ہیں۔ زندگی کے بھیدوں کو انہوں نے ہر طرح کے گرداروں کے ذریعے یکساں قرینے سے کھولنے کی روش کو اختیار کیا ہے۔ وہ انسانی سماج کا بہت باریک بینی سے مشاہدہ کرتی ہیں اور عین عین اسے قرطاس پر لکھ دینے کے بجائے ان کرداروں سے وابستہ ہو کر لکھتی ہیں جو زندگی میں بچھڑ گئے ہوتے ہیں۔

.....محمد حمید شاہد

اشاعت:۲۰۱۹ء، قیمت:۲۵۰روپے، دستیابی: فرہاد پبلی کیشنز، کمال آباد، راولپنڈی۔

N.P.R- 063

زندگی کے ساتھ ساتھ

چہارسُو

جلد۲۸،شمارہ:نومبر،دسمبر ۲۰۱۹ء

بانی مدیراعلیٰ

سید ضمیر جعفری

مدیر مسؤل

گلزار جاوید

❍☆❍

مدیران معاون

بینا جاوید

فاری شا

محمد انعام الحق

عروب شاہد

آمنہ علی

مجلسِ مشاورت

❍☆❍

قارئین چہارسُو

❍☆❍

زرِسالانہ

❍☆❍

دلِ مضطرب نگاہِ شفیقانہ

رابطہ:537/D-1، گلی نمبر 18، ویسٹریج-III، راولپنڈی، 46000، پاکستان۔

فون:(+92)-51-8730633-8730433

موبائل:(+92)-336-0558618

ای۔میل:chaharsu@gmail.com

۔ ویب سائٹ ۔

http://chaharsu.wordpress.com

پرنٹر: فیض الاسلام پرنٹنگ پریس ٹرنک بازار راولپنڈی

متاعِ چہارسو

سرِ ورق، پسِ ورق۔۔۔۔۔۔۔شعیب حیدر زیدی
تزئین۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔عظمیٰ رشید
کمپوزنگ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ تنویرالحق

قرطاسِ اعزاز

نگاہِ کرم۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔آمنہ انعام ۶
جی سی یونیورسٹی کی یادیں۔۔۔۔۔۔۔۔۔اختر شمار ۷
براہِ راست۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔گلزار جاوید ۹
قیامت کی گھڑی۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔فاری شا ۱۵
جیون تیرے نام۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ڈاکٹر وزیر آغا ۱۸
عمرِ رواں ٹھہر جائے۔۔۔۔۔۔۔۔خواجہ ندیم اسلم ۲۰
عہدِ شباب میں پیری ۔۔۔۔۔۔ڈاکٹر نجیب جمال ۲۶
محبت علم کا ماتھا ہے۔۔۔۔۔۔۔۔میاں عزیز قریشی ۳۱
یہ آغاز محبت ہے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔سجاد بخاری ۳۳
محبتوں کا شاعر۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ڈاکٹر نثار ترابی ۳۴
آدابِ خودآ گاہی۔۔۔۔۔۔۔۔جمیل احمد عدیل ۳۷
خوش بختی کا ستارہ۔۔۔۔۔۔۔ڈاکٹر صغریٰ صدف ۳۹
آنکھ ٹھہری ہوئی تھی۔۔۔۔۔۔۔اشفاق احمد ورک ۴۰
عذاب آنکھوں کا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔عطیہ سکندر علی ۴۲
وقت کی آنکھ (افسانہ)۔۔۔۔۔۔۔۔اختر شمار ۴۵
اشکوں کے چراغ۔۔۔۔۔۔۔۔۔محمد انعام الحق ۴۸

افسانے

تم نہیں سمجھو گے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔انل ٹھکّر ۵۰
کیس ہسٹری۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔طاہرہ اقبال ۵۵
چھاپے پہ چھاپا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔شمع خالد ۶۱
صندل کی خوشبو۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔رخسانہ صولت ۶۳
مٹھی میں جگنو۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔فرح کامران ۶۴
کارپوریٹ سیکٹر۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔گلزار جاوید ۷۰

بروزِ حشر

پنڈت ہری چند اختر، غالب عرفان، حسن عسکری کاظمی، رؤف خیر، آصف ثاقب، ہارون الرشید، اشرف جاوید، واصف حسین واصف، عظیم بخت، عارف شفیق۔ ۷۷

زہریلا انسان

ناول کا ایک باب۔۔۔۔۔۔۔۔۔تابش خانزادہ ۸۲

چندن کا بدن

شگفتہ نازلی، وشال کھلّر، افتخار راغب، ابراہیم عدیل، نیلم ملک، عامر عبداللہ، سیفی سرونجی، رومانہ رومی، نوید سروش، سبھاش گپتا، احسان قادر، اصغر شمیم۔ ۹۰

ابرِ نوبہار

سگریٹ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ظفر قریشی ۹۴

زندگی نایاب ہے

دھڑکن کی بے قاعدگی۔۔۔۔۔۔ڈاکٹر فیروز عالم ۹۶

نشانِ راہ

اردو شاعری کی بندگلی۔۔۔۔۔۔۔عبداللہ جاوید ۹۸

آئینۂ فن

روشن صدی کی بات۔۔۔۔۔۔۔۔غلام قادر آزاد ۱۰۱
چراسرناول۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ڈاکٹر احمد علی جوہر ۱۰۳

روشنی کا سفر

علم وعرفان کا خزینہ۔۔۔۔۔۔۔۔ڈاکٹر رحمان اختر ۱۰۴

تقدس کی خوشبو

اقتدار جاوید، مشیر طالب، یوگیندر بہل، فیصل عظیم، ڈاکٹر ریاض احمد، شگفتہ نازلی، انیس الرحمٰن، شوق انصاری، فرخندہ شمیم۔ ۱۰۸

ایک صدی کا قصہ

مالا سنہا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ دیپک کنول ۱۱۴

رس رابطے

جستجو، ترتیب، تدوین۔۔۔۔۔۔۔۔وجیہ الوقار ۱۱۸

☆

قرطاسِ اعزاز

ڈاکٹر اختر شمار

کے نام

دونوں سے میں بچ کر تیرے خواب وخیال سے گزر گیا
دل کا صحرا ایک طرف تھا آنکھ کا دریا ایک طرف

جس سے بھی پیار کیا جاتا ہے
دشمنی کر مگر اُصول کیساتھ

اُس کا شجرہ نہیں دیکھا جاتا
مجھ پہ اتنی سی مہربانی ہو

کوئی دیکھے تو رستہ ہے زمانہ
میرے معیار کا تقاضا ہے

مگر مشکل سے دکھتا ہے زمانہ
میرا دشمن بھی خاندانی ہو

محبت علم کا ماتھا ہے اس پر
دل ہے ویران سی گلی کی طرح

دمکتا سا ستارا ہے زمانہ
تم ہی آ جاؤ اجنبی کی طرح

نہ تم رہ گئے ہو نہ ہم رہ گئے ہیں
میری دھڑکن میں رقص کرتی ہیں

فقط اپنے نقشِ قدم رہ گئے ہیں
ایک آواز روشنی کی طرح

ساری خلقت ایک طرف تھی
چاندنی پر خلا کے دامن میں

اور دیوانہ ایک طرف تھا
میں نے آنکھوں سے اس کو لکھا تھا

موت کا بھید جو پا لیتے ہیں وہ لوگ شمار
رات آئی تو تیری یاد کے خیمے کو

زیست کے سارے جھمیلوں سے نکل جاتے ہیں
ہم نے آدھا بچھایا آدھا اوڑھ لیا

یا دشتِ تیرگی مرے کاسے میں ڈال دے
پلکیں اٹھا کے دیکھ تو لے

یا روشنی کو میری ضرورت شمار کر
پاس کھڑا ہے سائل چُپ

اپنے اشکوں میں سجا کر وہی چہرہ رکھا
چشمِ گردوں سے ٹپکتا ہو آنسو اختر

میں نے آنکھوں میں محبت کا اُجالا رکھا
رات کے ہونٹوں پہ اک حرفِ دعا لگتا ہے

میں نے جب اُس کی ہتھیلی پہ ستارا رکھا
اک نظر ڈال کبھی میرے مسیحا مجھ پر

چاند نے بڑھ کے مرے پاؤں پہ ماتھا رکھا
تیرا کیا جائے گا بیمار کو اچھا کر کے

اب حبسِ مسلسل کا مداوا ہے ضروری
اے محبت کے مراحل سے گزرنے والے

دروازہ نہیں گرتا تو دیوار گرا دے
تو نے آنسو کبھی دیکھا ہے ستارا کر کے

''نگاہِ کرم''

(ڈاکٹر اختر شمار کا کلامِ عجز)

آمنہ انعام (راولپنڈی)

☆

بہت دل دُکھا ہُوں نگاہِ کرم ہو سکُوں چاہتا ہُوں نگاہِ کرم ہو
بجھا آئنہ ہُوں نگاہِ کرم ہو نظر ڈھونڈتا ہُوں نگاہِ کرم ہو
کہاں جاؤں میرا تو کوئی نہیں ہے غلام آپؐ کا ہُوں نگاہِ کرم ہو
بنا دیجیے میری منزل مدینہ فقط راستہ ہُوں نگاہِ کرم ہو
عطا اپنی پہچان ہو یا نبیؐ جی مَیں خود سے جدا ہُوں نگاہِ کرم ہو
عطا ہو کوئی اِذنِ اثر و رسائی مَیں گونگی دُعا ہُوں نگاہِ کرم ہو

..... ○ .....

☆

تقدیر یوں بھی اپنی سنوارو علیؑ علیؑ
ہر پل اُسی کی دُھن میں گزارو علیؑ علیؑ

نادِ علیؑ کے وِرد میں کس کیفیت میں ہو
اے جھلملاتے شب کے ستارو! علیؑ علیؑ

اُس کے سِوا تو کچھ بھی نہیں کائنات میں
ہر سمت ایک جلوہ ہے یارو علیؑ علیؑ

منکر نکیر آ کے جو تم سے کریں سوال
اُن کے حضور عرض گزارو علیؑ علیؑ

گزری ہے جس گھڑی سے وہ مہکی ہُوئی کِرن
خود کو اُس ایک پل میں اُتارو علیؑ علیؑ

بگڑے تمام کام سنورنے لگیں شمارؔ
تم دل سے ایک بار پکارو علیؑ علیؑ

○

رضائے حسینؓ

کہاں کہاں نہیں وردِ زباں رضائے حسینؓ
سبھی جہانوں پہ رحمت فشاں رضائے حسینؓ
ہمیشہ جاری و ساری ازل سے تا بہ ابد
کہ جیسے وقت کا دریا رواں رضائے حسینؓ
زمان و کون و مکاں میں کہاں نہیں موجود
جہاں پہ کوئی نہیں ہے وہاں رضائے حسینؓ
کبھی خیال و ارادہ، کبھی وہ عزم و یقیں
کہیں نگاہ، کہیں ہے زباں رضائے حسینؓ
اسی اشارۂ ابرو سے چل رہا ہے نظام
سمجھ سکو تو ہے کارِ جہاں رضائے حسینؓ
اُسی کے نور سے قائم ہے روشنی کا وجود
مہ و ستارہ میں جلوہ کناں رضائے حسینؓ
جو دیکھ پاؤ تو سمجھو نمازِ عصر کا وقت
سنو تو کرب و بلا کی اذاں رضائے حسینؓ

○

جی سی یونیورسٹی کی یادیں

ڈاکٹر اختر شمار

کیا زمانہ تھا۔ گورنمنٹ کالج لاہور شعبہ اردو میں کمرہ نمبر ے میں بابو خان کی چائے کے لیے اساتذہ کلاسز کے بعد اکٹھے ہوا کرتے تھے۔ جن دنوں راقم جی سی میں شعبہ اردو سے وابستہ تھا ان دنوں ڈاکٹر معین الرحمٰن صدر شعبہ اردو ہوتے تھے۔ میں نے دیال سنگھ کالج سے تبادلے کے بعد یہاں جائن کیا تھا۔ مستقل اور پارٹ ٹائم اساتذہ میں اصغر ندیم سید، ڈاکٹر سلیم اختر، ڈاکٹر احسان الحق، ڈاکٹر نیّر صمدانی، ڈاکٹر سعادت سعید، حق نواز، محمد فاروق، بشیر قادری، محمد اشرف منج، ڈاکٹر محمد خان اشرف، شفیق عجمی، عارف ثاقب، ثاقف نفیس، طارق زیدی، ہارون قادر موجود تھے۔ بعد میں اسی شعبے کے طالب علموں میں سے خالد سنجرانی، محمد سعید، نسیمہ الرحمٰن بھی منسلک ہو گئے تھے۔ بابو خان کے کمرے میں ایک رونق سی رہتی تھی۔ جس کسی پروفیسر کا پیریڈ ختم ہوتا چائے کے لیے یہاں پہنچ جاتا۔ یہاں سے سبکدوش ہونے والے اساتذہ میں سے کبھی کبھی صابر لودھی، جعفر بلوچ، اختر میرٹھی، مرتضیٰ زیدی اور چند دیگر حضرات بھی دکھائی دیتے۔ اشرف منج اور بشیر قادری کی آپس کی نوک جھوک بھی جاری رہتی۔ عارف ثاقب، ڈاکٹر احسان الحق کی گفتگو اور اصغر ندیم سید کے چٹکلے بھی ان محفلوں میں سننے کو ملتے۔ بابو خان خاموشی کے ساتھ ہر آنے والے کے لیے چائے لا رکھتے۔ ان کے ہونٹوں پر ہر وقت ایک مسکراہٹ کھیلتی رہتی تھی۔ وہ پروفیسروں کے بحث و مباحث کو چپ چاپ سنتے اور زیرلب مسکراتے رہتے۔ یہاں سب سے اونچی آواز اشرف منج کی ہوتی۔ خاص طور پر اس وقت جب بشیر قادری اپنے محلے دار اشرف منج کی کوئی بات سنا رہے ہوتے تو اشرف صاحب چیخ اٹھتے اور وضاحتوں سے کمرہ سر پر اٹھا لیتے۔

''اوہ نئیں قادری صاحب!!

آپ ادھوری بات کر رہے ہیں۔ میں ڈاکٹروں کے خلاف نہیں ہوں۔ میں انہیں قصائی کہتا ہوں تو ان کے سفّاکانہ رویئے کے سبب کہتا ہوں۔ یہ مریض کی جیب دیکھے بغیر اپنی فیس لیتے ہیں۔ میں حکیموں کی تعریف اس لیے کرتا ہوں کہ یہ لوگ مریض کی مالی حیثیت کے مطابق دوائی کے پیسے لیتے ہیں۔''

بشیر قادری اس وضاحت پر مسکرا کر پوچھتے ''چلو مان لیا کہ آپ ڈاکٹروں پر حکیموں کے علاج کو ترجیح دیتے ہیں لیکن نرسوں اور استانیوں کے کیوں خلاف ہیں؟ یہ بھی تو مقدس پیشوں سے ہیں۔''

''میں مقدس پیشوں کے خلاف نہیں۔'' (اشرف صاحب ہاتھ نچا کر کہتے)

''میں تو ورکنگ لیڈیز سے شادی کے خلاف ہوں۔ یہ خواتین کبھی اچھی بیویاں ثابت نہیں ہوتیں۔''

ہارون قادر آتے ہیں ''ورکنگ لیڈیز اور اچھی بیوی'' کے الفاظ سنتے ہی کہتے:

''دیکھو اشرف صاحب۔ ایہہ کوئی کلیہ نہیں۔ نرس دا تے مینوں پتہ نئیں پر محکمہ تعلیم وچ ملازمت کرن والیاں ذمہ دار جیون ساتھی ہوندیاں نیں۔''

(دیکھو اشرف صاحب یہ کوئی کلیہ نہیں نرس کا مجھے علم نہیں مگر محکمہ تعلیم سے وابستہ خواتین ذمہ دار بیویاں ثابت ہوتی ہیں۔)

اتنے میں صدر شعبہ ڈاکٹر معین الرحمٰن صاحب تشریف لے آتے اور دھیمی سی مسکراہٹ کے ساتھ فرماتے:

''مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ اشرف صاحب اور قادری صاحب کا پیریڈ ختم ہو چکا ہے اور وہ کمرہ نمبر ے میں آ چکے ہیں''

چائے پر، لطیفے، چٹکلے، ادب، ثقافت، سیاست سے لے کر معاشرے کے کئی پہلوؤں پر باتیں ہوا کرتی تھیں۔ ایک روز اشرف منج بڑی سنجیدگی سے بتا رہے تھے کہ ان کے بچے کا بازو گلی میں بندھے کسی گھوڑے نے منہ میں لے کر چبا ڈالا۔ سبھی ہمہ تن گوش تھے کہ اچانک بڑی فکری مندی سے اصغر ندیم سید نے پوچھا:

تے فیر ہُن گھوڑے دا کیہ حال اے؟ (تو پھر اب گھوڑے کا کیا حال ہے؟)

''میرا مطلب اے بچے دا کیا حال ہے''

ان کی جملے کی درستگی سے قبل ہی کمرہ قہقہوں سے گونج اٹھا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ منج صاحب نے اس کے باوجود بچے کی طبیعت کے بارے میں تفصیل سے بیان جاری رکھا۔

اشرف منج کا ذکر ہو رہا تھا مرحوم کمال کے آدمی تھے۔ گورنمنٹ کالج آنے سے قبل شیخوپورہ اور ایم اے او کالج لاہور کے اردو شعبوں سے وابستہ رہے۔ گورنمنٹ کالج شیخوپورہ کے لیے لاہور سے کئی دیگر پروفیسر بھی ''سفر'' کیا کرتے تھے۔ ایک زمانے میں اشرف منج کے ساتھ محمد فاروق، بشیر قادری، شفیق عجمی بھی شیخوپورہ کالج روزانہ لاہور سے جایا کرتے تھے۔ اس دور کا واقعہ ہمیں فاروق نے سنایا تھا۔ ہم نے اشرف منج کی یادوں میں اس کا تفصیل سے ذکر کر رکھا ہے۔ وہ خاکے پڑھنے سے پروفیسر اشرف منج کی شخصیت کی کچھ اور پرتیں بھی سامنے آ سکتی ہیں۔

فاروق بھی چونکہ شیخوپورہ گروپ میں شامل تھا۔ سو اکثر اپنی پرانی یادیں دوستوں کے ساتھ شیئر کرتا۔ محمد فاروق ایک طویل قامت پروفیسر ہے۔ میرے ساتھ قدرے بے تکلفی رہی ہے۔ نہایت شریف النفس اور ''بی با'' دوست ہے۔ سادہ، نرم خو، پیار سے بات کرنے والا، صلح جُو فاروق اپنی ڈیوٹی سے کبھی غافل نہیں رہا۔ کلاس کبھی مِس نہیں کرتا۔ جن دنوں میں شعبہ اردو گورنمنٹ کالج

میں تھا ڈاکٹر خالد آفتاب پرنسپل تھے۔ان کی گردن بغیر ٹائی کے میں نے تو کبھی نہیں دیکھی۔ چلتے ہوئے بھی سیدھا سامنے دیکھتے ہیں اردگرد کی مخلوق سے قدرے بے نیاز رہتے۔اس زمانے میں ان کا بڑا رعب اور دبدبہ تھا۔قدرے سنجیدہ مگر تخلیقی شخصیت کے مالک تھے۔ان کے دور میں باقاعدہ کلاسز چیک ہوتی تھیں۔ ہر بلاک میں ان کا ایک نمائندہ پروفیسر کلاس چیک کرنے پر مامور ہوتا تھا۔اِدھر آپ نے کوئی کلاس چھوڑی حتیٰ کہ آپ کلاس میں لیٹ پہنچے اور کلاس کو پڑھا بھی دیا مگر اگلی صبح آپ کو پروانہ غیر حاضری وصول کرایا جائے گا اور آپ کو اس خط کا فی الفور جواب دینا ہوگا اور معقول جواب ضروری ہے۔بارہا پروفیسرز کالج میں آنے اور پڑھانے کے بعد ''خطِ سرزنش'' وصول ہونے پر اُس روز چھٹی لکھ دیتے تھے کہ تاخیر سے کلاس روم میں جانے کے بارے میں بتانے سے کہیں بہتر ہے کہ اس روز کی چھٹی لکھ دی جائے۔

ٹائم ٹیبل اس دور میں سائنس والے بنایا کرتے تھے۔ہمارے ساتھ ان کی ''خصوصی نوازش'' ہوا کرتی تھی پہلا پیریڈ بھی اردو والوں کا ہوتا اور آخری بھی۔۔۔آخری پیریڈ کی سخت سردیوں کے دنوں میں کالج ہی میں شام ہو جایا کرتی تھی۔

اس وقت پڑھنے والے بھی اکثر غائب رہتے تھے۔عموماً سائنس کے طلباء نے شام کی ٹیوشن اکیڈمیوں میں جانا ہوتا سو دو بجے کے بعد کی کلاسوں کے کمرے خالی ہوا کرتے تھے لیکن اس کے باوجود ہم دو بجے والی کلاسوں کا انتظار کرتے اور وقت پر چار پانچ اردو کے اساتذہ اکٹھے اس وقت کی کلاسوں کو پڑھانے نکل پڑتے۔شعبہ اردو اور مین گیٹ میں خاصا فاصلہ ہے ہم اردو شعبے سے اٹھتے اور اورینٹل کالج روڈ کی ملحقہ عمارات کے کمروں میں پہنچ جایا کرتے تھے۔یہیں اردو کی کلاسیں ہوا کرتی تھیں۔ہم پہنچتے تو سارا بلاک سائیں سائیں کر رہا ہوتا تھا۔میں طارق زیدی، عارف ثاقب، بشیر قادری اور فاروق سبھی اکٹھے اس بلاک کو نکلتے تھے۔کلاس رومز کے دروازے سے جھانک کر آواز لگاتے ہاں بھئی کوئی ہے اردو پڑھنے والا۔۔۔کمرہ خالی ہوتا۔اور ہم ہنستے قہقہے لگاتے پارکنگ کی راہ لیتے۔

ایک روز ہم نے دیکھا کہ فاروق غائب ہے۔خیر ہم نے اپنی کلاسوں میں جھانکنے کے بعد یونہی فاروق کی کلاس میں جھانکا تو آخری ڈیسکوں پر فاروق لیٹا ہوا دکھائی دیا۔آواز لگائی تو وہ اٹھ بیٹھا اور باہر آ گیا۔طارق زیدی نے کہا یار کمرے میں کوئی نہ تھا تو وہاں بیٹھ کر وقت ضائع کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ ہم دو چار منٹ دیکھتے ہیں اور اگر کوئی ایک طالب علم بھی نہیں تو واپس چلے جاتے ہیں مگر کمال جواب دیا فاروق نے۔

''زیدی صاحب! نوکری کرنی ہے۔میں ڈرتا ہوں کہیں صبح جواب طلب والا خط نہ مل جائے۔سو میں بیس منٹ سے زیادہ بھی کلاس میں بیٹھا رہتا ہوں کہ کیا خبر کوئی کلاس چیک کرنے والا آ جائے۔''

فاروق کو اس فرائض منصبی اور سادگی کا صلہ یہ ملا کہ خالد آفتاب نے انہیں پی ایچ ڈی کے لیے سکالرشپ دیا پھر اسی یونیورسٹی کا حصہ بنا دیا۔اب بھی وہ وزیٹنگ کے طور پر وہاں پڑھا رہا ہے اور اب تو وہ ڈاکٹر فاروق ہو گیا ہے۔

ڈاکٹر معین الرحمٰن کو میں لاہور میں اپنے محسنین میں شمار کرتا ہوں۔ ان سے تعارف بس اتنا تھا کہ میں نے انہیں اپنا پہلا مجموعہ کلام ''کسی کی آنکھ ہوتے ہم'' ارسال کیا تھا۔اگلے دو روز میں ہی ان کا ایک خوبصورت خط موصول ہو گیا۔اور کتاب کے حوالے سے شکریے کے علاوہ کتاب کی طباعت، شاعری اور مری تصویر تک کی تعریف تھی۔پھر دوسرا شعری مجموعہ بھی انہیں اردو بازار میں پیش کیا۔اسی دوران میں نے بتایا کہ میں اب دیال سنگھ میں ہوتا ہوں۔انہوں نے کہا آپ کو اگر ہم جی سی میں لے آئیں۔میں نے کہا سر یہ تو آپ نے میرے دل کی بات کہہ دی۔یہ میرے لیے بڑی عزت کی بات ہے۔انہوں نے کہا جلد آپ کو خط بھجواتے ہیں۔کچھ عرصہ بعد میں نے شعبہ اردو جائن کر لیا۔اور پھر الحمد للہ یہیں رہ کر میری پی ایچ ڈی مکمل ہوئی۔معین الرحمٰن ایسے شفیق انسان تھے کہ نوٹیفکیشن کے اگلے روز دو مٹھائی کے ڈبے آفس میں لائے ہوئے تھے جاتے ہی کہا ایک ڈبہ یہاں کھول کر احباب کو مٹھائی کھلائی جائے اور اکٹھے بیٹھ کر بابو خان کے کمرے میں چائے پیتے ہیں۔مٹھائی کا دوسرا ڈبہ آپ کے گھر ساتھ جائے گا۔

میرے پی ایچ ڈی کرنے پر والدین کے بعد سب سے زیادہ خوشی جن تین شخصیات کو ہوئی ان میں ڈاکٹر معین الرحمٰن، ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا اور تخلیق کے مدیر مہربان بزرگ دوست اظہر جاوید۔بلکہ اظہر جاوید نے تو باقاعدہ ایک ہوٹل میں پندرہ بیس دوستوں کی دعوت کی۔اس دعوت کے وقت خواجہ زکریا صاحب اور اظہر جاوید میں بل دینے پر تکرار بھی ہوتی رہی دونوں کہتے یہ دعوت میری طرف سے ہے یہاں اے جی جوش نے کہا: آپ دونوں رہنے دیں بل میں دیتا ہوں لیکن اظہر جاوید نہ مانے۔ بعد میں جوش صاحب نے الگ دعوت کا اہتمام کیا۔یہی نہیں میرے سابقہ کالج دیال سنگھ کے شعبہ اردو کے اساتذہ نے بھی میرے لیے ہائی ٹی کا اہتمام کیا اور اس تقریب کی خبریں مختلف اخبارات میں جاری کیں۔

ڈاکٹر معین الرحمٰن کا ذکر پہلے اس لیے کر رہا ہوں کہ جی سی یونیورسٹی کو یاد کر رہا ہوں۔میرے پی ایچ ڈی مقالے کا سہرا تو ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا کے سر ہے اگر وہ ایک تفصیلی خط لکھ کر نہ دیتے تو مجھے شاید ہی اورینٹل کالج میں رجسٹریشن نصیب ہوتی۔خیر اس کی تفصیل الگ بیان کروں گا۔بات ڈاکٹر معین الرحمٰن کی ہو رہی تھی ۔معین صاحب بہت سنجیدہ محقق نقاد اور استاد اردو ادب تھے۔تحقیق میں اُن کا اسلوب تھا۔بہت آہستہ اور شائستہ گفتگو فرماتے تھے۔ان کی ناگہانی موت سے اردو ادب اور لاہور ایک نفیس و نستعلیق شخصیت سے محروم ہو گیا۔ان کی وفات سے قبل بعض شدّت مزاج ناقدین و محققین نے غالب کے ''نسخۂ خواجہ'' کے حوالے سے انہیں اس قدر دکھی کیا کہ وہ حسّاس انسان چند دنوں ہی بیمار رہ کر چل بسے۔

براہِ راست

سادگی ،سچائی اور انکساری کے امتزاج کو اگر کوئی نام دیا جائے تو فوری طور پر ذہن اور زبان پہ اختر شمار یعنی ہمارے عصر کے مقبول و معروف ادیب، شاعر اور ماہر تعلیم ڈاکٹر اختر شمار کے سوا دوسرا کوئی نام موزوں و مناسب ہو ہی نہیں سکتا۔ ڈاکٹر اختر شمار نے اردو ادب کے مروّج طریقوں اور راستوں سے قطعی طور پر پرہیز کرتے ہوئے جس محنت اور لگن سے اردو ادب اور شاعری میں جس قدر نام اور عزت کمائی ہے وہ قابلِ رشک بھی ہے اور قابلِ داد بھی۔ آج کی نشست میں ہم نے کوشش کی ہے کہ ڈاکٹر صاحب محترم کی تمام فنّی جہات کو اُن کے تازہ رشحاتِ قلم کے ہمراہ مربوط انداز میں پیش کیا جائے۔ ہماری کوشش کس حد تک کامیاب و کامگار ٹھہرتی ہے اس کا فیصلے کا اختیار ہمیشہ کی مانند آپ کے ہی اختیار میں تھا، ہے اور آئندہ بھی رہے گا۔

گلزار جاوید

☆ ڈاکٹر صاحب غزل چھیڑنے یا عمرِ رفتہ کو آواز دینے سے بہتر ہے راولپنڈی شہر بلخصوص چکری گاؤں کے گلیاروں کی سیر کرا دیجئے تا کہ آپ کے بچپن اور لڑکپن سے روبرو ہوا جائے؟

☆☆ جی بسم اللہ میری ولادت راولپنڈی چکری کے قریب ایک گاؤں سہال میں ہوئی۔ بچپن کے پانچ چھ برس وہیں گزرے سکول کا آغاز بھی اُسی گاؤں سے ہوا۔ یہ ایک قدرے پسماندہ علاقہ ہے۔ بارانی زمین ہے، فصلوں کا دارومدار بارش پر ہوتا ہے۔ زیادہ تر کھنڈرات اور بنجر پہاڑ ہیں۔ ٹیلوں کو ہموار کر کے کھیت بھی بنے نظر آتے ہیں۔ کچھ ایسی ہی ہماری زمینیں بھی ہیں۔ اس علاقے کے لوگ کھیتی باڑی کے علاوہ زیادہ تر فوجی ملازمت کو ترجیح اس لیے بھی دیتے ہیں کہ اردگرد تا حال لڑکوں کا کوئی کالج نہیں۔ البتہ ہائی سکول موجود ہے۔ میرے بچپن میں گاؤں کا سکول بھی مڈل تک ہوتا تھا۔ اب اس کا درجہ میٹرک تک ہو گیا ہے۔ البتہ گرلز سکول، کالج بن چکا ہے۔

یہی سبب ہے کہ یہاں تعلیم نہ ہونے کے برابر تھی۔ لڑکے مڈل یا میٹرک کر کے فوج میں بھرتی ہو جاتے۔ زیادہ تر لوگ صوبیدار کے عہدے تک جا کر ریٹائر ہو جاتے۔ اب تو گاؤں میں جنرل، کرنل، بریگیڈئر کے عہدوں پر بھی لوگ فائز ہیں۔ کئی شہدا بھی اس علاقے کا فخر و اعزاز ہیں۔ مجھے اپنا بچپن اور اس دور کی یادیں بہت اچھی لگتی ہیں۔ کنوؤں سے پانی لایا جاتا تھا۔ مل جل کر کام کرنے کے مناظر بھی دیکھے۔ خاص طور پر مکئی کی فصل ہو یا گندم کی کٹائی ہر کام میں گاؤں کے لوگ ایک دوسرے کا ہاتھ بٹاتے تھے۔ رات کو انہیں کھانا کھلایا جاتا تھا۔ کنوؤں پر شہتوت، آڑو، خوبانی، خربوزہ، تربوز کے علاوہ سبزیوں کے کھیت بھی نظر آتے۔ گرمیوں کی دوپہریں، انہی شہتوت اور شیشم کی چھاؤں میں گزرتی تھیں۔ فصلوں کی کٹائی کے بعد میلے ٹھیلوں کا موسم آ جاتا۔ بیلوں کی دوڑیں، کبڈی اور گھڑ سواری اس علاقے کا حسن اور پہچان سمجھی جاتی۔ بچپن میں پرائمری تک گاؤں کے سکول میں رہا۔ والد صاحب آرمی سے صوبیدار میجر ریٹائر ہوئے تو انہیں ملتان میں ملازمت مل گئی اور ہم بھی ملتان آ گئے۔ لیکن اکثر گاؤں کا چکر لگتا رہتا تھا۔ آج بھی گاؤں جانا ہوتا ہے لیکن اب تو یہاں بھی شہروں جیسی سہولیات میسر ہیں۔ بجلی آنے سے زندگی کافی تبدیل ہو گئی ہے۔ ٹیلی ویژن، کیبل اور موبائل نے سب کچھ بدل کر رکھ دیا ہے۔

☆ تعلیمی ایام کی کچھ یادیں کچھ باتیں یقیناً آپ کے حافظے میں ہوں گی؟

☆☆ جیسا کہ میں نے کہا پرائمری تک گاؤں میں رہا۔ پھر ملتان سے سلسلہ تعلیم آگے بڑھا۔ میٹرک پاک عرب کھاد فیکٹری ملتان کے سکول سے پاس کر کے میں نے تین سالہ الیکٹریکل ڈپلومہ کیا۔ اس دوران ایف اے اور بی اے بھی کر لیا۔ ملتان ہی میں میری شاعری کا آغاز ہوا۔ جب بی اے کا امتحان دے رہا تھا تو بہت سے شعراء کو پڑھ چکا تھا۔ ڈپلومہ کے دوران کچھ ایسے احباب سے تعلق استوار ہوا جو سٹڈی سرکل چلاتے تھے۔ جس سے مطالعے کا ذوق مزید پروان چڑھا۔ انہی دنوں میں، روسی لٹریچر کی بعض کتابیں بھی پڑھیں۔ کچھ کتابیں تو اب تک حافظے میں ہیں۔ جن میں گورکی کی ماں، رسول حمزہ کی، میرا داغستان کے علاوہ سبط حسن کی ''ماضی کے مزار'' شامل ہیں۔ انقلاب ایران، پنجاب کا مقدمہ، اور کئی سیاسی ایشوز پر مبنی کتب بھی زیر مطالعہ رہیں۔ اسی دور میں کلاسیکی شعراء بھی زیر مطالعہ رہے۔ اقبال، غالب، میر، ساغر، عدم، فیض، فراز، اور ساحر بھی بہت پسند رہے۔

☆ چلتے چلتے ملتان اور بہاول پور کو بھی شریکِ گفتگو کر لیجیے۔ تعلیم میں تعطل اور آغاز کا جاننا بھی ضروری ہے؟

☆☆ ملتان میں الیکٹریکل ڈپلومہ کے بعد ایک دو ملازمتیں بھی کیں۔ ایک برس سکول میں پڑھایا۔ اسی دوران اپنے پہلے شاعر دوست اطہر ناسک سے ملاقات ہوئی جو مجھے اپنے استاد شاعر بیدل حیدری کے پاس کبیر والا لے گیا۔ جو ملتان سے چالیس منٹ کی مسافت پر واقع ہے۔ یوں شاعری کا باقاعدہ آغاز ہوا۔ ۱۹۸۰ء میں بیدل صاحب کے ساتھ ہی میں نے بہاولپور آرٹس کونسل کا پہلا مشاعرہ پڑھا جس میں پنجاب کے ممتاز شعراء نے حصہ لیا۔ صدارت روزنامہ امروز کے ایڈیٹر اقبال

ساغر صدیقی نے کی جو انشائیہ نگار تھے۔مہمان خصوصی جھنگ کے شاعر رفعت سلطان تھے۔ملتان کے سبھی اہم شعراء موجود تھے۔ظہور نظر بوجہ علالت شریک نہ ہو سکے۔اسی طرح ملتان کے ادبی حلقوں سے بھی تعارف ہو گیا۔کچھ عرصہ بعد نوائے وقت ملتان سے ادبی کالم نگاری کا آغاز کیا،سرِ محفل کے نام سے ادبی محافل کی روداد لکھنا شروع کی۔اس طرح اردو اکیڈمی کی ہفتہ وار تنقیدی محافل، بابا ہوٹل کی ادبی نشستیں اور شہر کی ادبی تقریبات میں بھرپور شرکت جاری رہی۔

☆ پی ایچ ڈی کے مقالے کی شخصیت سید جلال الدین حیدر دہلوی کے انتخاب کی بنیاد کیا تھی؟

☆☆ پی ایچ ڈی تو ظاہر ہے ایم اے کے بعد کی۔ایم اے سے قبل ہی میں لاہور آ گیا تھا۔مجھے زکریا یونیورسٹی ملتان میں داخلہ نہ مل سکا۔ایک طرح سے اچھا ہوا، میں نے لاہور آ کر فلمی گیت لکھنا شروع کیے، ساتھ ساتھ صحافت بھی جاری رہی۔اسی دوران ایم اے کا امتحان اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور سے دیا۔ایم اے کے بعد، ۷فروری ۱۹۸۹ء کو میں نے محکمہ تعلیم پنجاب میں بطور لیکچرار جائن کیا۔

پہلی پوسٹنگ گورنمنٹ اسلامیہ ڈگری کالج قصور میں ہوئی۔انہی ایام میں پی ایچ ڈی کے لیے سوچنا شروع کیا۔

ملتان میں رہتے ہوئے بیدل حیدری سے شعری اصلاح کا سلسلہ شروع ہوا۔چند ہی برس میں تین تلامذہ کو فارغ التحصیل کر دیا گیا۔اطہر ناسک، شوکت مہدی اور مجھے باقاعدہ سند دے کر فارغ التحصیل کیا گیا تھا اور اس کا باقاعدہ ایک مشاعرے میں اعلان کیا گیا۔بیدل حیدری اس علاقے میں نئی نسل کی شعری تربیت کے حوالے سے ایک ادارے کی حیثیت رکھتے تھے۔اس دور میں کئی نوجوان شعراء نے ان کی طرف رجوع کیا۔جو باقاعدہ ان سے اصلاح لیا کرتے۔ان میں سے بعض اصلاح تو لیتے تھے مگر انہوں نے بیدل حیدری کو کبھی استاد نہ مانا۔کبیر والہ، خانیوال، بورے والا، وہاڑی، میلسی، چیچہ وطنی، کسووال، شجاع آباد، بہاولپور اور بھکر رحیم یار خان تک بیدل حیدری کے شاگرد پائے جاتے۔لیکن ان میں بہت کم جینوئن شعراء میں شمار ہوتے ہیں۔زیادہ تر غزلیں خریدنے والے ہوتے۔ہم نے تو بیدل صاحب کو استاد تسلیم کیا اور ان کے مرنے کے بعد بھی ان کی حمایت جاری رکھی ہوئی ہے۔جہاں تک پی ایچ ڈی کے مقالے کا تعلق ہے، حیدر دہلوی استاد بیدل حیدری کے استاد تھے۔انہوں نے خواہش کا اظہار کیا تھا کہ ان کے استاد پر پی ایچ ڈی ہونی چاہیے۔حالانکہ حیدر دہلوی کے بارے میں معلومات بہت کم میسر تھیں۔پھر بھی میں نے یہ بیڑا اٹھایا جس پر بیدل حیدری نے ڈاکٹریٹ کرنے پر کبیر والہ میں میرے لئے ایک یادگار تقریب منعقد کی جس کی روداد مقامی اخبارارت نے تفصیل سے شائع کی تھی۔

☆ کیا ہی اچھا ہو کہ گیتوں کے بول اور فلموں کی نشاندہی بھی ہو جائے؟

☆☆ فلم لکھنے کی کوشش کی مگر مکمل نہ ہو سکی۔اُن دنوں کے فلمی گیت بھی آدھے ادھورے ہی رہے البتہ ریڈیو، ٹی وی کے لیے کچھ گیت ریکارڈ ہوئے اور آج کل ایک مشہور ڈرامہ سیریل کا ٹائٹل سانگ میرا لکھا ہوا ہے۔

☆ صحافت اور کالم نگاری ایک طرح کا منافع بخش کاروبار بن چکا ہے، آپ جیسے شخص کے لئے یہ سفر کٹھن بھی ہونا چاہئے اور دشوار بھی؟

☆☆ آپ نے درست فرمایا، صحافت اب مشن نہیں کاروبار بن چکا ہے۔بڑے بڑے تاجر حضرات نے صحافت کی آڑ لینے کے لیے اپنے اخبارات اور ٹی وی چینلز بنا لیے ہیں۔وہ صحافت کی الف بے سے بھی آشنا نہیں مگر مدیر اعلیٰ بنے ہوئے ہیں۔ان کے کالم لکھنے والے بھی مشقتی لکھاری ہیں۔اسی طرح کالم نگاری بھی پی آر کے لیے کی جاتی ہے۔میں نیم سیاسی کالم لکھتا ہوں۔زیادہ ادبی، سماجی، روحانی موضوعات پر لکھتا ہوں اور آپ نے درست فرمایا میرے لیے یہ سفر کٹھن ہے، بس لکھنے کا ایک چسکا ہے سو اپنے اطمینان کے لیے لکھتا ہوں۔

☆ بیدل حیدری صاحب سے ملاقات اور ان سے مستعار خزینے کی بابت دریافت کیا جائے تو کیا کیا ہاتھ لگتا ہے؟

☆☆ بیدل حیدری کا ذکر پہلے بھی کر چکا ہوں۔ہم نے ان سے لفظ کی پہچان حاصل کی۔تھوڑی بہت سوجھ بوجھ بھی میسر آئی۔شعر کہنے کا ڈھنگ سیکھا اور جس سے ایک لفظ بھی سیکھا جائے وہ واجب الاحترام ہے۔اب تک تہہ دل سے شاعری میں انہی کو استاد تسلیم کرتا ہوں۔ان کے بارے میں بعض حاسدین لکھتے بھی رہتے ہیں۔جن کا جواب دینا اب صرف میرے ذمے رہ گیا ہے۔ان کی حمایت میں کئی کالم نگاروں کو ٹھنڈا کر چکا ہوں۔

☆ صحافت میں شاعری کی آمیزش کب اور کس طور ہوئی اور شاعر نے صحافی کو کس بنا پر پیچھے دھکیل دیا؟

☆☆ یہ بات بھی کہی جاتی ہے کہ بعض شعراء کو صحافت کھا گئی ہے مگر وہ کل وقتی صحافی تھے یا نیوز کے لوگ تھے۔باقی صحافت میں اردو کے کئی اساتذہ مدیر بھی رہے ہیں۔کالم نگاری سے شاعر کو زیادہ نقصان نہیں ہوتا اکثر کہتا ہوں کہ جیسے چور چوری سے نہیں جاتا۔حقیقی اور جینوئن شاعر شعر کہنے سے باز نہیں رہ سکتا سو شاعری کا سفر جاری ہے۔اور شاعری کو اپنی پہلی محبت قرار دیتا ہوں۔

☆ آج کل موضوع کوئی بھی ہو تان میر، غالب پر ٹوٹتی ہے، جناب عزیز قریشی آپ کے تخلص کی سراہنا کرتے ہوئے اسی عمل سے دوچار ہیں، پتہ تو چلے تخلص شمار کے پیچھے اسرار کیا ہے؟

☆☆ ہر شاعر اپنے مزاج، فکر اور زمانے کا شاعر ہوتا ہے۔غالب و میر بڑے تخلیق کار تھے۔ان کا ہم پلہ کسی کو بھی قرار نہیں دیا جا سکتا۔مجھے تو ویسے بھی شاعر ہونے کا دعویٰ نہیں ہے۔میں تو اسے کارِ درویشی سمجھتا ہوں۔یہ ایک درویشی عمل ہے کیونکہ خیال ربِ کائنات کی عطا ہے وہ جسے چاہے ارفع و اعلیٰ خیال عنایت فرمائے، یہ سب اسی کی دین ہے۔۔شمار کے پیچھے کوئی بھید نہیں ہے۔''اختر شماری'' اور بے قراری شاید نصیبوں میں ہوتی ہے۔ایک بار ممتاز نقاد مظفر علی سید نے مجھے پاک ٹی ہاؤس میں کہا تھا بھئی یہ کیا نام ہوا؟ اسے تبدیل کر لو مگر اس وقت میری دو

کتب شائع ہو چکی تھیں۔اور ویسے بھی مجھے ان کی بات نے اپیل نہیں کیا۔

☆ برادرم جمیل عدیل کا سوال سیدھا بھی ہے اور سچا بھی، زندگی میں آخر کس چیز کی کمی تھی جو آپ شاعر بن گئے؟

☆☆ جمیل احمد عدیل دیرینہ دوست ہیں، انہوں نے ہلکے پھلکے انداز میں لکھا ہے کہ مجھے فلم میں طبع آزمائی کرنی چاہیے تھی، ویسے فلمی دنیا میں ابتدائی ایام میں خاک چھانتے ہوئے، مشہور نغمہ نگار وارث لدھیانوی نے مجھے گیت نگاری کی بجائے فلمی ہیرو بننے کا مشورہ دیا تھا مگر اداکاری کی صلاحیت سے زیادہ بہتر صلاحیت لکھنے میں محسوس کی سو اِدھر ہی توجہ زیادہ رہی۔اور شاعری تو ودیعت ہوتی ہے۔یہ درست ہے کہ بعض کمپلکسز بھی اس طرف لے جاتے ہیں مگر یہ حرفِ آخر نہیں۔احمد فراز کی مثال بھی سامنے ہے۔

☆ کہا جاتا ہے کہ شاعر کے خواب حقیقت مفروضے Hypothesis ہوتے ہیں اگر ہم آپ کے خوابوں کی بابت دریافت کرنا چاہیں تو ہمارے ہاتھ کیا کچھ لگنے کے امکانات ہیں؟

☆☆ خواب تو ہر کوئی دیکھتا ہے، خوابوں میں ہماری روح کی، خواہشات، خوف اور ڈر بھی چھپے ہوتے ہیں۔انسانی فطرت ہے کہ وہ خود کو مطمئن، پرسکون، خوشحال دیکھنے کے ساتھ ساتھ چاہے جانے کی آرزو بھی رکھتا ہے۔کچھ خواب پورے ہو جاتے ہیں۔شاعر تو اپنے اردگرد پرامن خوبصورت، باوقار، خوشحال سماج دیکھنے کا تمنائی ہوتا ہے۔جب سب سکھی اور مطمئن ہوں۔آپ اسے جو بھی نام دے لیں۔ایک مثبت سوچ رکھنے والے کے یہی خواب ہوتے ہیں۔

☆ اور جو خواب آپ اپنے قاری کے دل و دماغ میں جگا رہے ہیں، وہ ان کی تعبیر کہاں تلاش کرے؟

☆☆ اصل میں روح کا مسکن ''امن وسکون'' ہے مگر دنیا میں 'مثالی سماج' کی تکمیل آسان نہیں۔کچھ نہ کچھ کمی اور خلا باقی رہ جاتا ہے۔قاری ہی نہیں جینوئن لکھنے والا بھی اپنی خوابوں کے تعاقب میں رہتا ہے۔اس کے لیے فطری، اخلاقی اور روحانی تعلیم بھی درکار ہے۔اب تو تعلیم ڈگری کا نام ہے ہر کوئی ایسی ڈگری کا خواہاں ہے جس سے اسکی انکم سب سے زیادہ ہو۔گویا اچھی ملازمت اور اچھی تنخواہ ہی مطمع نظر ہے۔ہمیں اس سوچ کو تبدیل کرنے کی ضرورت ہے، اس کے لیے مل جُل کر ایک ایسی جدوجہد کی ضرورت ہے جس سے ہم ایک پرامن اور خوشحال معاشرے کے قیام کی طرف بڑھ سکیں گے۔

☆ اردو افسانے کے چار ستون کے وزن پر اردو شاعری کے چار ستون عشق، فلسفہ، انقلاب اور تصوف Maximum کی دوڑ کے مقابل کھڑے ہونے کی سکت رکھتے ہیں؟

☆☆ میرا جواب ہاں میں ہے۔بات تو موضوعات کی ہے۔

☆ حقیقت سے فرار کا شاعر بتلانے والے آپ سے کس چیز کا انتقام لے رہے ہیں؟

☆☆ اس بارے میں کیا کہہ سکتا ہوں۔دراصل اِن دنوں بیشتر ناقدین خود بھی شعر کا ''لپکا'' رکھتے ہیں۔بعض تدریسی نقاد شاعری پر لکھتے تو ہیں مگر کوئی فنکار دوسرے فنکار کو خود سے بہتر کیسے کہہ سکتا ہے؟ لہٰذا ہم دیانتداری سے کسی شعر کی داد بھی نہیں دیتے۔لکھ کر اعتراف کرنا تو اس سے بھی مشکل کام ہے۔سو شاعری کو آنے والے دنوں کے لیے چھوڑ دینا چاہیے یعنی آنے والے ناقدین کے لیے۔

☆ ظفر اقبال صاحب نے آپ کو انتظار کا استعارہ بتا کر ہمارے دل میں کرید پیدا کر دی ہے؟

☆☆ اختر شماری'' بھی انتظار کی ایک صورت ہے۔مرے خیال میں بے چینی، بے تابی یا بے قراری تو انتظار کی ''روح'' ہے۔پھر میری شاعری میں آنکھوں کا ذکر بھی تواتر سے ملنے پر ظفر صاحب نے شاید ایسا کہا ہو۔

☆ ڈاکٹر اجمل نیازی نے منیر نیازی کی پیروی میں رومانیت و روحانیت کی یکجائی کا جو ذکر کر کے بحث کا ایک اور در وا کر دیا ہے؟

☆☆ اس کا صحیح جواب تو ڈاکٹر اجمل نیازی صاحب دے سکتے ہیں کہ ان کی تحریروں میں قافیہ پیمائی کی چاشنی بھی نمایاں ہوتی ہے۔لیکن میں بھی یہ ضرور سمجھتا ہوں کہ روحانیت کی چوٹی، رومانیت کے بغیر سر نہیں ہو سکتی۔روح کی غذا سکون اور محبت بھی ہے۔محبت کی سیڑھیاں چڑھ کر ہم روح تک رسائی حاصل کرتے ہیں۔(یہ دل کے معاملات ہیں) رومانیت کی آخری حدوں میں ''آگہی'' سے واسطہ پڑتا ہے۔بندہ جب روح سے آگاہ ہو جائے تو رومان کا پیکر بن کر رحمت کے درجے پر فائز ہو جاتا ہے۔یعنی ہر کسی کے لیے رحمت۔

☆ محبت کرنا، نبھانا، محبت کو پروان چڑھانا سمجھ میں آتا ہے مگر ''گرہ کشائی'' وہ بھی محبت کی نفسیات کے حوالے سے دشوار امر ہے؟

☆☆ آپ کی بات کسی حد تک درست ہے لیکن محبت کی نفسیات کے حوالے سے گرہ کشائی مشکل ہو سکتی ہے، ناممکن نہیں۔

☆ مرکز انا میں بند ہو کر صیغے میں بات کرنے والا نکتہ تھوڑا وضاحت طلب ہے؟

☆☆ یہ بھی غالباً مجھ پر لکھے گئے کسی تنقیدی مضمون میں نقاد نے کہا ہو گا۔سیاق وسباق سے ہٹ کر کسی جملے کی یوں سردست وضاحت مشکل ہے۔تاہم عشق کی ایک منزل میں یہ کیفیت محسوس ہوتی ہے جو آپے رانجھا ہوئی کی صورت سامنے آتی ہے۔آگہی میں ایک ایسا مقام راہ پڑتا ہے، یہ بھی اظہار کی ایک صورت ہے۔یہ بھی خودی کا عرفان ہے۔

☆ تصوف کے دائرے میں آ کر استقامت حاصل کرنا سراسر مبہم بات ہے، کچھ رہنمائی فرمایئے؟ جس سے یہ عقدہ حل ہونے کے ساتھ آپ کے تصورِ تصوف سے آگاہی مل سکے۔

☆☆ یہ جملہ بھی کسی تنقیدی مضمون سے سوال میں ڈھلا ہے ویسے تصوف کے دائرے میں استقامت مبہم کیسے ہو سکتی ہے؟ تصوف کی مختلف تعریفات و

تشریحات ہیں۔اپنے حواس کی نگہداشت کا نام بھی تصوف ہے۔باطنی طور پر خود کو شفاف کرنے اور اپنے آپ کو پہچان کر ہی تسلیم ورضا کی حقیقت اور یقین کا سرا ہاتھ آتا ہے اور اس میں استقامت کے لیے بھی ہمہ وقت اپنی نفی پر کا بند رہنا پڑتا ہے۔

☆ اشفاق ورک صاحب نے معقول شاعری اور مقبول شاعری کا اختصاص قائم کر کے ہمیں آپ سے رہنمائی پر مجبور کر دیا ہے؟

☆☆ یہ سراسر اشفاق ورک صاحب کا اپنا نقطہ نظر ہے۔انہوں نے میرے ایک شعری مجموعے پر اظہار خیال کرتے ہوئے اپنا ایک تھیسس بنایا۔معقول اور مقبول کے قافیے سے بھی مضمون میں شگفتگی پیدا کرنے کی کوشش کی۔ان کا مقصد یہ تھا کہ یہ شاعری مناسب اور عام اور خواص دونوں کے لیے پسندیدہ ہے(ان کا شکریہ)

☆ جناب سجاد بخاری نے آپ کے ہاں بحور کی تعداد اور اُن کے استعمال کی بابت توجہ دلا کر اشتیاق سوا کر دیا ہے؟

☆☆ بخاری صاحب کی محبت ہے جو انہوں نے اس اہم نکتہ کی نشاندہی کی۔میرے خیال میں بحور شاعر کے مزاج کا حصّہ ہوتی ہیں۔بعض بحریں شاعر کے مزاج کا حصہ ہوتی ہیں یا شاید کچھ بحریں آسان اور رواں ہوتی ہیں جن کا استعمال شاعر کے ہاں دانستہ یا غیر دانستہ طور پر کم یا زیادہ ہو جاسکتا ہے۔اس کے علاوہ میرے خیال میں کوئی خاص وجہ نہیں۔

☆ مشاعروں سے عدم دلچسپی آپ کی مصروفیات کے باعث ہے یا مسئلہ اندھے کی ریوڑیاں بانٹنے والا ہے؟

☆☆ آپ کی دونوں باتوں سے اتفاق ہے۔اپنی مصروفیات بھی اچھی خاصی ہیں۔دوسرا مشاعرے بھی اب ''پی آر'' قائم دائم رکھنے سے ملتے ہیں۔صرف شاعری کے لیے یہ محفلیں منعقد نہیں ہوتیں۔مشاعروں کی محفلوں سے لفافہ ختم کر کے دیکھیں شعراء کی دھڑے بندیاں اور مخاصمتیں ختم ہو جائیں گی۔ایسا بھی نہیں کہ میں نے مشاعرے نہیں پڑھے الحمدللہ پاکستان کے عالمی مشاعروں کے علاوہ دو بار امریکہ، یورپ اور انڈیا کے عالمی مشاعروں میں بھی شرکت کر چکا ہوں۔اب بھی کوئی دوست محبت سے مدعو کرے تو چلا جاتا ہوں۔مگر بعض اوقات مصروفیات اور سفر سے بیزاری کے باعث بھی انکاری ہوتا ہوں۔کچھ حاسدین ہماری کامیابی سے خائف بھی ہیں اور نام بھی کٹواتے ہیں۔حالانکہ اس سے فرق تو پڑتا نہیں کوئی۔

☆ اختر شماری کو آپ کا محبوب مشغلہ بتلانے والے کس امر کی جانب اشارہ کر رہے ہیں؟

☆☆ اس کا جواب پہلے بھی آ چکا ہے، میرے خیال میں ''اختر شماری'' مشغلہ نہیں، نصیب کی بات ہے۔رات کو جاگنے کا عمل، بیقراری و بے تابی کے علاوہ غور وفکر کی راہ بھی دکھاتا ہے۔

☆ میر و غالب سے لے کر فیض و فراز تک تجربات کے دفتر بھرے پڑے ہیں۔آپ مشاہدات پر قناعت کیے ہوئے ہیں؟

☆☆ شاعری میں تجربہ بس تجربہ ہی رہ جاتا ہے۔مجھے معلوم نہیں آپ کن تجربات کی بات کر رہے ہیں۔مشاہدے اور تجربے کے بغیر شاعری'' لفظی گورکھ دھندہ تو ہو سکتی ہے، شاعری نہیں۔

☆ بنیادی طور پر آپ غزل کے شاعر مانے جاتے ہیں۔ہائیکو کی جانب آپ کا رجحان کب اور کیونکر ہوا؟

☆☆ جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ ہائیکو میں ڈاکٹر محمد امین کا نام طبع زاد ہائیکو تخلیق کرنے والوں میں سرفہرست ہے۔انہیں اردو ہائیکو کا بانی بھی قرار دیا جاتا ہے۔ہائیکو کی پہلی کتاب بھی ڈاکٹر محمد امین صاحب کی ہے جو ملتان سے شائع ہوئی۔پھر دوسرا ہائیکو مجموعہ بھی ملتان ہی سے بزرگ شاعر حیدر گردیزی کا ''چاندنی کے ورق'' کے نام سے شائع ہوا۔انہی بزرگوں کی صحبت میں ہم کئی نوجوان، ہائیکو کی جانب مائل ہوئے۔گویا ملتان ہی سے ہائیکو کی تحریک شروع ہوئی۔بعد ازاں کراچی میں بھی ہائیکو مشاعروں نے رواج پایا۔لیکن ملتان ہی سے تیسرا ہائیکو مجموعہ ''روشنی کے پھول'' شائع ہوا۔یہ میرا پہلا شعری مجموعہ بھی تھا۔ڈاکٹر بشیر سیفی نے اردو ادب کا ہائیکو نمبر بھی شائع کیا تھا۔ایک دور میں ہائیکو لکھنا فیشن تھا۔

☆ ہائیکو کا تیسرا اہم شاعر آپ کو کس وصف کی بنا پر گردانا جاتا ہے؟

☆☆ اوپر بیان کر چکا ہوں کہ ملتان میں ڈاکٹر محمد امین حیدر گردیزی، اقبال ارشد حسین سحر، ارشد ملتانی کے علاوہ نوجوانوں میں ممتاز اطہر، فہیم اصغر، سید اطہر ناسک، رضی الدین رضی، ڈاکٹر نوید اسلم، طارق اسد، ناصر بشیر، شفیق آصف اور کئی دیگر شعراء نے ہائیکو لکھے۔ان دنوں ہائیکو مشاعرے بھی ہوا کرتے تھے۔ہم نے غزل کے لہجے میں ہائیکو کہنے کی کوشش کی۔اور نوجوانوں میں اُن دنوں صرف میرا ہائیکو مجموعہ چھپا تھا۔اور یوں اسے تیسرے ہائیکو مجموعے کا درجہ ملا۔البتہ اپنے منفرد فکر واسلوب کی بنا پر اسے اہمیت دی گئی جو میرے لیے اعزاز ہے۔

☆ آپ کا افسانوی سفر مادری زبان تک محدود ہونے کی وجوہات کیا ہیں؟

☆☆ بنیادی طور پر خود کو شاعر سمجھتا ہوں۔یہ تو پنجابی اخبار ''خبراں'' کا لاہور سے اجرا ہوا تو مجھے پنجابی کالم لکھنے کی ترغیب ملی کہ کئی دوست پنجابی میں لکھنا شروع ہو گئے تھے۔پنجابی اخبار کا پہلے حسین شاد اور پھر جمیل پال کو مدیر مقرر کیا گیا۔انہی دوستوں نے پنجابی کی طرف مائل کیا۔پہلا کالم بھیجا تو جمیل پال نے کہا یہ پنجابی کہانی ہے۔اور اس طرح انہوں نے اسے اپنے پنجابی ادبی جریدے ''سویر انٹرنیشنل'' میں شائع کر دیا۔اس پر اس قدر داد ملی کہ ہر ماہ جمیل پال مجھ سے کہانی کا تقاضا کرنے لگے۔بس یوں میں پنجابی کہانی کی طرف آ گیا۔اصل میں میرے کالموں میں ایک کہانی کا سا انداز ہوتا ہے۔مصر میں یہ کہانیاں میں نے اپنے مصری طالب علموں کے لیے اردو میں ترجمہ کیں مگر یقین کریں کہانی لکھنے کا جو مزہ مادری زبان میں ہے وہ اردو میں نہیں آتا۔میں نے خود اپنی کہانیوں کو اردو میں ڈھالا مگر

پنجابی کی سی بات پیدا نہیں کر سکا۔اب تو ان کہانیوں کا انگریزی اور عربی میں بھی ترجمہ ہو چکا ہے۔اس حوالے سے مصر میں ایک تھیسس بھی لکھا جا چکا ہے۔

☆ آپ کی کہانیوں کو ادب کی نئی صنف کس خوبی کی بنا پر گردانا جاتا ہے؟

☆☆ شاید کسی دوست نے محبت میں کہہ دیا ہو۔مجھے یاد نہیں۔خوبی تو قارئین ہی بتا سکتے ہیں۔اتنا ضرور ہے کہ مجھے مادری زبان میں لکھتے ہوئے لطف آتا ہے حالانکہ میں نے مجموعے کے بعد زیادہ نہیں لکھا۔وجہ صرف یہ تھی کہ کہانی لکھ کر اگر پھر مجھے ہی اردو ترجمہ کر کے لوگوں تک پہنچانی ہے تو اردو میں لکھنا بہتر ہے۔تاہم مصروفیات کے سبب کہانی نہیں لکھ سکا۔مادری زبان میں لکھنے کا مزہ آتا ہے کاش اس کے قارئین کی تعداد بھی اردو جتنی ہو۔

☆ ابتدائی تعلیم مادری زبان میں ہونا مسلم امر مانا گیا ہے۔تخلیق کے باب میں اس طرح کا کوئی کلیہ رائج ہونے کے بارے میں کیا خیال ہے؟

☆☆ اگر مادری زبانوں میں ابتدائی تعلیم دی جانے لگے تو اس کے قارئین میں بھی اضافہ ہوگا اور ہر شخص اپنی مادری زبان میں کھل کر لکھ سکے گا۔اس سے تخلیقی ذائقہ بھی دونا ہو سکتا ہے۔اس کلیے کو رائج ہونا چاہیے۔

☆ ڈاکٹر نجیب جمال نے مابعد جدید کے دور میں متن کے ساتھ متون جوڑنے کی جو بات کی ہے آج کے شاعر اور ادیب اس پر کس حد تک عمل کرتے نظر آتے ہیں۔کم از کم اپنے حوالے سے صورتحال کی وضاحت فرما دیجیے؟

☆☆ ڈاکٹر نجیب جمال کی بات سے مکمل اتفاق ہے۔متن ہی سے مختلف معنی منکشف ہوتے ہیں۔قاری پر مصنف کا نقطہ نظر ٹھونسنے کی بجائے اسے خود تفکر کی سیڑھیاں چڑھنے دیا جائے تو وہ معانی کی کئی تہوں سے حظ اٹھا سکتا ہے۔شاعر تو شعر کہہ کر اس سے لطف اندوز ہوتا ہے۔اب آگے قاری یا نقاد اپنی توفیق کے مطابق فن پارے کے مختلف معانی تک رسائی حاصل کر سکتے ہیں۔اپنی بات کروں تو عرض یہ ہے کہ میں نقاد نہیں۔شاعر شعر کہہ سکتا ہے۔میں بھی شاید اپنے شعروں پر زیادہ کچھ نہیں کہہ سکوں گا۔۔

☆ گوئٹے حیرت کو فن کی انتہا مانتا ہے جبکہ اردو والے لفظ حیرت سے خاصے بدکتے ہیں آپ کے ہاں کس عمل کو اہمیت دی گئی ہے؟

☆☆ میرے خیال میں حیرت اور فن لازم و ملزوم ہیں۔حیرت سے امکانات کا سفر شروع ہوتا ہے۔حیران ہوئے بغیر سوالات کیسے جنم لے سکتے ہیں۔اردو شاعری میں تو آئینہ خانہ میں حیرت کے احساسات بھی ملتے ہیں۔ہمارے خالد احمد نے تو یہ بھی کہہ رکھا ہے کہ

کھلا مجھ پر درِ امکان رکھنا
مرے مولا مجھے حیران رکھنا

سو اردو شعرا تو لفظ حیرت سے نہیں بدکتے اور حیرت کو تخلیق کا منبع قرار دیتے ہیں۔

☆ کانٹ نے انسانی ادراک کے جن تین پہلوؤں حسیت، تخیل اور فہم کو تخلیق کی بنیاد بتا کر زمان و مکان کی دستیابی کی نوید سنائی ہے آپ کے تخلیقی رویوں کو اس پیمانے پر جانچنا مناسب ہوگا؟

☆☆ اس بارے میں شاعر کیا کہہ سکتا ہے۔یہ سوال تو نقاد سے ہونا چاہیے۔ہر شاعر کی شاعری کا تجزیہ اور دوسروں سے موازنہ کرنے کے لیے مختلف پیمانے ہیں۔تاہم انسانی ادراک اور خاص طور پر حسیت اور تفکر کے بغیر کائنات ہم پر منکشف نہیں ہو سکتی۔محسوسات کی اپنی دنیا ہے۔حواس کے کئی درجے ہیں۔انسانی تخیل اور احساس بھی ایک نعمت ہے۔جس کے پاس یہ دولت جس قدر وافر ہوگی وہ اتنا بڑا فنکار ہوتا ہے۔یہ میری رائے ہے،اختلاف کیا جا سکتا ہے۔

☆ بات جب مسلم تہذیب کی ہوتی ہے تو ایک سے زیادہ سوالات سر ابھارتے ہیں اپنی جستجو کے حوالے سے کاوشوں پر کچھ آگاہی دیجیے؟

☆☆ ایم اے اردو پنجاب یونیورسٹی کے نصاب میں ایک پرچہ مسلم تہذیب و فکر کے حوالے سے بھی ہوتا تھا۔اب معلوم نہیں کہ شامل نصاب ہے یا نہیں۔اس حوالے سے ایک کتاب مرتب کی تھی۔یہ میرا تھیسس یا مقالہ نہیں تھا۔یہ نصابی کام تھا۔جس میں برصغیر پاک و ہند میں صوفیائے کرام اور مسلم تہذیب و فکر کے حوالے سے مواد شامل تھا۔

☆ ہر پھر کے بات فرسودہ خیالات کی جانب آ رہی ہے کہ آپ انقلاب کے داعی ہیں۔جہاں بڑے بڑے ملک اور اقوام کو سلامتی کی فکر ستا رہی ہو وہاں انقلاب کی بات حلق سے اتارنا کس طرح ممکن ہے؟

☆☆ انقلاب وسیع تر معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔سب سے پہلے انسان کو اپنے اندر انقلاب برپا کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔انسان نے مختلف شعبوں میں ترقی ضرور کی ہے۔مگر یہ ترقی خود اس کے لیے ''سوہانِ روح'' بنتی دکھائی دیتی ہے۔اگر حقیقی معنوں میں فطری طور پر انسانی تہذیب و پرداخت کی جائے اور اسے علم و آگہی کا شعور مل جائے تو یہ ایک بڑا انقلاب ہو گا۔مگر یہاں طاقت ،اختیار،تعیش،سماج کا حلیہ بگاڑ رہا ہے۔حرص و ہوس سے،حسد،کینہ بغض اور غصہ جنم لیتا ہے۔انسان اجتماعی سوچ کی بجائے ذاتی یا انفرادی ترقی کی بھاگ دوڑ میں ہانپنے لگتا ہے جس سے محبت و ایثار اور رحم کے جذبے ماند پڑ جاتے ہیں اور انسان درندگی کی راہ اپنا لیتا ہے۔اگر معاشرے میں علم و آگاہی عام ہو جائے ہمارا اخلاقی نظام عملی شکل میں لاگو ہو جائے تو ایک مثالی سماج کی تشکیل ممکن ہو جاتی ہے۔یہ جو اقوام کو سلامتی کی فکر ستا رہی ہے یہ بھی تو توازن کا بگاڑ ہے۔دولت طاقت کی علامت سمجھی جانے لگی ہے۔اس کے لیے ہر جائز ناجائز اور غیر اخلاقی راستہ اپنایا جاتا ہے۔

☆ آج کی نشست میں ان لوگوں کی نشاندہی فرما دیجیے جنھوں نے زندگی کی دوڑ میں آپ کا راستہ روکنے اور آپ کو پچھاڑنے کی کوشش کی؟

☆☆ ہر آدمی بیک وقت سب کے لیے بہت اچھا نہیں ہو سکتا۔بعض بلاوجہ بھی آپ کو ناپسند کرنے لگتے ہیں۔بعض آپ سے خائف ہوتے ہیں۔بعض حاسدین بھی ہوتے ہیں۔۔ایسے لوگوں کا پتہ چل بھی جائے تو درگزر کرنا چاہیے۔دو چار لوگوں کے نام دینے سے مجھے یا انہیں کیا فرق پڑے گا بلکہ مجھے تو اُن کرم

فرماؤں کا شکریہ ادا کرنا چاہیے اگر وہ راہ میں نہ آتے تو شاید میں آگے بڑھنے کی کوشش ہی نہ کرتا۔ پھر ادبی زندگی میں بعض ناپسندیدگیاں یا مخالفتیں کوئی خاندانی دشمنیاں بھی نہیں ہوتیں۔ آغاز میں ہم بھی ادبی اخبار بچنگ آمد نکال کر ادبی لڑائیاں لڑتے رہے مگر اب سوچتا ہوں کہ سب بیکار تھا۔ ادب کے طالب علموں کو مطالعے اور تخلیقی کاموں کے سوا ادھر اُدھر دیکھنا بھی نہیں چاہیے۔ یہ جو نادانی میں ''ناموری'' کا بھوت تنگ کرتا ہے تو انسان دل آزاری سے بھی باز نہیں آتا۔ شہرت نصیبوں کا معاملہ ہے۔ ایک اجنبی چائے کے کھوکھے پر بھی کام کرتے ہوئے اچانک راتوں رات مشہور ہو جاتا ہے۔ کوئی شاعر اپنی ایک غزل سے، اداکار ایک فلم سے بھی ہٹ ہو جاتا ہے۔ سنگر ایک گیت سے مقبول ہو جاتا ہے، یہ سب مقدر کی باتیں ہیں۔ سو انسان کو شہرت کے لیے انا اور عزتِ نفس کو داؤ پر نہیں لگانا چاہیے۔ ہاں تخلیقی سفر میں خوب سے خوب تر کے لیے کوشش کی جانی چاہیے۔ ہمارے ادبی حلقوں میں بہت سے نان جنوئن شعراء جو سفید کاغذ پر اصلاح لینے پر قدرت رکھتے ہیں۔ پیسے کے بل بوتے پر مشہور بھی ہو جاتے ہیں۔ ان پر مضامین لکھے جاتے ہیں، شامیں منائی جاتی ہیں۔ الیکٹرانک میڈیا بھی ان کے گن گاتا ہے۔ لیکن ہم سب ایک دوسرے کو خوب جانتے ہیں کہ کون کس طرح ''مہنگی'' شہرت خریدتا ہے اور کل وہ کیا تھا آج وہ کیا ہے؟ حقیقی عزت اور داد تو وہ ہوتی ہے جو دشمن بھی تنہائی میں آپ کے شعر پڑھ کر دے۔ یہی دلوں پر حکمرانی ہوتی ہے۔ لیکن ہمارے ہاں اچھی تخلیق پر داد بھی نہیں دی جاتی۔ اندر سے بھلے وہ تسلیم کرتے ہیں مگر شاعر کے سامنے اسکی تعریف کے لیے ہمیشہ تنگ دلی کا مظاہرہ کیا جاتا ہے۔

☆ ان بابوں کی نسبت بھی پردہ کشائی کیجیے جو آپ کے تراشے ہوئے ہیں اور ضرورت کے وقت ظاہر ہو کر آپ کے مددگار ہوئے ہیں۔

☆☆ بابے تراشے تو کبھی نہیں۔ میں عملی آدمی ہوں۔ ایک بابا جی لڑکپن میں ملتان میں ملے تھے۔ ملتان بس اڈہ کے قریب، نو بہار نہر کنارے ان کا مزار موجود ہے۔ اور وہاں کے سینکڑوں لوگ جانتے ہیں کہ میں چودہ برس کسی نہ کسی صورت ان کے ساتھ منسلک رہا۔ سائیں جی ملتان میں اچھے خاصے زمیندار اور کاروباری خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ دولت کی کمی نہ تھی مگر سب کچھ ترک کر کے فقر کی راہ پر آ گئے۔ وہی مجھے لاہور چھوڑ کر گئے تھے۔ دنیا سے ان کے پردہ کر جانے کے بعد ایک اور ''سید بادشاہ'' سے روحانی سلسلہ جڑا ہوا ہے میرے اندر یہ جو معمولی تبدیلی بعض احباب محسوس کرتے ہیں انہی کے فیض اور کرم کے طفیل ہے۔ میرے کالموں اور تحریروں میں انہی کی محافل کے فقیروں، درویشوں کا تذکرہ ہوتا ہے۔ کبھی کبھی راہ چلتے بھی کچھ درویشوں سے رابطہ ہو جاتا ہے۔ ہم اپنی زبان میں ان کو ''سرکاری لوگ'' کہتے ہیں۔ ''جی بسم اللہ'' کے کالموں میں ایسے کئی درویشوں کا تذکرہ موجود ہے۔ ایسی ہی ایک اور کتاب پائپ لائن میں ہے۔

☆ اردو ادب سے تنقید تو کب کی عنقا ہوئی۔ ہر کوئی من پسند لوگوں کے سہرے لکھ رہا ہے۔ آپ کی بابت لکھے گئے مضامین میں بھی کچھ ایسی ہی کیفیت پائی جاتی ہے؟

☆☆ ہم تنقید کے عنقا ہونے کا ایک عرصے سے سنتے آ رہے ہیں۔ پہلے والے ناقدین کے بعد ان کی جگہ نئے آنے والے لیتے ہیں۔ ہاں شاید وہ پہلے والا معیار کم کم دکھائی دیتا ہے۔ زمانے کی تیز رفتاری کے سبب لوگوں کے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ اب تو کتاب پڑھنے والے بھی ہمارے ہاں نایاب ہوتے جا رہے ہیں۔ ایسے میں تخلیقی ادب کے قارئین کتنے ہو سکتے ہیں۔ آپ کی بات سے سو فیصد اتفاق نہیں کیا جا سکتا ہے۔ آج بھی ہمارے بعض ناقدین بہت اچھا لکھ رہے ہیں۔

☆ اردو ادب کو ذاتی پسند ناپسند کے علاوہ دھڑے بندی اور گروہ بندی نے بہت نقصان پہنچایا ہے۔ قاسمی صاحب اور آغا صاحب کی وفات کے بعد صورتحال میں کسی طرح کی تبدیلی آئی ہے؟

☆☆ سوشل میڈیا کے دور میں اب اس طرح کی دھڑے بندی نہیں رہی۔ البتہ شاعروں میں چھوٹے چھوٹے گروپ ضرور نظر آتے ہیں۔ یہ سارا چکر مفادات کا ہے۔ ملکی سطح پر ایک ادبی اشرافیہ وجود میں ضرور آئی ہے۔ ان میں کانفرنسیں، مشاعرے کرانے والے منتظمین بھی شامل ہو گئے ہیں۔ یہ لوگ زیادہ تر، اسلام آباد، لاہور اور کراچی سے تعلق رکھتے ہیں۔ کتابوں کے انعامی مقابلے ہوں یا سرکاری ایوارڈ و اعزازات، انہی کی رائے کو فوقیت دی جاتی ہے۔ یہ لوگ ہر حکومت کے ساتھ ہوتے ہیں اور ہر ادبی ثقافتی کمیٹی کے ممبران بھی انہی میں سے بنائے جاتے ہیں، سو یہی منصف ہوتے ہیں ہر فیصلے میں۔۔ یہ اپنے مفادات کو ہمیشہ ترجیح دیتے ہیں۔۔ اس اشرافیہ سے تعلق بنا کر رکھنے والے نواز دیے جاتے ہیں باقی کڑھتے رہتے ہیں۔ مضافات میں رہنے والے اہل قلم کا تو کوئی پُرسانِ حال نہیں۔ کسی بھی سطح پر بہت کم پذیرائی ملتی ہے۔

☆ قیامِ مصر کے تجربات و مشاہدات میں اہلِ مصر کے روزمرہ کے علاوہ سیاسی سماجی، علمی ادبی صورتحال کی منظر کشی سے ہم جیسے کم علموں کا بھلا ہو سکتا ہے؟

☆☆ جی بسم اللہ! مصر میں اردو اینڈ پاک سٹڈی چیئر پر پانچ برس تعینات رہا۔ میرا تقرر عین شمن مصر کی دوسری بڑی جامعہ میں ہوا تھا۔ سال بعد الازہر یونیورسٹی کے بوائز اور گرلز اردو شعبوں سے بھی وابستہ رہا۔ وہاں مصریوں کو اردو پڑھانے کی کوشش کی۔ وہاں کئی دوسری یونیورسٹیوں میں بھی اردو پڑھائی جاتی ہے۔ اردو ادب پر وہاں تحقیقی کام بھی ہو رہا ہے۔ میں نے وہاں سے ہفتہ وار کالم روزنامہ نوائے وقت کے لیے تحریر کیے، بعد میں کتابی صورت میں ''موسیٰ سے مرسی تک'' کے نام سے شائع ہوئے۔ اس میں ہر شعبہ زندگی کو موضوع بنایا گیا ہے۔ اتنا ضرور ہے وہاں حسنِ یوسف'' کی جھلک کہیں دکھائی نہیں دی۔ نہ ہی کوہ طور سے آنکھوں کا سرمہ مل سکا۔ ہاں ام کلثوم کے گائے ''کلام اقبال'' سے مصری واقف ہیں۔ قاری باسط کے بیٹوں سے ملاقات بھی رہی۔ بعض اہل قلم اور چائے خانوں کا تذکرہ تفصیل سے اس کتاب میں موجود ہے۔

باقی صفحہ ۳۸ پر ملاحظہ کیجیے

''قیامت کی گھڑی''

(ڈاکٹر اختر شمار کا رنگِ سخن)

فاری شا (راولپنڈی)

سفر میں جب بھی مرے آسمان پڑتا ہے
کبھی کبھی وہ ستارہ بھی دھیان پڑتا ہے

ہمارا چاند اگر آنکھ بھر کے دیکھ بھی لے
تو ہر ستارہ ہی قدموں میں آن پڑتا ہے

نظر ٹھہرتی نہیں ہے کہ اس کے عارض کو
نظر بھی چھو لے تو اُس پر نشان پڑتا ہے

پڑا ہے شیشہء دِل پر تمہارا عکسِ یقیں
ملے ہیں پہلے کہیں ہم ، گمان پڑتا ہے

میں تجھ سے ملنے جو نکلوں تو کیا خبر تجھ کو
کہاں کہاں کا سفر درمیان پڑتا ہے

کواڑ کھول کر رکھتے ہیں رات دن ہم لوگ
کہ تیری راہ میں اپنا مکان پڑتا ہے

ابھی نظر ہی نظر سے یہاں ملی ہے شمارؔ
گلے یہ مُفت میں سارا جہان پڑتا ہے

☆

حق گوئی کو خلافِ صداقت شما ر کر
میں سچ کی فصل بوؤں تو نفرت شمار کر

تو یوں بھی انتقام مری بے کسی سے لے
میں آہ بھی کروں تو بغاوت شمار کر

دستار اتر بھی جاتی ہے چھوٹی سی بات پر
دستا ر کو نہ وجہِ فضیلت شمار کر

مقتل میں ہوں کہ دشت میں یا میری آنکھ میں
تازہ لہو کو میری ضرورت شمار کر

یا دشتِ تیرگی مرے کاسے میں ڈال دے
یا روشنی کو میر ی ضرورت شمار کر

یا اپنے پاؤں پر مجھے گرنے سے روک دے
یا میری لغزشوں کو عبادت شمار کر

کھولی ہے میں نے فصد، رگِ آفتاب میں
مجھ کو نئی سحر کی بشارت شمارکر

اے آسمان میں ترا اختر شمارؔ ہوں
میری نظر کی کچھ تو صداقت شمار کر

○

☆

کوچۂ دلبراں سے دُور بہت
میں ہوں اُس کہکشاں سے دُور بہت

میرے جھونکے کا انتظار کرے
ایک کھڑکی یہاں سے دُور بہت

مجھ پہ سایہ نہیں کسی کا بھی
میں ہوں ہر آسماں سے دُور بہت

کتنے پہروں سے اُس کی یاد میں ہے
دل کہ اک رازداں سے دُور بہت

میں ابھی پھر رہا ہوں خود چپ چاپ
تیرے وہم و گماں سے دُور بہت

کتنی مشکل سے خود کو لایا ہوں
فکرِ سُود و زیاں سے دُور بہت

میں کہ اک موڑ ہوں نیا تیرا
اور تری داستاں سے دُور بہت

آ گیا ہوں کہاں نجانے شمارؔ
اپنے پہلے نشاں سے دُور بہت

○

☆

اُسے ہنستے نہیں دیکھا کئی دن
مرا سورج نہیں نکلا کئی دن

وہ ٹھہرا تھا یہاں بس چند لمحے
مہکتا رہ گیا کمرہ کئی دن

سُلگتی ہیں مری پوروں کی آنکھیں
اُسے چھُو کر نہیں دیکھا کئی دن

جو اک شب کے لئے مجھ کو ملا تھا
میں اُسکی یاد میں رویا کئی دن

کوئی آہٹ نہیں کانوں میں گونجی
رہا گُم سم یہ دل رستہ کئی دن

جو بادل کی طرح چھایا ہو ا تھا
وہ بارش کی طرح اُترا کئی دن

ہوا کیا لے اُڑی اُس نقشِ پا کو
بھٹکتا رہ گیا صحر ا کئی دن

تری نظروں کی کرنیں کیا پڑی تھیں
ترو تازہ ر ہا چہرہ کئی دن

مرے اعصاب پر طاری رہا تھا
شمار اُس دھوپ کا سایا کئی دن

..... ○ .....

☆

پھول کو تازگی سے خطرہ ہے
دل کو اب دلکشی سے خطرہ ہے

میں محبت ہوں اور وہ نفرت
سو اُسے بھی مجھی سے خطرہ ہے

اپنے سر سے نہ ہاتھ دھو بیٹھوں
اپنی ہی خود سری سے خطرہ ہے

تیرے غم کا تو کچھ خیال نہیں
مجھ کو اپنی خوشی سے خطرہ ہے

عشق میں تو میں سرخرو ٹھہرا
اب مجھے زندگی سے خطرہ ہے

میری آنکھیں ہی چھِن نہ جائیں، شمّار!
اِس نئی روشنی سے خطرہ ہے

○

☆

اسرارِ جسم و جان کھلے مجھ پہ دَم بہ دَم
دل کی جو داستان کھلے مجھ پہ دَم بہ دَم

جیسے کرن کرن کوئی اُترے لہو میں چاند
ایسے ہی تیرا دھیان کھلے مجھ پہ دَم بہ دَم

دن کو زمینِ دل میں سمٹ آئے ہر نفس
راتوں کے آسمان کھلے مجھ پہ دَم بہ دَم

رستے دمک دمک کے پکاریں قدم مِرے
تاروں کے یہ نشان کھلے مجھ پہ دَم بہ دَم

چھلنی مِرے حواس ہُوئے تم کو کیا خبر
سوچوں کی جب کمان کھلے مجھ پہ دَم بہ دَم

منظر نیا ہے آنکھ میں ہر سانس ہی کے ساتھ
اخترؔ! کئی جہان کھلے مجھ پہ دَم بہ دَم

○

☆

وفا تھا بے وفا ہونا پڑا ہے — مرا ہونا مجھے مہنگا پڑا ہے
ارادوں میں دراڑیں پڑ رہی ہیں — نصیبوں میں کہیں رخنہ پڑا ہے
ابھی تسخیر کر سکتا ہوں تجھ کو — ابھی مٹھی میں اک لمحہ پڑا ہے
ابھی سے مان لوں میں ہار کیسے — ابھی تو آخری پتا پڑا ہے
چراغوں سے ہوئی کب ختم ظلمت — ہمیں تو آپ بھی جلنا پڑا ہے
ریاضت میں نے کی ہے تشنگی کی — مرے قدموں میں اب دریا پڑا ہے
ستارے خاک پر ہیں در بدر سے — زمیں پر آسماں بکھرا پڑا ہے
میں اُس کے خواب سے جانے لگا ہوں — وہ کتنا مطمئن سویا پڑا ہے
یہی کچھ سوچنے میں عمر بیتی — ابھی باقی بہت عرصہ پڑا ہے
عدو سے تو نمٹ بیٹھا ہوں اختؔر — مگر اب یار سے پالا پڑا ہے

..... ○ .....

☆

جاگ نصیبوں والے ذرا دروازہ کھول
سورج دستک دینے لگا دروازہ کھول
بجنے لگی ہے من مندر میں گھنٹی سی
تو بھی کبھی اِن آنکھوں کا دروازہ کھول
مجھ پر میرا راز کبھی تو افشا کر
اے میری مجذوب دعا !دروازہ کھول
اندر کی دنیا تو باہر جیسی ہے
میرے لیے تو آج نیا دروازہ کھول
تیری کھوج ہی تیرے در تک لے آئی
تو غنچہ اور میں ہوں ہَوا، دروازہ کھول
رات گئے یہ کس نے دل پر دستک دی
کس نے مرے کانوں میں کہا: دروازہ کھول
کھُل نہ سکوں اختؔر میں قفلِ ابجد ہوں
لوٹ جا چپکے سے نہ مرا دروازہ کھول

○

☆

زیرِ کائی جو گزرتی ہے کنول ہونے تک
میں اسی کرب میں رہتا ہوں غزل ہونے تک
کس قیامت کی گھڑی ہے کہ خدا جانتا ہے
میں تری راہ تکوں شامِ اجل ہونے تک
تو نے تو آگ بجھانے کا کہا ہے فوراً
راکھ ہو جائیں گ دل اس پہ عمل ہونے تک
میری آنکھوں کو ہُوں شہکار بنانے والا
سامنے بیٹھے رہو یوں ہی غزل ہونے تک
آخری دید سے یہ ہجر مکمل ہو گا
زہر بھی زہر نہیں، خون میں حل ہونے تک
کیوں نہ اِس ہجر سے بہتر ہے کہ ہجرت کر لیں
کون بیٹھا رہے اس دشت کے جل ہونے تک
کن تھپیڑوں سے گزرتا ہے تجھے سوچنے میں
تیرا فنکار شمار آنکھ کے شل ہونے تک

○

''جیون تیرے نام''

ڈاکٹر وزیر آغا

(●)

سفر کئی طرح کے ہیں۔۔۔ایک سفر وہ ہے جو گھر سے شروع ہو کر کسی نہ کسی منزل تک پہنچتا ہے اور پھر واپسی کا سفر بن کر دوبارہ گھر کے دروازے پر آ جاتا ہے۔سفر کی یہ نوع کاروباری ہے اور اس کی ڈور کے سرے مسکن اور منزل دونوں سے بندھے ہوتے ہیں۔۔۔دوسرا سفر وہ ہے ''جو سفر برائے سفر'' کے مسلک کے تابع ہے۔اس سفر میں مبتلا شخص ''دیکھتا چلا گیا'' کے تحت کسی ایک مقام کو اپنی منزل نہیں بناتا بلکہ جگہ جگہ کو مَس کرتا گزرتا چلا جاتا ہے۔سیاح اس قسم کے سفر میں مبتلا ہوتا ہے۔تاہم وہ دنیا بھر کی سیر کرنے کے بعد آخر ایک روز اپنے گھر پہنچ ہی جاتا ہے گویا اس سفر کی ڈور کا ایک سرا تو گھر کی کھونٹی سے ہمیشہ بندھا رہتا ہے۔جبکہ دوسرے سرے کو آزاد چھوڑ دیا جاتا ہے۔۔۔تیسرا سفر دائرہ در دائرہ طے ہوتا ہے اس میں مبتلا مسافر کسی ایک نقطہ (ذات، محبوب یا حقیقتِ اولیٰ) کو مرکز مان کر اس کے گرد طواف کرتا جاتا ہے۔صوفیا اور شعراء دونوں کو یہ سفر مرغوب ہے۔۔۔اس فرق کے ساتھ کہ صوفی تو مآل کار طواف کی لکیر کو عبور کر کے مرکز کی جانب جانے اور اس میں جذب ہونے کی کوشش کرتا ہے تا آنکہ وہ اس قابل ہو جاتا ہے کہ مرکز کو بار بار مَس کر سکے مگر وہ اس میں جذب ہو کر اپنی ذات کا بلیدان نہ دے۔۔۔ان سفروں کے علاوہ سفر کی ایک اور نوع بھی ہے جس میں مبتلا مسافر کسی خشک پتے کی طرح دوشِ ہوا پر سوار، بے سمت، بے منزل بھٹکتا پھرتا ہے۔بے حد حساس شعراء جو مرکزہ کو چھونے کے عمل سے بھی گزرتے ہیں کبھی کبھی اس چوتھی کھونٹ (جس کی کوئی منزل نہیں ہوتی) میں بھی چلے جاتے ہیں۔بالعموم چوتھی کھونٹ کا یہ سفر عارضی نوعیت کا ہوتا ہے اور یہ اچھی بات بھی ہے کیونکہ اگر یہ طویل ہو جائے تو مسافر کی شخصیت کو منہدم بھی کر سکتا ہے مگر چوتھی کھونٹ کے اس سفر میں مبتلا ہونا بجائے خود ایک اہم بات ہے کیونکہ یہ سفر اس بنیادی دکھ کو سطح پر لاتا ہے جس کا کوئی مداوا نہیں ہے اور جو شعری کیفیات کو متحرک کرنے میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔

اختر شمار کے زیرِ نظر شعری مجموعہ کا مطالعہ کرتے ہوئے میں نے محسوس کیا کہ ہر چند شاعر نے سفر کی پہلی تین صورتوں سے بھی لطف کشید کیا ہے مگر اس کے ہاں چوتھی صورت نسبتاً زیادہ نمایاں ہے۔دیکھنا چاہیے اس بے سنگِ میل سرنے کیا کیا روپ دھارے ہیں۔

اپنا تعارف کراتے ہوئے اختر شمار لکھتے ہیں:

کسی کی وہ صدائے بازگشت ہوں
جو پربتوں کے درمیاں
بھٹک رہی ہے آج تک

چند اور اشعار قابلِ غور ہیں:

میں ہوں اک اَن دیکھی منزل
کس نے دیکھی راہیں میری

ہماری چپ نہ ان کے واسطے بھی مسئلہ ٹھہرے
وضاحت سے یہ بہتر ہے قبیلہ چھوڑ دیتے ہیں

جس رات میں اس چاند کو آنکھوں میں سمولوں
لے جاتے ہیں اس رات ستاروں سے پرے خواب

میں دروازہ کھلا رکھوں گا لیکن
وہ لوٹ آنے کی گنجائش رکھے تو

ان دنوں جاگتے میں بھی ہم تو
جادۂ خواب میں بھٹکا کرتے

لے جاؤ نا خواب ہماری آنکھیں دے کر
اک مدت سے ہم تاوان لیے پھرتے ہیں

ہم لوگ جو ٹھوکریں تھے سہتے
رستے میں کہیں رکھے ہوئے تھے

سناٹے میں روح گھٹے
مار نہ ڈالے گھائل چپ

ہر کوس پہ جاگتے تھے پتھر
جس راہ سے ہم گزر جا رہے تھے

مگن خوابوں میں یہ دل کا پرندہ
کسی دن ڈار ہی سے کٹ گیا تو

یوں لگتا ہے کہ جیسے شاعر کا یہ سفر ''گھائل چپ'' میں لپٹا ہوا ہے۔اگر انسان اپنا دکھ دوسروں کو بتا سکتے تو دکھ کا بوجھ کم ہو جاتا ہے لیکن وہ حرفِ شکایت تک زبان پر نہ لا سکے تو اندر کے سناٹوں میں گھٹ کر رہ جاتا ہے۔اختر شمار نے جو سفر کیا ہے وہ اصلاً چپ کا سفر ہے مگر اس چپ کی اپنی کربناک آواز بھی ہے جو صرف انہیں سنائی دیتی ہے جو چپ کے تجربے سے گزرتے ہیں۔چپ کا یہ سفر اس وقت زیادہ کربناک نظر آتا ہے جب یہ محسوس ہو کہ مسافر ڈار سے بچھڑا ہوا ایک پنچھی ہے۔اختر شمار نے اپنے اس سفر کو خواب بھی کہا ہے، خواب بین کی آنکھیں بند اور ہونٹ سلے ہوتے ہیں (اس کیفیت کو ایک مخصوص سیاسی اور معاشرتی فضا میں رکھ کر دیکھیں تو مزید معنیاتی دائرے دکھائی دے سکتے ہیں مگر میں اس وقت اس سفر

کی ساخت کی نشان دہی کر رہا ہوں) بند آنکھوں اور سلے ہوئے ہونٹوں کی معیت میں خواب کے سمندر کی سطح پر ایک سفینے کی طرح ہچکولے کھاتے پھرنا۔۔۔ بس یہی وہ بنیادی امیج ہے جو اختر شمار کے اس شعری مجموعے میں اُبھرا ہے۔۔۔ انتہائی مسرت (جنت) اور انتہائی دکھ (جہنم) سے تو انسان کسی طرح سمجھوتا کر لیتا ہے لیکن ان دو انتہاؤں کے درمیاں ہمہ وقت بھٹکنا ایک ایسا کربناک تجربہ ہے جسے یا تو وہ قبیلے جانتے ہیں جو اس میں مبتلا ہوئے اور یا وہ حساس شعراء جنہوں نے خود کو ایک طرح کے No Mans Land کے رحم وکرم پر پایا۔

واضح رہے کہ ہجرت اور Diaspora میں بڑا فرق ہے۔

ہجرت کی صورت ایسے ہی ہے جیسے پودوں کی پنیری کو ایک جگہ سے اکھیڑ کر دوسری جگہ لگا دیا جائے۔ گویا ہجرت میں ایک وطن یا خطۂ ارض کی جگہ ایک اور وطن یا خطۂ ارض لے لیتا ہے مگر Diaspora کا مطلب ہے بے وطن بے گھر اور بے منزل ہو جانا۔۔۔ وہ مسافر یا قبیلہ جو اس میں مبتلا ہو جائے ہمیشہ بھٹکتے ہی رہے۔۔۔ ہمیشہ اندر اور باہر کی دنیاؤں کے عین درمیان ہی کہیں بکھرے رہے۔ مگر اختر شمار کا معاملہ یہ ہے کہ اس نے خود کو پوری طرح اس کربناک کیفیت کے سپرد نہیں کیا، اگر وہ ایسا کرتا تو اس کا تخلیقی عمل بری طرح متاثر ہوتا تاہم اس نے اس کربناک کیفیت کو بار بار چھوا ضرور ہے۔ جس کے نتیجے میں اس کا دکھ متشکل ہو کر سامنے آ گیا ہے اور قاری کو محسوسات کے نقاب اندر نقاب جہان کی ایک جھلک دکھانے میں کامیاب ہو سکا ہے۔

غزلوں کے اشعار ہی نہیں، اختر شمار کی نظموں میں بھی بھٹکنے کا یہ تجربہ نئے نئے عنوانات کے ساتھ سامنے آیا ہے بلکہ اس کی نظم میں یہ تجربہ نسبتاً زیادہ مربوط اور ہمہ گیر ہے۔ چند اقتباسات قابلِ غور ہیں:

ابھی ہمارا عکس آئینے پہ ثبت ہونا ہے
بھلا یہ زندگی کہاں کھلی ہے ہم پہ
اور ابھی
سینۂ آب پر
ہم حباب ہی تو ہیں
چشمِ کائنات میں
اُداس خواب ہی تو ہیں
۔۔۔خواب میں خواب
مجھ پہ منڈلاتا ہے ہاتھ آتا نہیں
ایک تتلی کی طرح
اُڑ رہا ہے آس پاس
اس کا تتلانا بھی میری آنکھ اور ہاتھوں سے تیز
ہاتھ میں آ کر نکل جائے کبھی
اور میں رہ جاؤں یونہی دیکھتا
حیراں ہوں میں
کیوں وہ میری دسترس میں آ کے بھی آتا نہیں!
۔۔۔''وہ''

''وہ'' بیک وقت ایک خواب بھی ہے اور شاعر کا ہم زاد بھی جو دسترس میں آ کر بھی آتا نہیں ہے۔ دسترس میں تو وہ آئے جو مرئی ہو، جس کی جڑیں زمین میں اُتری ہوئی ہوں یا جس کی ڈور مستقبل کے کسی سنگِ میل سے بندھی ہوئی ہو۔ ''وہ'' تو ایک بے سمت، بے منزل بھٹکی ہوئی روح ہے جسے گرفت میں لینا ناممکن ہے۔ مگر شاعر کو ساتھ ہی اس بات کا احساس بھی ہے کہ یہ غیر مرئی، ازل اور ابد سے بے نیاز شے خود کائنات کا دل ہے۔ یعنی خود کائنات ہے۔ معاً انسان سوچتا ہے کہ کائنات بھی ازل اور ابد کے درمیان کسی بے سمت مسافر یا بے جہت خواب کی طرح تو بھٹک نہیں رہی؟

ایک اور نظم کا ٹکڑا دیکھیے جس میں بھٹکنے کی کیفیت کو واضح الفاظ میں بیان کر دیا گیا ہے:

ہم دکھوں کے
آنسوؤں کے بادوباراں میں
نہتے دل کے ساتھ
بے پناہ ہے راستوں پر
پاؤں دھرتے جا رہے ہیں
دن گزرتے جا رہے ہیں
۔۔۔''دن گزرتے جا رہے ہیں''

میں نے کوشش کی ہے کہ اختر شمار کی تہ در تہ شعری کائنات کی بنیادی ساخت کو کھول کر بیان کر دوں تا کہ قاری اختر شمار کی شاعری میں محض جسمانی محبت اور اس سے منسلک جذباتی کروٹوں تک محدود نہ رہے بلکہ اس میں مضمر امکانات تک پہنچنے کی کوشش کرے۔ اگر میں اپنی اس کوشش میں کامیاب ہوا ہوں تو قاری نے اختر شمار کی شاعری کے متنوع پہلوؤں کو مَس کر لیا ہے اب وہ چاہے تو اس شاعری کے بارے میں اپنا اقداری فیصلہ Judgment Value بھی سنا سکتا ہے۔ اختر شمار کی شاعری کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد مجھے یقین ہے کہ یہ فیصلہ ضرور اختر شمار کے حق میں ہوگا۔

اذیت

جتنا زیادہ سوچو گے اتنی زیادہ اذیت میں رہو گے،
یا تو اپنے آپ کو مضبوط کر لو یا مصروف کر لو۔

(مشتاق یوسفی)

''عمرِ رواں ٹھہر جائے''

پروفیسر خواجہ ندیم اسلم
(ملتان)

اختر شمار کا اصل نام محمد اعظم خان ہے۔ وہ 17 اپریل 1960ء کو راولپنڈی کے قریب ایک گاؤں میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد محمد اکبر خان نے ایک عرصہ پاکستان آرمی میں خدمات سرانجام دیں۔ آپ کے دادا نواب خان کا تعلق اسی گاؤں کے ایک زمیندار گھرانے سے تھا۔ اختر شمار اپنے پانچ بھائیوں میں چوتھے پر نمبر ہیں۔ ان کے سبھی بھائیوں نے کسی نہ کسی طرح پاک آرمی میں وطنِ عزیز کی خدمت کی۔ آپ کے والد آرمی سے ریٹائرمنٹ کے بعد ملتان میں مقیم ہو گئے اور وہیں پاک عرب کھاد فیکٹری میں ملازمت کرنے لگے۔ اختر شمار نے اپنی ابتدائی تعلیم گاؤں کے علاوہ ملتان میں مکمل کی جبکہ ایم۔اے اسلامیہ یونیورسٹی بہاول پور اور پی ایچ ڈی کی ڈگری پنجاب یونیورسٹی سے حاصل کی۔

اختر شمار نے اپنے کیریر کا آغاز صحافت سے کیا۔ وہ کچھ عرصہ مقامی اخبارات سے منسلک رہے، بعد ازاں نوائے وقت ملتان میں ادبی کالم نگاری کرنے لگے۔ 1986ء میں اختر شمار لاہور شفٹ ہو گئے۔ کچھ عرصہ مقامی اخبارات سے وابستہ رہنے کے علاوہ ریڈیو، ٹی وی کے لئے گیت اور ڈرامے لکھتے رہے۔ 1989ء میں انہوں نے گورنمنٹ اسلامیہ ڈگری کالج قصور میں بہ حیثیت لیکچرار جائن کر لیا، اس دوران وہ روزنامہ نوائے وقت اور ہفت روزہ فیملی میگزین میں بطور کالم نویس بھی کام کرتے رہے۔ 1994ء میں آپکا تبادلہ گورنمنٹ ڈگری کالج راوی روڈ لاہور ہو گیا۔ اور یہیں سے وہ دیال سنگھ کالج میں کچھ عرصہ رہ کر گورنمنٹ کالج لاہور آ گئے۔ 2003ء میں انہوں نے ''خیام الہند سید جلال الدین حیدر دہلوی احوال و آثار'' کے موضوع پر مقالہ لکھ کر پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی اور ایف سی کالج میں بطور ہیڈ آف ڈیپارٹمنٹ خدمات سرانجام دینے لگے۔ اسی دوران 2008ء میں انہیں حکومتِ پاکستان کی طرف سے اردو اینڈ پاک سٹڈیز چیئر کے لئے منتخب کر کے جامعہ عین شمس قاہرہ بھیج دیا گیا۔ جہاں وہ جامعہ عین شمس کے علاوہ جامعہ الازہر کے بوائز اور گرلز دونوں اردو شعبوں میں بھی تدریسی خدمات سرانجام دیتے رہے۔

اختر شمار دبستانِ لاہور کی نہایت فعال اور متحرک ادبی شخصیت کے طور پہچانے جاتے ہیں ۔ انہوں نے لاہور کے مختلف اخبارات ، روزنامہ پاکستان، روزنامہ خبریں، روزنامہ ایکسپریس اور روزنامہ نوائے وقت میں صحافتی خدمات سرانجام دیں۔ وہ روزنامہ پاکستان لاہور اور روزنامہ خبریں لاہور کے میگزین سیکشن سے بھی وابستہ رہے۔ ان کی کالم نگاری کا سلسلہ تا حال جاری ہے۔ راس وقت وہ وزنامہ نوائے وقت کے ممتاز کالم نگاروں میں شمار کیے جاتے ہیں۔

لاہور کے ادبی حلقوں کی جانی پہچانی شخصیت اختر شمار نے اپنی شاعری کا آغاز 1973ء میں کیا۔ اس سلسلے میں ممتاز بزرگ اور استاد شاعر بیدل حیدری کی شاگردی اختیار کی۔ 1984ء میں انہیں فارغ التحصیل کر دیا گیا۔ اور وہ ملتان اور قرب وجوار کے شہروں میں منعقدہ مشاعروں میں ایک کامیاب شاعر کے طور پر ابھرے۔ ان کا پہلا مجموعہ کلام کاروانِ ادب ملتان کے زیر اہتمام ''روشنی کے پھول'' کے نام سے 1985ء میں شائع ہوا۔ یہ مختصر مجموعہء کلام ''ہائیکو'' پر مشتمل تھا۔

اختر شمار بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں۔ مگر انہوں نے اُس دور میں ابھرتی ہوئی صنفِ سخن ہائیکو میں طبع آزمائی کی اور اپنے منفرد لہجے سے سب کو حیران کر دیا۔ ان کا مجموعہ ''روشنی کے پھول'' پاکستان میں ہائیکو کا تیسرا مجموعہ ہے۔ اختر شمار کی شادی 1989ء میں گجرات میں ہوئی۔ ان کے تین بیٹے ہیں۔ تیمور اختر جامعہ قاہرہ میں گریجویشن اور جی سی یونیورسٹی سے ایم بی اے کر کے ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں ملازمت کر رہا ہے۔ جبکہ وقار اختر ایم اے انگریزی اور محمد احتشام ایم فل کا طالبعلم ہے۔

اختر شمار کو لاہور سے پاکستان کا پہلا باقاعدہ ادبی اخبار ''بجنگ آمد'' شائع کرنے کا اعزاز بھی حاصل ہے۔ بجنگ آمد میں تمام خبریں کالم اور مضامین، ادیبوں شاعروں کے حوالے سے شائع ہوا کرتے تھے۔ مسلسل دس برس تک شائع ہونے والا یہ پندرہ روزہ اخبار بعد ازاں ہفت روزہ کر دیا گیا۔ بجنگ آمد لاہور کی فائلیں، گورنمنٹ کالج یونیورسٹی کی مرکزی لائبریری میں موجود ہیں، جو اپنے اندر اس دور کی ادبی تاریخ سمیٹے ہوئے ہیں۔

1996ء میں اختر شمار کو اہلِ قلم کے عہد ساز ادبی پلیٹ فارم، حلقہ ارباب ذوق لاہور کا بلا مقابلہ سیکریٹری منتخب کر لیا گیا۔ انہوں نے کئی بین الاقوامی ادبی کانفرنسوں اور مشاعروں میں شرکت کی۔ پہلی بار 1998ء میں وہ شام بہار ٹرسٹ انبالہ (بھارت) کی دعوت پر انبالہ چندی گڑھ پانی پت اور دہلی میں منعقدہ ادبی تقاریب میں شریک ہوئے۔ 2001ء میں انہوں نے اردو مرکز لاس اینجلس اور علی گڑھ ایسوسی ایشن واشنگٹن کی دعوت پر امریکہ کے عالمی مشاعروں میں شرکت کی۔

اختر شمار اب تک، امریکہ، ناروے، یو کے اور خلیجی ممالک کے علاوہ بھارت کے کئی شہروں میں منعقدہ عالمی کانفرنسوں، سیمناروں اور مشاعروں میں شرکت کر چکے ہیں۔ ان کی اب تک شائع ہونے والی تصانیف درج ذیل ہیں۔

شعری کتب: روشنی کے پھول'' (ہائیکو) ''1985ء۔ کسی کی آنکھ ہوئے ہم'' 1992ء، ''یہ آغازِ محبت ہے'' 1993ء، ''جیون تیرے نام'' 1994ء، ''ہمیں تیری تمنا ہے'' 1995ء، اکھیاں دے وچ دل (پنجابی شاعری) 1996ء ''آپ سا نہیں کوئی'' 2001ء، ''کبھی میری محبت ہو'' 2002ء، دھیان 2004ء، میلہ چار دیہاڑے (پنجابی شاعری) 2010ء جبکہ دیگر

تصانیف میں جنوبی ایشیا میں مسلم تہذیب وفکر (تحقیق) 2002ء، ''پنجابی ادبی رنگ'' (تنقید وتحقیق) 2002ء، ''انتخابِ جمال'' (تنقید وتحقیق) 2003ء، ''بھرتری ہری ایک عظیم شاعر'' (تحقیق) 2007ء، ''ویلے دی اکھ'' (پنجابی کہانیاں ایوارڈ یافتہ) 2009ء، ''دنیا مسافر خانہ اے'' (پنجابی کالم) 2010ء ''میں بھی پاکستان ہوں'' اور ''ہم زندہ قوم ہیں'' (اردو کالم) 2010ء، ''خطوں میں دفن محبت'' (رومانی خطوط) 2010ء، وقت کی آنکھ (پنجابی کہانیوں کا اردو ترجمہ) 2011ء، آدابِ خود آگاہی (فکری مضامین) 2011ء، موسیٰ سے مُرسی تک (مصر) 2013ء لاہور کی ادبی ڈائری (ادبی کالم) 2014ء جی بسم اللہ (صوفیانہ کالم) 2016ء حیدر دہلوی احوال وآثار (تحقیق) 2016ء عاجزانہ (شاعری) 2018ء اور اختر شماریاں (شعری کلیات) 2019ء شامل ہیں۔

اختر شمار نے اردو، پنجابی شاعری کے علاوہ کہانیاں بھی لکھیں۔ٹی وی اور ریڈیو کے لئے ڈرامے اور گیت بھی تخلیق کیے۔ان کی کہانیوں کے مجموعے کو 2009ء کی بہترین نثری کتاب کا پہلا ایوارڈ بھی ملا۔ان کی کہانیوں کے انگریزی اور عربی میں تراجم ہو چکے ہیں۔

اختر شمار کی شاعری:

اختر شمار بچپن ہی سے شعروادب سے لگاؤ رکھتے تھے۔ان کے والد کی صوفیانہ شاعری میں دلچسپی کے باعث اختر شمار کو بھی شعر وادب اور خصوصاً صوفیانہ شاعری سے شغف پیدا ہوا۔

شروع میں عام نوجوانوں کی طرح وہ بھی ساحر لدھیانوی، ساغر صدیقی، فیض اور میر تقی میر کے علاوہ میاں محمد بخش، وارث شاہ، جیسے شعراء سے متاثر ہوئے۔اختر شمار کو 1980ء کی دہائی کا اہم ترین شاعر قرار دیا جاتا ہے۔یہ وہ دور تھا جب پاکستان پر مارشل لاء کی حکومت تھی اور ذرائع ابلاغ پر ہی نہیں، آزادی اظہار پر بھی قدغن لگی ہوئی تھی۔اس دور کی شاعری علامتی اور مزاحمتی اندازِ فکر کی ترجمان نظر آتی ہے۔اس دور کی غزل اور ہائیکو میں اختر شمار کے ہاں بھی ایک مزاحمتی رویہ غالب دکھائی دیتا ہے۔ان کے اشعار میں معاشرتی ناہمواریوں، ظلم جبر، غربت وافلاس، ناانصافی کے خلاف، غم وغصہ اور احتجاجی رنگ نمایاں ہے۔چند اشعار بطور نمونہ ملاحظہ کیجیے:

میں قتل گاہ میں جا کر بھی سچ ہی بولوں گا
میں وہ زبان نہیں ہوں جو کیل دی جائے

مقتل میں ہو کہ دشت میں یا میری آنکھ میں
تازہ لہو کو میر ی قیادت شمار کر

تو یوں بھی انتقام مری بے کسی سے لے
میں آہ بھی کروں تو بغاوت شمار کر

اختر شمار کے پہلے مجموعہ کلام ''روشنی کے پھول'' کے دیباچہ نگار معروف نقاد ڈاکٹر نجیب جمال لکھتے ہیں:

''اختر شمار کو پہلے پہل میں نے ایک مشاعرے میں غزل پڑھتے دیکھا تھا، اس کی غزل نے مشاعرے کی چھت اُڑا دی تھی۔ وہ اپنی looks پڑھنے کے انداز اور اشعار کی اٹھان سے دستار کو وجہِ فضیلت شمار نہ کرنے والا اینگری ینگ مین نظر آتا تھا۔میں نے اس کی آنکھوں میں گئے دنوں کا جال ٹوٹتے اور بنتے دیکھا، اُس کی آنکھوں کے نیلے تالابوں میں نیلی روشنیوں کا راستہ تھا، مجھے خوشی ہوئی کہ اس کی غزل بیماری کی اوڈیسی نہیں تھی، اس کے اشعار خیالوں اور خوابوں کے سربمہر تابوت نہیں تھے، وہ مجھے انا کا پھیلاؤ دکھائی دیا۔بے خوفی اور پیکار اس کے ایک ایک لفظ میں موجود تھی، ان اشعار میں اس تماشبین کے بہکتے ہوئے قدموں کی چاپ سنائی نہیں دے رہی تھی جو ایک ہاتھ میں چار آنے کا ہار پہنے اور دوسرے میں پانوں کی ڈبیا تھامے بالا خانے کی سیڑھیاں طے کرتا ہے اور چوکھٹ کے اندر قدم رکھتے ہی اپنی ہانپتی ہوئی لمبی زبان باہر نکال کر مہندی لگے پاؤں کے تلوے چاٹنے لگتا ہے۔'' وہ کہہ رہا تھا:

یا اپنے پاؤں پر مجھے گرنے سے روک دے
یا میری لغزشوں کو عبادت شمار کر

اور مجھ پر محمد حسن عسکری کے لفظوں کی معنویت کھُل رہی تھی کہ سچا فنکار ستارے ڈھونڈنے نہیں نکلتا اس کے لیے اس کا بادبان ہی ستارہ ہے، ٹالسٹائی کی طرح میں بھی فن کو انسانی زندگی کی حالت سمجھتا ہوں جس کا کام انسان اور فنکار کے درمیان تفہیم پیدا کرنا ہے، فن کار روح میں اتر جانے والی اثر آفرینی سے اپنے اُن احساسات میں ہمیں شریک کر لیتا ہے جو اُس کی زندگی بھر کا سرمایہ ہوتے ہیں گویا مجھ پر اختر شمار کا جادو چل گیا تھا۔'' اسکے ہائیکو کے نمونے ملاحظہ ہوں:

میں اندھیروں کا قرض دار سہی
باوجود اسکے میرا وعدہ ہے
روشنی مانگ کر نہیں لوں گا

اختر اس ماڈرن زمانے میں
اپنے خوابوں سے ہار کر کل شب
زہر چاٹا ہے ایک لڑکی نے
حادثہ اس سے بڑھ کے کیا ہو گا
کال اس وقت نوکری کی ملی
جب سند آگ میں جلا دی تھی

رات کے پچھلے پہر چپکے سے
ایک تصویر مجھ سے کہتی ہے
اب تو اختر شمار سو جاؤ

''اختر شمار کی آواز میں وہ کاٹ موجود ہے جو ایک بنیادی تخلیق کار کو عظیم تخلیق کار بناتی ہے۔میں نے ان کے ہائیکو سنے بھی ہیں اور پڑھے بھی ہیں۔

غزل کی طرح اِس صنف میں بھی اختر شمار نے اپنے ذوقِ لطیف، مشاہدے، مطالعے اور عشق کے بل بوتے پر قابلِ حیرت اضافہ کیا ہے۔ میں اختر شمار کے ہائیکو پڑھ کر پورے وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ بطور شاعر اُن کا مستقبل درخشاں ہے اور وہ دن دور نہیں جب اُن کا شمار برِ صغیر پاک و ہند کے بڑے شاعروں میں ہوگا۔'' (روشنی کے پھول جون 1985ء) اور پھر بیدل حیدری کا کہا بالکل درست ثابت ہوا اور اختر شمار اپنی مسلسل ریاضت کے سبب اردو شاعری میں اپنی الگ شناخت حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئے۔ انہوں نے دنیا بھر کے عالمی مشاعروں میں شرکت کی۔ انٹرنیٹ پر ان مشاعروں کی ویڈیو کلپس اس بات کا ثبوت ہیں کہ وہ اردو شاعری کے دلدادہ افراد میں کس قدر مقبول ہیں۔ عرش صدیقی ان کی شاعری کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''اختر شمار اُن شعرا میں سے ہیں جو جبلت کو آزادانہ سرگرم عمل رہنے کی اجازت دیتے ہیں اور نہ ہی تخیل کو بے لگام چھوڑ دیتے ہیں، وہ شعور کی رہنمائی کو قبول کرتے ہیں اور اس مستحسن رویئے کے خوش گوار اثرات اور شیریں ثمرات اس کی غزلوں کے علاوہ اس کی ہائیکو میں بھی دیکھے جاسکتے ہیں۔'' (روشنی کے پھول صفحہ 61)

اختر شمار نے واقعی اپنی غزل میں ہم عصر شعری رویوں سے قدرے الگ اور منفرد اندازِ فکر اختیار کیا۔ ان کی غزل میں جہاں ترقی پسند لب و لہجے کے اثرات نمایاں ہیں۔ وہیں ان کے ہاں محبت کے احساسات و جذبات اور ذات و کائنات کے حوالے سے تفکر اور مشاہدے کا منظر نامہ بھی دیکھا جاسکتا ہے۔ چند اشعار دیکھئے:

میں تو اِس واسطے چپ ہوں کہ تماشا نہ بنے
تو سمجھتا ہے مجھے تجھ سے گلہ کچھ بھی نہیں

یا اپنے پاؤں پر مجھے گرنے سے روک دے
یا میری لغزشوں کو عبادت شمار کر

دستار اتر بھی جاتی ہے چھوٹی سی بات پر
دستار کو نہ وجہِ فضیلت شمار کر

درخت آپس میں کہہ رہے تھے کوئی بتاؤ
ہوائیں جنگل میں رات کیسے گزارتی ہیں

اختر شمار کی شاعری میں بیک وقت متصوفانہ شعور اور مزاحمتی اندازِ فکر ایک حسین امتزاج کے ساتھ متشکل ہوتے ہیں وہ انسان کے احساس تنہائی، بے چینی، مایوسی اور دکھوں کے ساتھ ساتھ ناانصافی اور جبر و استبداد کے معاشرے میں غم و غصے بھرے احتجاج کو شعری سانچے میں ڈھالنے پر قدرت رکھتے ہیں۔

نئی نسل کے مقبول شاعر فرحت عباس شاہ، اختر شمار کی شاعری کے حوالے سے تحریر کرتے ہیں:

''لفظ زندہ اشیاء ہیں ان کا اپنا ایک روحانی نظام ہوتا ہے۔ یہ نیک بھی ہوتے ہیں بد بھی۔ بڑے بھی ہوتے ہیں چھوٹے بھی، سچے بھی ہوتے ہیں جھوٹے بھی، لیکن ان کے کردار خواص کا انحصار انہیں برتنے والے انسان کی اپنی نیکی بدی اور سچ جھوٹ پر ہوتا ہے۔ یہ جامد بھی ہوتے ہیں متحرک بھی ان کی اپنی ایک مرکزیت ہوتی ہے جو تخلیق کار کی اپنی ایک مرکزیت سے جڑی ہوتی ہے۔ خیال، سوچ اور ایک عرفان اور نیت کی مرکزیت سے اختر شمار کے لفظ زندہ سچے اور متحرک ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی شاعری جیتی جاگتی بولتی اور جھنجوڑتی ہوئی شاعری ہے۔ وہ باطنی طور پر صوفی ہوتے ہوئے بھی کسی نیم تاریک کمرے میں چلہ کشی کرنے کی بجائے، افراد کے درمیان رہ کر ان کے داخلی و خارجی منفی رویوں کی مذمت اور ان کے خلاف مزاحمت کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ وہ عین عملی انسان ہے۔ انا پسند، خوددار اور بے باک دلیر۔۔۔ عشق مجازی ہو یا حقیقی، پیار محبت کی بات کرتے ہوئے اس کا لہجہ نرماہٹ اور شیرینی سے بھر جاتا ہے مگر جب بات انسانی کردار کی پستی اور معاشرتی آلودگی کی ہوتی ہے تو اس کا لہجہ انتہائی کاٹ دار کرخت اور بلند ہو جاتا ہے اور کہیں کہیں تو وہ مسلح جدوجہد پر بھی مائل نظر آتا ہے۔ گو یہاں آ کر وہ ایک روایتی صوفی سے بالکل مختلف لگتا ہے لیکن صوفیانہ دل کا مالک اختر شمار جنگجوانہ بلکہ مجاہدانہ سوچ اور ارادوں کا شاعر ہے۔ عشق و محبت سے جنگ و جدل تک وہ رضائے الٰہی کے ہر راستے کا مسافر ہے۔ اگر بغور دیکھا جائے تو صوفیانہ شعری رویہ اس کے ہاں غالب رویہ ہونے کے باوجود اکلوتا یا واحد شعری رویہ نہیں ہے۔ بلکہ بہت سے غیر واضح نیم واضح اور شفاف رویے اس کی شاعری میں اپنی اپنی سطح پر جگمگاتے نظر آتے ہیں۔ لیکن اہم بات یہ ہے کہ اتنے رویے ایک جگہ باہم کارفرما ہونے کے باوجود اس کے قول و فعل ظاہر اور باطن میں کہیں بھی کوئی تضاد پیدا نہیں ہوا۔ اس کی مرکزیت کہیں بھی منتشر نہیں ہوئی کہ اس کی شخصیت اس کے کردار اور شعری حسن و پاکیزگی پر کوئی دھبہ لگتا۔ یہی وہ سب سے بڑی، سب سے اہم اور قابلِ ذکر صفت ہے جس نے اختر شمار کو اردو ادب کے سینکڑوں، ہزاروں شاعروں سے الگ تھلگ اور بلند مقام پر لا کھڑا کیا ہے۔''

(مشمولہ۔ جیون تیرے نام۔ جون 1994ء)

اسی طرح پروفیسر اطہر ناسک اختر شمار کو جدید ترین اردو غزل کا نمائندہ شاعر قرار دیتے ہیں ان کے مجموعہ کلام ''یہ آغاز محبت ہے'' کے دیباچے میں وہ لکھتے ہیں:

''اپنے نئے ''متصوفانہ شعور'' کے ساتھ اختر شمار نے اردو شاعری میں ایک نئے آسمان کے طور پر جنم لیا ہے۔ جو بذاتِ خود شاعری کے نئے آسمانوں کو جنم دے رہا ہے، جو نئی زمینوں پر تانے جائیں گے اور یہ نئی زمینیں بھی وہ خود ہی تراش رہا ہے۔ اس کی غزل بلاشبہ جدید ترین اردو غزل کا سنگِ میل ہے۔ اور زیرِ نظر مجموعہ بیسویں صدی کی طرف سے اکیسویں صدی کے دروازے پر کی جانے والی چند ابتدائی دستکوں میں سے ایک ہوگا۔

(سید اطہر ناسک۔ 27 اپریل 1993ء)

مجموعی حوالے سے اختر شمار کے تمام شعری مجموعوں کی شاعری کا تجزیہ کرتے ہوئے ، صدرِ شعبہ اردو مرے کالج سیالکوٹ، ڈاکٹر عارف ثاقب ''آپ سانہیں کوئی'' کے دیباچے میں رقم طراز ہیں:

''اختر شمار بیک وقت بہت تلخ اور بہت شیریں شاعر ہے اور یہ دونوں رویے اس کے ہاں بڑی تیزی سے تبدیل ہوتے ہیں۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ اس کے پاس درمیان کا کوئی راستہ نہیں۔ وہ جھوٹ کو جھوٹ اور سچ کو سچ کہتا ہے۔ محبت سے محبت اور نفرت سے نفرت کرتا ہے۔ غلط کو غلط اور صحیح کو صحیح کہتا ہے اور ایسا کرتے ہوئے کہیں اس کا لہجہ بہت واضح اور کہیں طنز آمیز کاٹ سے ہمکنار ہوتا ہے۔ وہ جب حق گوئی کو خلافِ صداقت شمار کرتا ہے تو دراصل معاشرے کے اس دکھ کو محسوس کرتا ہے جہاں سچ بات کہنا جرم تصور کیا جاتا ہے۔ وہ خود تو سچ کی فصل بوتا ہے مگر اسے نفرت شمار کرنے کو کہتا ہے۔ آخر کیوں؟ کیا وہ ایسے معاشرے میں زیست بسر تو نہیں کر رہا جہاں سچ کی فصل کو کاٹنے والا کوئی نہیں؟ جہاں آہ بھرنے کو بھی بغاوت شمار کیا جاتا ہے۔ تلخ معاشرتی رویوں کو طنز آمیز پیرائے میں بیان کرتے کرتے اچانک اختر شمار اس معاشرے سے ہم کلام ہوتا ہے تو ایک سچے شاعر کا فریضہ انجام دیتا نظر آتا ہے۔ وہ اسے بتاتا ہے کہ دستار وجہِ فضیلت نہیں کہ یہ اُتر بھی سکتی ہے۔ اس کی سوچ اس کے لہو میں دوڑ رہی ہے۔ اسی باعث اس کے لہو کا ہر ہر قطرہ ایک تازہ سوچ اور نئی قیادت کو وجود میں لانے کا باعث بنتا ہے۔ اختر شمار کے پہلے مجموعہ کلام ''کسی کی آنکھ ہوئے ہم'' کی پہلی غزل ہی عجیب لہجوں سے ترتیب پاتی ہے۔ میں اس بات پر بھی حیران ہوں کہ اختر شمار نے اپنے دوسرے ہم عصروں کے رجحان سے ہٹ کر اس غزل کو پہلے مجموعے میں پہلے نمبر پر کیوں رکھا۔ جس کا مطلع یہ ہے۔

؎ حق گوئی کو خلافِ صداقت شمار کر
میں سچ کی فصل بوؤں تو نفرت شمار کر

اس پوری غزل کا مطالعہ اختر شمار کی شاعری کے ''ابتدائی عروج'' کا مطالعہ ہے۔ ابتدائی عروج میں نے اِس لیے کہا کہ اختر شمار ابتداء ہی سے شاعری کو ایک سنجیدہ عمل سے تعبیر کرتا ہے۔ تخلیقی عمل جس نوع کی کمٹمنٹ کا تقاضا کرتا ہے۔ وہ ہمیں بہت شروع ہی سے اختر شمار کے ہاں دکھائی دیتی ہے۔ دیکھئے ابتداء ہی سے وہ یا تو دشتِ تیرگی کی طلب کرتا ہے یا روشنی کو اپنے لیے ضروری تصور کرتا ہے۔ اس پہلی غزل میں وہ ایک عجیب حیرت کے مقام پر بھی ہے۔ وہ آپ کو یہ بھی کہتا ہے کہ یا تو اسے اپنے قدموں پہ گرنے سے روک لیں یا پھر اس کی لغزشوں کو عبارت شمار کریں۔ بس یہی وہ مقام ہے جہاں اختر شمار مجھے ایک عجیب دوراہے پر کھڑا دکھائی دیتا ہے۔ اس کے اندر برپا ہونے والے بہت سے تجربے اس کی شاعری کا جزو بن کر حیرت میں ڈال دیتے ہیں۔ ایک فرد بھی اس کے لئے تجربہ بنتا ہے، معاشرہ بھی ،افراد سے وابستہ معاشرتی حقائق بھی۔ خارجی زندگی کی بوقلمونی بھی۔

اس پہلے شعری مجموعے میں اختر شمار کے دکھ اس معاشرے سے جنم لیتے ہیں جہاں غیر تخلیقی قوتیں برسرِ پیکار ہیں۔ جہاں لطیف جذبے تاجرانہ ذہنیت کی بھینٹ چڑھ گئے ہیں۔

یہاں پہ اپنا کہیں تو کسی کو، عجیب دکھ ہے
شمار اب تو تمام رشتے تجارتی ہیں

خونی رشتہ اور نہ قبیلہ دیکھتی ہے
اب تو دنیا دولتِ دنیا دیکھتی ہے

ایسے میں محبت کا متلاشی یہ شاعر ایک گہرے کرب سے ہمکنار ہوتا ہے۔ ترکِ وفا کا غم اس کے لیے اتنا جان لیوا ہے کہ اس کے پاس کچھ باقی نہیں رہا۔ مگر یہی ترکِ وفا دوسرے لوگوں کے لیے اتنا اطمینان بخش ہے کہ جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ اختر شمار اسی گھٹن زدہ ماحول میں سے اپنے لیے راستے تلاش کرتا ہے اور بیاباں میں پیاس بجھانے کے لئے اپنے اندر سے جوئے خوں نکالتا ہے۔ غم کی صورتحال اسے توڑتی نہیں اور نہ ہی نا امید کرتی ہے۔ کیونکہ وہ اندھیرے میں اپنے خون کی مشعل جلا کر روشنی کرتا ہے۔

اختر شمار کا پہلا شعری مجموعہ بتاتا ہے کہ روایت اس کے نزدیک بہت اہم ہے تاہم اس روایت میں سے وہ اپنے لیے اظہار کی نئی صورتیں تراشتا ہے، جس میں قطعی طور پر اس کی انفرادیت ثابت ہوتی ہے۔ اختر شمار کا یہ پہلا شعری مجموعہ انسان کی فطرت سے دوری کے نتیجے میں پیدا ہونے والے غموں اور دکھوں کی کہانی ہے۔ اس کے مجموعے کے تقریباً تمام اشعار ایک فلسفیانہ شعور کے حامل ہیں۔ جن میں حکمت اور دانائی، محبت اور دکھ تخلیقی بنجر پن کا ماتم اور گھٹن زدہ معاشرے کی داستان رقم ہے۔ اختر شمار کی شاعری کے یہ تمام موضوعات ایک گہری فکر اور بصیرت سے جڑے ہوئے ہیں۔ دہلیز پر آنکھیں سجائے اختر شمار کسی خیر کی گھڑی کا منتظر ہے۔ کسی ایسی گھڑی کا کہ جس میں محبت کا آغاز ہو جائے! اور پھر اسی دہلیز سے کہ جس پر اس نے اپنی آنکھیں سجا رکھی تھیں، اور جس پر وہ کسی ایسی گھڑی کا منتظر تھا کہ جب کوئی معجزہ ہو جائے، اس نے شاعری کی دوسری دہلیز پر قدم رکھا اور آواز لگائی! ''یہ آغاز محبت ہے''

اختر شمار کے اس دوسرے شعری مجموعے میں محبت کا استعارہ ایک پھیلے ہوئے مفہوم میں ظاہر ہوا ہے۔ یہ محبت ایک سیراب زندگی کی خواہش سے بھی ہے اور ان اقتدار و روایات سے بھی جو انسانیت کے معنی منکشف کرتی ہیں۔ یہ محبت ایک فرد کے ظاہر سے بھی ہے اور باطن سے بھی۔ یہ خواب اس بیداری کے بھی ہیں جو زندگی کو متحرک رکھتے ہیں۔ یہ خواب اس جبر سے نجات کے بھی ہیں جو غیر تخلیقی اور طاغوتی قوتیں مسلط کرتی ہیں۔ یہ خواب اس مقتل گاہ کے بھی ہیں جہاں سچا لہو بولتا ہے، جہاں کلمہ حق کی بازگشت سر کٹانے کے بعد بھی سنی جاتی ہے۔ یہی محبت کے مختلف رنگ ایک حصار بن کر اختر شمار کے گرد ہیں۔ مگر بے بسی اور محرومی ابھی اس کے مقدر میں ہے۔ اختر شمار محبت کے ایک کنارے پر کھڑا دوسرے کنارے سے ملنے کا متمنی ہے، مگر یہ فاصلہ موت کے پُل ہی سے عبور ہو

سکتا ہے۔اسے تو بس محبت کا ایک پل عزیز ہے جسے وہ زندگی کی طرح گزارنا چاہتا ہے مگر یہی ایک پل اس کے بس میں نہیں ہے۔سو ایسے میں اس کے دل کی ویران گلی میں کوئی اجنبی کی طرح بھی آجائے تو اس کے دل کی دھڑکنیں رقص کرنے لگتی ہیں۔تب کہیں جا کر دھیان کے سارے در اس پر کھلتے ہیں۔

اختر شمار اپنے دوسرے شعری مجموعے میں اپنی دھرتی سے محبت کے رشتے میں بھی بندھا ہوا ہے۔دھرتی سے محبت کا ایک پہلو اور ایک رُخ یہ بھی ہے کہ سبز رنگ زمین کو لہو رنگ کرنے والوں کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی جائے۔سو اختر شمار نے جبر اور استحصال کے خلاف بڑے بے باکانہ انداز میں آواز اٹھائی ہے اور اس وقت جب ہمارے بہت سے دانشور ادیب اور شاعر منقارِ زیر پر کئے ہوئے تھے۔جب زبان بندی کو ہی تقدیر سمجھ لیا گیا اور منافقت و مصلحت کے لبادے اوڑھ لئے گئے،اختر شمار نے ایک سچے تخلیق کار کا فریضہ انجام دیا اور اس طرح لب کشائی کی۔

تباہ کر کے رہے گا تمہار ا ظلم تمہیں
تمہیں بھی خون یہ مہنگا پڑے گا

شمار اٹھانی پڑے گی ہمیں کلاشنکوف
اور اپنا سر بھی اٹھانا پڑے گا آخر کار

یہ دار چوم کے مسکا رہا ہے کون ادھر
گزر رہا ہے تمہارے یہ امتحان سے کون

اس نوع کے بہت سے اشعار آپ کو اس مجموعے میں ملیں گے جو اس بات کی غمازی کرتے ہیں کہ اختر شمار کے شعروں میں اپنے عصر کا شعور پوری طرح جلوہ گر ہے۔ایسے اشعار میں اختر شمار کی لفظیات اور پیرایہ اظہار تھوڑا بہت علامتی تو ہے مگر مبہم نہیں ہے۔محبت کا یہ عجیب و غریب انداز اور آغاز جب اختر شمار کے شعری سفر ''جیون تیرے نام'' تک پہنچتا ہے تو اس کے باہر بکھری ہوئی زندگی اس کے داخلی تجربات اور واردات سے ہم آہنگ ہوتی ہے۔لخت لخت اختر شمار اب یکجائی کے سفر پر ہے۔اسے اپنی عمر رفتہ کی کل پونجی پر مان ہے۔یہ کل پونجی جو اس کی جان ہے وہ ہتھیلی پر لیے پھرتا ہے،اب وہ اپنی آنکھوں اور مٹھی میں یقین سجائے ہوئے ہے۔اب اسے لمحوں کے لباس نے صدیوں پر محیط کر دیا ہے۔اب اس نے اپنے اندر پناہ لے لی ہے کہ یہی ایک محفوظ حویلی ہے۔اس کے اندر ایک گہری چپ ہے،جیسے بصارت بصیرت میں تبدیل ہو گئی ہو۔

آنکھیں دیکھتی رہتی ہیں
ہم دونوں میں حائل چپ
لمحوں کا لباس کیا ملا تھا
صدیوں پہ محیط ہو رہے تھے

داخلیت کا سفر یقین کا سفر بھی ہے اور تشکیک و تردید کا بھی۔اختر شمار ان دونوں صورتحال سے نبرد آزما ہے۔اس کے ہاں ایسے اشعار اسی صورتحال کی غمازی کرتے ہیں۔

تو میرے سامنے سے ہٹ گیا تو
اگر اس ہجر میں دل پھٹ گیا تو
کسے آنکھوں میں رکھے گا تو اس پل
ترے منظر سے کوئی ہٹ گیا تو

محبت علم کا ماتھا ہے اس پر
دمکتا سا ستارہ ہے زمانہ

تشکیک و تردید کے اس سفر پر اس کے ہاں جو استفہامیہ لہجے ترتیب پاتے ہیں ان کی اہمیت اپنی جگہ۔مگر حیرت زا بات یہ ہے کہ اختر شمار شک سے یقین کی طرف سفر کرتا ہے۔کیونکہ جو یقین شک کو اپنے اندر جذب نہیں کرتا وہ یقین نہیں بلکہ ذہن کی مردنی ہے۔یہ شعر دیکھئے۔

سمجھ خود کو ضرور آؤں گا اختر
اگر اپنے مقابل ڈٹ گیا تو

اختر شمار کا یہ تیسرا مجموعہ کلام خاموشی کے پردے میں ایک گونج ہے۔چپ کے باطن میں چھپی ہوئی ایک آواز ہے۔خود سے ایک مکالمہ ہے،اس کے اندازے کے لیے اس کے تیسرے مجموعے کلام کا بھی مطالعہ کریں اور کچھ مفاہیم آپ خود اخذ کریں مگر میرے لیے اس کے چوتھے کلام ''ہمیں تیری تمنا ہے'' میں شامل اس کا یہ جملہ بہت اہم ہے

''اپنے آپ پر کھلنے کے بعد ایک چپ سی لگ جاتی ہے''

یہ مجموعہ اسی چپ کا ایک توسیعی عمل دکھائی دیتا ہے۔مگر اس کی تمنائیں آرزوئیں کسی گہری فکر کا پتا بھی دیتی ہیں۔اس مجموعے میں شامل حمد کے یہ اشعار بھی دیکھئے۔

دیواروں کو رستہ کر دے
اور رستے کو سیدھا کر دے
اے شفاف طبیعت والے
مجھ کو اپنے جیسا کر دے
اے شاداب رتوں کے مالک
ننگے پیڑ پہ سایہ کر دے

اب اس کے دکھوں اور آنسوؤں کی ریاضت سرکار دو عالم ﷺ کے وسیلے سے ایک ہی چیز طلب کرتی ہے۔

اک لفظ ہی مانگا ہے محبت مرے سائیں
مل جائے کہیں دل کی حکومت مرے سائیں
دے صدقہ ء حیدر میں مجھے علم خزینہ
کھل جائے ہر اک مجھ پہ حقیقت مرے سائیں

اب اختر شمار کی فکر کائنات کے اس محدود دائرے کو توڑتی ہے اسکی نگاہ کی وسعت کے سامنے زمین پر جھکا ہوا آسمان کم دکھائی دیتا ہے۔ چپ کے نتیجے میں پیدا ہونے والی اداسی نے اس کے دل ونگاہ پر عجب حقیقتیں منکشف کی ہیں وہ بڑی مشکل سے خود کو فکر سود وزیاں سے دور لے آیا ہے۔ باہر کی چپ اور اندر کی گونج اسے حیرت کے اس مقام پر لے آئی ہے جہاں گردوپیش میں پھیلی لخت لخت زندگی بے معنی ہوجاتی ہے۔ اس کا مزید آگے جانے کا ارادہ اس کے اندر کے تحرک کا ایک پیش خیمہ ہے۔ ایک سوچنے والا شخص اپنی سوچ کے سفر پر کہاں جانا چاہتا ہے اور کہاں تک چلا جائے گا، اس کا اندازہ خالی ذہن کیسے کر سکتے ہیں۔ وہ جب بکھرا تھا تو کہیں کا بھی نہیں رہا تھا۔ مگر اب وہ سمٹ کر وحدت سے ہمکنار ہوگیا ہے۔ وہ ہجوم جو آغازِ سفر میں اس کے ساتھ تھا جلد ہی اس سے بچھڑ گیا اور وہ اکیلا ہوگیا۔ اختر شمار کے اِس سفر نے اسے ایک حتمی نتیجے پر پہنچادیا ہے، وہ اپنے تازہ اور زیرِ نظر شعری مجموعے ''آپ سا نہیں کوئی'' میں پہلے سے زیادہ اعتماد اور یقین کے ساتھ اپنی بات کہنے پر قادر ہے۔ محبت کے مراحل سے گزرتے گزرتے اس کی پلکوں پر ٹھہرنے والے آنسو ستارے بن گئے ہیں۔

ابھی تسخیر کر سکتا ہوں تجھ کو
ابھی مٹھی میں اک لمحہ پڑا ہے
ریاضت میں نے کی ہے تشنگی کی
مرے قدموں میں اب دریا پڑا ہے
میں اس کے خواب سے جانے لگا ہوں
وہ کتنا مطمئن سویا پڑا ہے

اسی ریاضت نے اسے جس بلندی پر کھڑا کر دیا ہے۔ یار لوگ شاید اسے اختر شمار کی انانیت سے تعبیر کریں۔

اب اتنی بھی نہیں آسان میری ہم سری ،سن لو
جہاں میں ہوں وہاں پانی بھی میرے سر تک آتا ہے
کیا کہوں تجھ کو اے سمٹی ہوئی پایاب ندی
تو مجھے چھو کے گزرتی تو سمندر ہوتی

اختر شمار کا یہ تازہ شعری مجموعہ کسی روحانی واردات کا نتیجہ معلوم ہوتا ہے۔ اس سے پہلے کے شعری سفر میں وہ اجتماعیت کی طرف گامزن تھا۔ مگر عرفانِ ذات اور عرفانِ حقیقت کے تصور نے اسے فردیت سے ہمکنار کر دیا ہے اور وہ ایک اکائی میں ڈھل گیا ہے۔ اب وہ سرائے وقت میں خود کو ایک مہمان تصور کرتا ہے۔

میں سرائے وقت میں مہمان ہوں
گردشوں کے ساتھ ٹھہرایا ہوا
کس جگہ رکنا ہے مجھ کو کیا خبر
میں کہ چوٹی سے ہوں سرکایا ہوا
عشق میں تو میں سرخرو ٹھہرا
اب مجھے زندگی سے خطرہ ہے

یوں محسوس ہوتا ہے کہ اختر شمار نے اپنی ذات کو پناہ گاہ بنالیا ہے۔ چنانچہ اس مجموعے میں اختر شمار کی مراجعت ذات اور فطرت کی طرف زیادہ ہے۔ شاید یہی ایک عرفان کی صورت ہے۔

آؤ ہوا کی انگلی تھامیں اس تک جائیں
خوشبو کا بھی کوئی دوارا ہو سکتا ہے

اختر شمار کے اِس تازہ شعری مجموعے کو آپ اس کے دل پر گزرنے والی وارداتوں کا ایک مجموعہ کہہ سکتے ہیں۔ سفر کی ساری صعوبتیں، محبتوں کے سارے دکھ، یادوں کے عذاب اور رت جگوں کے حساب، زندگی کے جبر، جن سے وہ برسرِ پیکار رہا، اس ایک مجموعے میں یکجا ہوگئے ہیں۔ حقیقت کے عرفان نے اسے جس نوع کی داخلیت سے اب ہمکنار کر دیا ہے وہاں دنیا اور دنیا کے لوازمات بہت پیچھے رہ گئے ہیں۔

اب اختر شمار نگاہوں کے راستے سوئے عرش جاتے ہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ اختر شمار کے خیال کی کونجیں کس نئے ساحل پر اترتی ہیں۔

بقیہ :خوش بختی کا ستارہ

جب حکومت پاکستان نے اسے سات سمندر پار مصر بھیجنے کی نوید سنائی تو حُسن اور تہذیب کو دیکھنے کی متلاشی اس کی آنکھیں چمک اُٹھیں مگر جب وہ لوٹا تو اس حوالے سے مایوس تھا کہ ڈیڑھ برس کے دوران اس کا سامنا کسی زلیخا سے نہیں ہوا۔ ورنہ شاید اس کا سراپا بھی حُسنِ یوسف میں ڈھل جاتا اور ہمیں کوئی نئی کہانی سننے کو ملتی مگر یہاں یوسف اور موسیٰ کی بجائے بار بار فرعون سے اس کی ملاقات ہوتی رہی۔ وہ فرعون جو عبرت کے دریا میں ڈوب کر غرق ہو چکا ہے۔ وہاں آج بھی زندہ ہے لیکن اختر شمار کو وطن کی یادوں اور یاروں دوستوں کی جدائی نے اور نکھار دیا ہے کیونکہ ہجر بھی انسان کو بہت کچھ عطا کرتا ہے۔ وہ اپنی ذات میں ڈوب کر اپنی ہستی کا سراغ لگانے کی کوشش کرتا ہے اور دوسروں کی اہمیت بھی اس پر خوب واضح ہوتی ہے۔

شعور کی دنیا میں قدم رکھتے ہی اس نے اپنی شاعرانہ صلاحیتوں کا تو کھوج لگا لیا تھا مگر اپنے اندر چھپے کہانی کار کو تلاشنے میں اسے بہت دیر لگی شاید اس لئے کہ پہلے وہ شاعری میں ہی کہانیاں سنا کر مطمئن ہوجاتا تھا۔ اس نے باقاعدہ کہانی لکھی بھی تو کیسی جس میں ایک طویل نظم کا سارا مواد موجود ہے۔ مکالماتی فضا ہے۔ ڈرامہ ہے۔ شعریت ہے۔ اختر شمار کی کہانی ادب کی کوئی نئی صنف ہے جس کا نام ابھی تجویز نہیں کیا گیا۔ بہت سال پہلے اعظم خان نے اختر شمار بن کر عظمت کی طرف سفرِ زیست شروع کیا تھا آج وہ خود ستارا بن چکا ہے اور اب وہ ادب کا اعظم خان بننے جارہا ہے۔

''عہدِ شباب میں پیری''

ڈاکٹر نجیب جمال
(لاہور)

اختر شمار کی شاعری پر کسی بھی نوعیت کی گفتگو سے پہلے یہ جاننا ضروری ہے کہ وہ خود شاعری کو کارِ درویشی جانتا ہے اور اسے توفیق اور نصیب کا معاملہ سمجھتا ہے۔ اس کے ہائیکو کے مجموعے بہ عنوان ''روشنی کے پھول'' سے تادمِ تحریر شعری مجموعے ''عاجزانہ'' کی اشاعت تک، ارتقا کی جو منازل نظر آتی ہیں اس پر ''روشنی کے پھول'' کی ایک ہائیکو اور عاجزانہ کی غزل کے ایک شعر سے کچھ روشنی پڑتی ہے۔ دیکھیے:

رات کے پچھلے پہر چپکے سے
ایک تصویر مجھ سے کہتی ہے
اب تو اختر شمار سو جاؤ
(روشنی کے پھول)

شاہی بھی سامنے تھی مقدر کی راہ پر
اختر شمار ہم نے فقیری پسند کی

گویا ایک عرصے کے بعد بھی اختر شمار اپنے آپ سے مکالمہ کرتا دکھائی دیتا ہے۔ تاہم اس کا اوّلین رومانی طرزِ احساس اب درویشی اور فقیری کی جانب مائل ہے۔ مذکورہ بالا دونوں شعری مجموعوں کے درمیانی فاصلے میں اختر شمار کے دیگر شعری مجموعے ''کسی کی آنکھ ہوئے ہم''، ''یہ آغازِ محبت ہے''، ''جیون تیرے نام''، ''ہمیں تیری تمنا ہے''، ''آپ سا نہیں کوئی'' اور ''دھیان'' بھی شائع ہوئے جو سب کے سب ماسوائے ''دھیان'' کے اپنے عنوانات ہی سے محبت کے ترانے کو گنگناتے نظر آتے ہیں گویا بقول آتش، ''لیلیٰ کے ہوئے مجنوں ہم دیکھ کے محمل کو'' تاہم شعری مجموعہ ''دھیان'' کے عنوان اور شاعری سے گریز کا خیال آتا ہے:

کمرے میں پاس ہے مری تنہائیوں کے ساتھ
کچا گھڑا اور ایک چٹائی پڑی ہوئی
کیا کہوں تجھ کو اے سمٹی ہوئی پایاب ندی
تو مجھے چھو کے گزرتی تو سمندر ہوتی
جہاں پڑے تھے سرہانے تمہارے خواب بندھے
وہیں تو تھے کسی گٹھڑی میں ہم جناب بندھے
میں ایک نقطے میں سمٹا شمار آخرِ کار
یہ کیا مقام ہے جس پر کہ دائرہ ٹھہرا
(دھیان)

''دھیان'' کے بعد شعری مجموعہ ''عاجزانہ'' مکمل تقلیب کا حوالہ بن کر نمودار ہوتا ہے۔ اختر شمار کا یہ شعر ایک عمر کی وارفتگی کو زبان ملنے کا اشارہ ہے:

مبہم علامتوں میں مری عمر کٹ گئی
اب آ کے اس لغت کا کنایہ ہُوا ہوں میں

اپنے شعری کلیات ''اختر شماریاں'' میں تو درج ذیل اشعار کو خود اختر شمار نے سرنامے کے طور پر منتخب کیا ہے:

عہدِ شباب میں جو یہ پیری پسند کی
آزاد رہ کے ہم نے اسیری پسند کی
شاہی بھی سامنے تھی مقدر کی راہ پر
اختر شمار ہم نے فقیری پسند کی

اب سوال یہ کہ کیا شاعری کا کوئی تعلق روحانی لاشعور سے بھی رہا ہے؟ اس میں تو کوئی شبہ نہیں کہ تصوف ہماری اُردو شاعری کے نصاب کا لازمی مضمون رہا ہے۔ تصوف کی کم سے کم لفظوں میں تعریف کچھ یوں کی جاسکتی ہے کہ یہ کائنات در اصل ''کن فیکون'' یا پھر ہست و بود کا معاملہ ہے اور یہ ہر حال میں وجودِ حقیقی، وجودِ مطلق اور وجودِ واجب ہی کی جلوہ گری ہے:

نظر میرے دل کی پڑی دردؔ کس پر
جدھر دیکھتا ہوں وہی روبرو ہے
(خواجہ میر دردؔ)

مجھے ہی گوندھ کے اس نے ہر ایک ذرّے میں
یہ کائنات مرے روبرو بنائی ہے
(اختر شمار)

کائنات کو اسی کلیتِ حق کے جزوِ ترکیبی کا درجہ حاصل ہے۔ اسی سے وحدت الوجود کے تصور نے جنم لیا جسے اب اُردو شاعری میں ایک فکر، ایک تصور، ایک عقیدے اور ایک نظریے کی سی حیثیت حاصل ہے۔ وحدت الوجود کی ایک تشریح یوں بھی کی جاتی ہے کہ ماسوائے اللہ، سب کو بھول جانا، اپنے آپ کو بھی بھول جانا اور پھر اس بھول جانے کو بھی بھول جانا۔

تصوف یا کارِ درویشی ایک طرح کا ''عاشقی صبر طلب اور تمنائے بے تاب'' جیسا معاملہ ہے۔ حسن کی جستجو میں عاشق کو دشت و صحرا کی خاک تو چھاننا ہی پڑتی ہے مگر اس سے بھی دشوار مرحلہ خود اپنے اندر اُتر کر ذات کی گہری باؤلی میں ڈول ڈال کر سانس کو نکالنا ہوتا ہے۔ اپنی تلاش میں نکلنا پڑتا ہے اور خود اپنی آگ میں جل کر کیمیا بننا ہوتا ہے۔ گویا خود شعوری، خود شناسی اور خود نگری ایک ایسا اخلاقی شعور ہے جس کے ذریعے نفس کے بے لگام رخش کو قابو کیا جاسکتا ہے اور برتر انسانی اقدار کا شعور حاصل ہوسکتا ہے۔ اعلیٰ ترین انسانی قدر یہ ہے کہ انسانوں کے درمیان جس قدر ہو سکے محبت کو عام کیا جائے اور محبت کے جذبے کو تہذیبی شائستگی اور اخلاقی تربیت کے طور پر کام میں لایا جائے۔ اختر شمار کی شاعری کا سفر تو جذباتی

وارفتگی اور عشق کی سرشاری جیسی واردات ہی سے شروع ہوا:

یا اپنے پاؤں پر مجھے گرنے سے روک دے
یا میری لغزشوں کو عبادت شمار کر
(کسی کی آنکھ ہوئے ہم)

پھر رفتہ رفتہ اس کے یہاں ایک عام آدمی کا سماجی شعور نمایاں ہوا جس کی زندگی میں سرشاری کے لمحے کم سے کم اور محرومیاں، ناکامیاں، نامرادیاں، اور نارسائیاں زیادہ سے زیادہ تر ہوتی جاتی ہیں اور اسے ہر قدم پر ایک نیا حوصلہ شکن معاملہ درپیش رہتا ہے:

کچھ اور مصائب نے کیا مجھ کو ہراساں
یہ عشق فقط کب دلِ بیمار کا دُکھ ہے

☆

دو کنارے ہیں یہاں کچھ نہیں اپنے بس میں
موت کا پُل ہی ملائے گا ہمیں آپس میں

☆

میں اس کے خواب سے جانے لگا ہوں
وہ کتنا مطمئن سویا پڑا ہے

☆

خوش بو، رنگ، ہَوا اور چاند ستاروں سے
ایک اک کر کے سارے رشتے ٹوٹ گئے

اور پھر آخر آخر اختر شمار کے یہاں صوفیانہ فکر کے کچھ زاویے نمایاں ہونے لگتے ہیں۔ ہم نے کچھ پہلے جو روحانی لاشعور کا سوال اُٹھایا تھا اس حوالے سے دیکھا جائے تو روح کے لوازموں، جیسے حسی ادارک، جذبہ، احساس، تخیل، عقل مجرد، مابعد الطبیعاتی شعور، ماورائے احساس ادارک اور یا پھر انسان کے تمام تر تخلیقی اثاثوں یعنی احساس، تخیل، عقل، عشق، خواہش (جسے بقول غالب احمقوں نے پرستش قرار دے رکھا ہے) یا جبلت کا شاعری کے ظہور سے ہمیشہ کوئی نہ کوئی علاقہ رہا ہے۔ اختر شمار کی شاعری کے کسی بھی طرح کے تجزیے سے پہلے ان سوالوں کو ذہن میں رکھنا شاید بنیادی ضرورت شمار ہوگا کہ اُس کی تخلیقی شخصیت Creative Personality کی تشکیل میں متصوفانہ واردات کی کارفرمائی دِکھائی دیتی ہے۔

یوں تو اُردو شاعری کی تخلیقی بنیاد میں صوفیانہ فکر کی طرف میلان ہمیشہ سے رہا ہے، غالب نے اسی کو مشاہدۂ حق کی گفتگو قرار دیا تھا۔ گویا تصوف کی ایک طویل روایت اُردو شاعری کے متوازی چلی آتی ہے۔ اس روایت کو دہرانے کا یہاں موقع نہیں، تاہم یہ امر واقعہ ہے کہ عشقیہ واردات کا ایک سرا مجاز تو دوسرا حقیقت سے جڑا ہوا ہے۔ یہ ایک طرح سے تلاش کا وہ عمل ہے جو دنیا بھر کے قصوں میں، اساطیر، منطق الطیر میں، جاتک کہانیوں میں، الف لیلیٰ سے لے کر تمام عشقیہ داستانوں میں پھیلا ہوا ہے۔ اُردو شاعری میں یہ تلاش کا عمل پوری قوت سے اُردو غزل میں موجود رہا ہے اور اختر شمار کی غزل بھی اسی روایت سے جڑی ہوئی ہے۔

یہ عجیب اتفاق ہے کہ اُردو شاعری میں تصوف کا سلسلہ زمینی مزاج سے علاقہ رکھتا ہے اور غالباً اس کی بڑی وجہ اسلام کی آمد سے قبل ہندوستان کی سرزمین میں پیدا ہونے والے مذاہب میں مقامی رواجوں Customs کا عمل دخل، پُر اسراریت اور باطنیت کی طرف فطری رجحان تھا جس کا متصوفانہ مزاج کی تشکیل میں بڑا حصہ رہا۔ پھر اسلام کے آنے کے بعد مسلم صوفیا کی فکر نے اسے صفا سے جوڑ دیا جس کا اوّلین مفہوم درویشی کا پیراہن تھا اور جس کے نزدیک شاہانہ جاہ وجلال اور لباسِ فاخرانہ دونوں ہیچ ہیں۔ اختر شمار کا یہ شعر اس تناظر میں دیکھیں:

شاہی بھی سامنے تھی مقدر کی راہ پر
اختر شمار ہم نے فقیری پسند کی

مسلم صوفیا کی فکر میں تصوف سے مراد انسان دوستی، حسنِ عمل اور احسان قرار پائے، یہ کہنا تو سراسر نامناسب ہوگا کہ تصوف اسلام کا مذہبی فلسفہ ہے تاہم یہ بھی حقیقت ہے کہ اُردو شاعری میں تصوف کی جو روایت نظر آتی ہے اس میں فرد کے خدا کے ساتھ تعلق کا وہی تصور کارفرما ہے جسے ہم نے سطورِ بالا میں ''وحدت الوجود'' کا نام دے کر شرح کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس راہ میں فرد نے یہ سوال بھی اُٹھائے رکھا کہ میں کون ہوں اے ہم نفساں؟ (میر) کیہ جانا میں کون؟ (بلھے شاہ) نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا؟ (غالب) سبزہ وگل کہاں سے آئے ہیں؟ (غالب)۔ اختر شمار نے بھی اپنے آپ کو اس روایت سے الگ نہیں کیا۔ البتہ اس نے درویشوں کے تکیوں سے جو کچھ حاصل کیا اس کو بھی اپنا شعری تجربہ بنانے کی کوشش کی اور وحدت الوجود کی فکری پہنائیوں سے زیادہ دلچسپی نہیں لی۔ اس کے صوفیانہ اور مذہبی شعور میں کچھ زیادہ بُعد نہیں ہے، جس کا اظہار حمد، نعت، مناجات، منقبت اور سلام کی شکل میں ہوا ہے:

دیواروں کو رستہ کر دے
اور رستے کو سیدھا کر دے

☆

ہم نہیں جانتے ہوتی ہے عبادت کیا چیز
ہم تو ہر سانس میں اک نام لیا کرتے ہیں

☆

دل نے کیا سوال کہ کیسے اسے ملوں
آواز آئی دید کا اک راستہ نماز
تیرے سوا کسی کو نہ دیکھا تمام عمر
آنکھیں امام کر کے میں پڑھتا رہا نماز

☆

دل سے نکال جتنے بھی وہم گمان ہیں
اس راہ میں یقین ہی پہلا قیام ہے

تصوف کی دنیا بہ ظاہر تو مکاشفات کی دنیا ہے جس میں تسخیرِ کائنات کی مہم درپیش ہوتی ہے اور جس میں عشق کو من و تو جیسی متکبر قوتوں سے نبرد آزما ہو کر بالآخران پر غالب ہونا ہوتا ہے اور وہاں تک پہنچنا ہوتا ہے جہاں وحدت کا نور ظہور ہو۔عشق کی نسبت سے نفس کی منہ زوری پر قابو پانے کا یہ ایک اہم ذریعہ بھی ہے اور وصلِ محبوبِ حقیقی کا وسیلہ بھی ۔شاعری میں یہ مرحلہ ماورائے حواس ،ادراک کی وساطت سے طے ہوتا ہے۔یہاں یہ بات بھی اہم ہے کہ شاعری میں تصوف جیسے باطنی تجربے کی تکمیل تخیل کی بنیاد پر ہوتی ہے جو بنیادی طور پر ایک رومانی کیفیت ہے۔جس میں عقل، منطق اور شعور سے زیادہ حسیت، تخیل اور لاشعور جیسے عوامل کار فرما ہوتے ہیں۔تاہم اس کا بنیادی رکن حسنِ خیال ہے جو اعلیٰ درجے کے ادب کی بھی بنیاد ہے۔تخیل کے محرکات میں جذبات، محسوسات اور ادراک وسیلہ بنتے ہیں یوں ماورائے حواس اور عقلی ادارک کے درمیان توازن کی صورت پیدا ہوتی ہے۔اس سے یہ ہوا کہ شاعری تمام تر عقل کی گرفت سے آزاد ہوگئی اور اس کا تعلق اس پُر اسرار شے سے قائم ہوا جو انسانوں کے مابین تعینات کے حائل پردوں کو اُٹھا کر انہیں وجود کی وحدت کا پتا دیتی ہے۔اختر شمار کی شاعری میں وحدت الوجود اور وحدت الشہود جیسے فکری و باطنی مباحث یا تصوف کی اصطلاحوں اور لفظیات سے زیادہ حسیت، تخیل، ادراک اور شعور کی سطح پر باطنی واردات کی نوعیت کو بیان کرنے کی کوشش ملتی ہے۔کانٹ نے انسانی ادراک کے تین پہلوؤں حسیت ، Sensitivity, تخیل Imagination، اور فہم Understanding، کے حوالے سے بحث کرتے ہوئے بتایا تھا کہ یہ حسیت ہے جو ہمیں زمان و مکاں کا پتا دیتی ہے اور ہم رنگوں، آوازوں اور اسی قسم کی صفات اشیا کو زمان و مکان میں اپنے تخیل اور فہم کے ذریعے باہم مربوط دیکھتے ہیں۔اسی لیے بعض صورتوں میں سامنے کے مظاہر سے سوا کچھ نئی صفات تخلیق ہو جاتی ہیں۔جن کا فوری طور پر نفس کو احساس بھی نہیں ہو پاتا مگر وہ کسی ماورائی احساس کی طرح تجربے کا حصہ بن جاتی ہیں۔اسلم انصاری کا یہ شعر اس کیفیت کو نمایاں کرتا ہے:

بہت دن تک میں حیراں ہوں مجھے اس بات کا احساس بھی ہونے نہیں پایا
کہ محوِ گفتگو رہنے لگے ہیں چاند راتوں میں ترا سایا، مرا سایا

اختر شمار کی بھی یہی خوبی ہے کہ وہ کبھی تخیل کی مدد سے، کبھی صوتی زیر و بم، کبھی الفاظ کے دروبست سے، کبھی جذباتی فضا کی تعمیر سے اور کبھی تمثیل و تمثال سے انسانی تجربوں کو اِکائی کی صورت بیان کر دیتا ہے۔اسی سے اس کی شاعری میں وہ خصوصیت پیدا ہوتی ہے جس سے دوسری، تیسری خواندگی کے بعد الفاظ کے معنی میں طرفگی جنم لیتی ہے۔گویا اس کے اشعار کا متن ایک خود مختار اِکائی کے بجائے مکرر مطالعے کی صورت میں الفاظ کے معنی میں مختلف تأثر کا حامل دِکھائی دینے لگتا ہے۔دراصل زبان کے جملہ عناصر ایک دوسرے سے پیوست ہوتے ہیں جو معنی کے تسلسل کا حوالہ بنتے ہیں اور آزاد کلامیہ کی صورت نہ صرف مصنف کے جبر سے رہا ہو جاتے ہیں بلکہ یہ زندگی کی مختلف اطراف کا پتا دیتے ہیں۔آج کی مابعد جدید صورتِ حال میں عمدہ متن وہی سمجھا جاتا ہے جس میں کچھ اور متون بھی کارفرما ہوں اور جو کچھ دیگر آوازوں کو بھی جنم دے اور یوں قاری متن کی دیگر اطراف سے بہرہ مند ہو کر مختلف معنی تک رسائی حاصل کر سکے۔اُردو غزل کی ہیئت میں حسنِ خیال کے تسلسل کے ساتھ منتخب زمینوں، لفظیات، تراکیب اور علامات کی وجہ سے اس کی گنجائش زیادہ ہے۔اب یہ شاعر پر منحصر ہے کہ وہ کس طرح اور کس درجہ نئے امکانات کو واضح تر کر سکتا ہے۔اختر شمار کے شعری تجربے میں جا بہ جا معنی کی وحدت کے مقابل، نیا خیال، نئے معنی اور نئے ادراکات کی صورتیں نظر آتی ہیں:

اس کے نزدیک غمِ ترکِ وفا کچھ بھی نہیں
مطمئن ایسا ہے وہ جیسے ہُوا کچھ بھی نہیں
کل بچھڑنا ہے تو پھر عہدِ وفا سوچ کے باندھ
ابھی آغازِ محبت ہے، گیا کچھ بھی نہیں

☆

لے کے آنکھوں میں شفق، دید کی تیاری کی
ہم نے بھی شام کے میلے سے خریداری کی

☆

دل سے پچھلی شب یہی آواز آتی ہے مجھے
دیدہ گریاں ابھی اختر شمار اور ہے

☆

میں کھٹکتا تھا جانے کس کس کو
جانے کس کس کو سازگار تھا میں

☆

آخری وقت میں یہ بھید کھلا ہے ہم پر
ہم کسی نقلِ مکانی کے لیے زندہ ہیں

☆

ہمارے شہر میں اب دن ڈھلا نہیں کرتا
ہمارے شہر میں اب رات بھی نہیں آتی

اختر شمار کی شاعری کی پہلی خواندگی میں اس کا زندگی کے بارے میں رویہ ،چلن اور برتاؤ ایک عام آدمی کا سا ہے جس کے یہاں شادکامی، بامرادی، اور بہجت و سرشاری کے لمحے گریز پا نظر آتے ہیں۔ہر قدم، ہر موڑ ہر ایک نئی محرومی ،ناکامی اور نارسائی جس کا ازلی مقدر ہے، تاہم اختر شمار اپنی اَنائے تخلیقی، جو اس کی شخصیت کا بھی خاصہ ہے، کے باعث اور اپنے پُر آواز لہجے کی گونج سے اپنی اور اپنی جیسی کئی اَناؤں کی تسکین کرتا نظر آتا ہے۔اس کی اَنائے تخلیقی، اَنائے خود مرکز سے فاصلہ رکھنے کے جتن کرتی ہے، اس میں کبھی وہ ناکام بھی رہتا ہے ۔اپنی

انفرادیت اور اپنی خودی کو محدود نہ کرنے کی قیمت پر اس ناکامی کو قبول کرتا ہے مگر اس کا مداوا وہ محبت کے ذریعے دوسرے لوگوں کے ساتھ تعلق قائم کرنے میں تلاش کرتا ہے۔ کبھی کبھی وہ خود مرکزِ اَنا میں گم ہو کر ''میں'' کے صیغے میں بات ضرور کرتا ہے لیکن ایک بالکل مختلف انداز میں کہ اس کی شاعری کا ''میں'' اس کی بھرپور داخلی شخصیت ہے جو اپنا اظہار چاہتی ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں وہ ایک صوفی کی داخلیت سے قریب تر ہو جاتا ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ اس کی خودنمائی بھی احترامِ انساں، احترامِ محبوب اور احترامِ کائنات کی خاطر ہو، جس کا اوّل و آخر مقصد خود پرستی نہیں بلکہ عرفانِ خودی ہوتا ہے اور یہ ایک ایسے فرد کا رویہ ہے جو اپنی ذات کے سارے بھیدوں سے اور سارے استعاروں سے آشنا ہو اور ایک طویل ریاضت کے بعد جس نے شعورِ نفس کی منزل کو پالیا ہو:

میں اس کو دیکھنے جاتا ہوں اکثر چاند راتوں میں
مجھے ملنے کبھی دریا بھی میرے گھر تک آتا ہے

☆

خیالِ یار تجھے لوٹنا ہے دل کی طرف
کہ اپنے آپ کو جاتا ہے ہر شجر واپس

☆

میں جلد آنے والا ہوں سب کی زبان پر
فی الحال تو دلوں سے بھلایا ہُوا ہوں میں

شاعری دوسرے تمام فنونِ لطیفہ کی طرح ایک فن ہے، تاہم اس میں دو باتیں بڑی بنیادی حیثیت رکھتی ہیں۔ ایک تو شاعری کا مواد اور دوسرے اس مواد کو پیش کرنے والی ہیت۔ شاعری حسنِ بیان کی طرف بھی خصوصی رغبت رکھتی ہے جو اس کی تیسری خصوصیت شمار ہوتی ہے اور یہ خصوصیت جذبوں، محسوسات، تمثالوں، استعاروں، کنایوں اور خاص کر کے آوازوں کی ایسی ہم آہنگی سے پیدا ہوتی ہے جو نہایت دھیمے لہجے میں بھی گونج پیدا کر سکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اچھی شاعری کی داد یا تو با آواز بلند واہ واہ کے ڈونگرے برسا کر دی جاتی ہے یا پھر سکوتِ مجلس میں لفظوں کی بازگشت (Echo) سے پیدا ہونے والی گونج دل کی گہرائی میں اُترتی ہے۔ اختر شمار کے شعر کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ منظمِ الفاظ سے تو کبھی تہذیبِ جذبات سے لذتِ ارتباط و امتزاج پیدا کرتا ہے اور مختلف احساسات کے باہمی تعلق کو اس طرح بیان کرتا ہے کہ وہ اپنے قاری یا سامع کے دل میں اپنے تصوراتِ فکر و فن سے ایک مسرت انگیز احساس پیدا کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ شاعر کا کام بھی یہی ہے کہ وہ ہر خوشی دوبالا کرے، ہر سچائی کے حق میں گواہی دے اور ہر غم کو معنی کے گداز سے آشنا کر دے اور یہ فن اختر شمار کو خوب آتا ہے:

بیشتر اہلِ چمن ہم سے خفا رہتے ہیں
ہم نے سبزے کی چمن میں جو طرف داری کی

☆

نایاب ہیں جس وقت سے ہم دھڑکا لگا ہے
سستے میں نہ بِک جائیں گرانی میں کہیں ہم

☆

بند آنکھوں کو نہیں نیند میں ڈوبا کہتے
جاگنے والوں کو بیدار نہ سمجھا جائے
دھیان سے دیکھیے یہ میرے کشادہ بازو
میں کہ دروازہ ہوں دیوار نہ سمجھا جائے

☆

کہا جاتا ہے کہ شاعر کے خواب کسی حقیقت کے مفروضے Hypothesis، ہوتے ہیں یعنی اختراع، خوش بیانی اور جذبہ آفرینی سے کام لے کر وہ حقیقت کو بھی خواب کی صورت بیان کرتا ہے، اس طرح شاعری زندہ جذبوں، زندہ احساسات اور زندہ افعال کی تصویریں بناتی ہے۔ یوں وہ ایک نہایت پُر لطف مگر غیر محسوس طریقے سے انسانی فطرت کی سچائیوں کو نہ صرف بیان کرتی ہے بلکہ ایک بالکل مختلف، نئی بہتر اور کامل دنیا کی تعمیر کی خواہش رکھتی ہے۔ اختر شمار کے یہ شعر خوابوں کی انہی سچی تعبیروں کی وجہ سے رویائے صادقہ کے ذیل میں آتے ہیں:

ہر غنچۂ تعبیر تمنّا بھی کِھلا ہے
مہکا ہُوا موسم ہے مہکتے ہیں ہرے خواب
سلگتی ہیں ہری پوروں کی آنکھوں
اسے چھو کر نہیں دیکھا کئی دن

☆

سب لوگ لیے جاتے تھے تاروں کے خزانے
میں نے مگر اس جھیل سے آنکھوں میں بھرے خواب

☆

تجھے خبر ہی نہیں ہم نے تجھ سے ملنے کو
یہ درمیان سے کیسے سفر نکالا ہے

☆

مشروط مرا ہونا ہے ہر خواب سے باہر
ہر حال میں جاگا ہُوا یہ دل ہے تو میں ہوں

☆

نسبت ہے تری مجھ سے کچھ ایسے ہی مرے خواب
رستہ مجھے کہتے ہیں کہ منزل ہے تو میں ہوں

اختر شمار کی شاعری کا پہلا اور آخری وصف تو نفسیاتِ محبت کی گرہ کشائی ہے یوں اس کی شاعری کا بنیادی وصف تغزل ہے اور وہ اپنی بلند آہنگی جو اس کے اشعار سے زیادہ اس کی خواندگی سے نمایاں ہوتی ہے، کے باوجود تغزل کی روحِ

لطیف سے قریب تر ہے۔تغزل کے عناصر دو ہیں،اس میں احساسات وجذبات کا مرکزی نقطہ حسن کو قرار دیا گیا ہے اور دوسرے اندازِ بیاں میں لطافت، رنگینی ،گھلاوٹ،لوچ،نرمی، لچک،اور ایک طرح کا سوز اس کا لازمی جزو ہے۔اختر شمار مومنؔ کی طرح معاملہ بندی کا شاعر تو ہرگز نہیں ہے کہ وہ کبھی کبھی بغاوت آثار لب ولہجے میں بات کرنے لگتا ہے جو معاملہ بندی اور خود سپردگی کو راس نہیں،تاہم وہ محاکات کا شاعر ضرور ہے اور ذرا فاصلے پر کھڑا تصویریں سی بناتا ہے۔اگر وہ معاملہ بند شاعر ہوتا تو اس کے یہاں بہت قریب آنے،چھونے اور لمس کی لذّت کے قصے ہوتے مگر وہ تجربے سے زیادہ مشاہدے کا شاعر ہے اور احساس محبت کی قابلِ فہم اور قابلِ محسوس تصویریں بناتا ہے۔یہی وجہ کہ ہم اس سے کسی حکیمانہ طرزِ فکر یا فلسفیانہ طرزِ ادا کا مطالبہ بھی نہیں کرتے۔اگرچہ درویشوں سے صحبت کی وجہ سے اس کی طبیعت اُدھر مائل ضرور ہے جس کا اظہار اس کی گفتگو سے تو ہوتا ہے مگر اچھی بات یہ ہے کہ شاعری میں وہ کسی درویش یا گیانی کے وعظ Sermon سے گریز کرتا ہے اور زندگی کو Interpret کرتے ہوئے اسے زیادہ قابلِ قبول اور قابلِ محسوس بنانے کی فکر کرتا ہے۔عموماً دیکھا گیا ہے کہ ایسے میں محاکات کا رنگ (Pictorial Value) پیدا ہو جاتا ہے۔یہ رنگ اختر شمار کے اشعار میں اس وقت اور بھی چوکھا ہو جاتا ہے،جب وہ کہانی کے اس سلسلے کو چھیڑتا ہے جس میں آگ اور پانی ایک دوسرے پر غالب آنے کی اپنی سی کوشش کرتے ہیں:

میں نے جب اس کی ہتھیلی پہ ستارا رکھا
چاند نے بڑھ کے مرے پاؤں پہ ماتھا رکھا

☆

اگر تو پلکیں جھکائے تو آسمان جھکے
نظر اُٹھا کے جو دیکھے تو میں جہاں سے اُٹھوں

☆

یا اپنے پاؤں پر مجھے گرنے سے روک دے
یا میری لغزشوں کو عبادت شمار کر

☆

ہم رہ گئے تھے آنکھ میں آنسو لیے ہوئے
تو جا رہا تھا اور ستارے تھے تیرے ساتھ

☆

آنکھ وہ اپنی حویلی میں کہیں کھولتا ہے
اور سورج مری دیوار پہ آ جاتا ہے

☆

گوئٹے نے حیرت کو فن کی انتہا قرار دیا تھا۔یہ حیرت شاعری میں کبھی بلبلِ تصویر کی آنکھوں سے،کبھی گھڑیوں سے لمحے بنانے سے،کبھی خونِ دل میں انگلیاں ڈبونے سے،کبھی آنسو کو ستارہ بنانے سے،کبھی سینے کو طورِ سینا کرنے سے اور کبھی سیانے کے دیوانہ بننے سے پیدا ہوتی ہے۔شاعری میں وہ قوت ہے جس سے کام لے کر شاعر انسان کی تمام وکمال حیرتوں،بصارتوں اور بصیرتوں کو تصویر کر کے اظہارِ ہنر کرتا ہے۔اختر شمار کا فنِ شعر بھی حیرتوں،حسرتوں،حقیقتوں، لطافتوں اور کثافتوں کا ایک مجموعہ ہے۔حرفِ آخر کے طور پر اس کے یہ شعر دیکھیے:

یہ پلکیں خون میں ڈوبی رہیں شب بھر اسے کہنا
ترے گیسو،تری آنکھیں،ترا چہرہ بنانے میں
سدا دشتِ ہنر میں آزمایا ہے لہو اپنا
کبھی شعلہ،کبھی آنسو،کبھی تارا بنانے میں

☆

- بقیہ -

یہ آغازِ محبت ہے

ایک اور غزل کا شعر:

لفظوں سے مت ہاتھ کیا کر
سیدھی سیدھی بات کیا کر
فعلُن فعلُن فعل فعولُن

ایک اور مثال:

جاگی تیرے خیال پہ آنکھ
مہکی شاخِ وصال پہ آنکھ
فعلُن فعل فعول فعول

صفحہ نمبر ۱۴۳ پر غزل کا ایک شعر یوں درج ہے:

لاش میری جو بگولوں کی جگہ لے لیتی
سر ہی جانا نہ دربار میں دھڑ جانا تھا

یوں لگتا ہے مصرعِ ثانی میں لفظ ''تھا'' کتابت کی غلطی سے رہ گیا ہے۔صحیح شعر یوں ہوگا:

لاش میری بگولوں کی جگہ لے لیتی
سر ہی جانا تھا نہ دربار میں دھڑ جانا تھا

اس شعر کی بحر بھی یہ ہی ہے یعنی فاعلاتن فعلاتن فعلاتن فعلُن۔

کسی غزل کے مطلع میں جو بحر کارفرما ہوتی ہے اسے پوری غزل پر لاگو ہونا چاہیے اس لحاظ سے دیکھا جائے تو ''یہ آغازِ محبت ہے'' کی تمام غزلیں اور نظمیں متوازن ہیں اور اختر شمار کہیں بھی عدم توازن کا شکار نہیں ہوئے ہیں۔

''محبت علم کا ماتھا ہے''

میاں عزیز قریشی
(بہاولپور)

وطنِ عزیز کے ادبی حلقوں اور شعروسخن کی محفلوں میں اختر شمار کا شمار بڑے اور معروف شعراء میں ہوتا ہے۔اُن کی مقبولیت وشہرت کی کئی وجوہات ہیں۔اول یہ کہ ان کے تخلص (اختر شمار) میں فطری سادگی وسلاست کے ساتھ ساتھ ایک طلسماتی کشش، اک شان دِل ربائی اور محبت کرنے والوں کے قلب و جگر کے سوز وشیفتگی کا نور جھلملاتا نظر آتا ہے۔اختر شمار کے اس دولفظی مُرکب میں سادگی ہے، بیساختہ پن ہے۔نزاکت ولطافت کی خوشبو، ''سحری سویرے'' کی سی تازگی وشگفتگی اور ستارۂ صبح کے ماتھے کا حسن لازوال موجود ہے۔اختر شمار کے تخلص میں بے کراں معنوی وسعت ہے اور اس وسعت میں چھپی ہوئی ایسی بے شمار خوبیاں ہیں جن کا ہماری زبان میں کوئی نام نہیں۔نام وتخلص میں صوتی ومعنوی خصائص کا ذکر اپنی جگہ پر خوب ہے مگر صاحبِ تخلص بھی اس بارۂ خاص میں تعریف وتحسین کے کم مستحق نہیں ہیں۔یعنی شاعر نے اپنے لئے دولفظی تخلص کے اختیار و انتخاب میں جس رعنائی فکر و خیال سے کام لیا ہے وہ حد درجہ قابلِ تعریف ہے۔پھر اس تخلص میں اچھوتا پن بھی ہے اور شانِ یکتائی بھی۔شعروسخن کی تاریخ پر نظر ڈالی جائے تو ہمیں اِس نام وتخلص کا ماضی قریب وبعید میں نہ کوئی شاعر دکھائی دیتا ہے اور نہ کوئی ادیب۔اور مزے کی بات یہ ہے کہ آج معاصرین میں بھی اس مرکب تخلص کا حامل کوئی ادیب/شاعر افقِ ادب پر وجود نہیں ہے۔

اختر شمار سے ہٹ کر ایک مثال اور دیکھئے۔یہ مثال مرزا غالب کی ہے یعنی یہ لطفِ یکتائی مرزا غالب کے نام وتخلص میں بھی پایا جاتا ہے ان کا پورا نام مرزا اسداللہ خاں تھا۔ابتداء میں اسد تخلص کرتے تھے مگر جب انھیں یہ معلوم ہوا کہ اردو کے ایک صفِ دوم کہ شاعر بھی یہی تخلص (یعنی اسد) رکھتے ہیں تو انھیں تخلص کی یہ شرکت ایک آنکھ نہ بھائی چنانچہ انھوں نے بڑے سوچ بچار اور تامّل و تفحص کے بعد (اسداللہ الغالب علی ابنِ ابی طالب کو سامنے رکھتے ہوئے) اپنا تخلص اسد سے بدل کر غالب رکھ لیا، البتہ جن غزلوں میں اسد کا تخلص استعمال کیا گیا تھا اسے جوں کا توں رہنے دیا۔مرزا نے اپنی غزلوں میں اسد اور غالب دونوں تخلص استعمال کئے ہیں۔دو ایک شعروں میں تو تخلص کی بجائے پورا نام ہی استعمال کر ڈالا ہے: مثلاً

طرزِ بیدل میں ریختہ لکھنا
اسد اللہ خاں قیامت ہے

یا اُن کا وہ شعر دیکھئے جو بے حد مقبول ومشہور ہے

؎ مارا زمانے نے اسد اللہ خاں تمھیں
وہ ولولے کہاں وہ جوانی کدھر گئی

اختر شمار نے بھی اپنی سہولت اور شعری ضرورت کے مطابق کبھی اختر تخلص اپنایا ہے اور کبھی شمار۔کبھی مرکب تخلص یعنی اختر شمار بھی استعمال کیا گیا ہے۔اختر شمار نے لفظ شمار کے ساتھ اردو زبان میں جو جو الفاظ/مرکبات استعمال ہوئے ہیں ان سب کو بڑے اہتمام اور قرینے سے اپنے اشعار میں برتا ہے۔

اختر کی مثال دیکھئے:

دھرتی بھی فلک سے آج اختر
پیمانِ وفا بدل رہی ہے

شمار کا استعمال:-

بس میں ہوتا بہر حال شمار
سامنے ان کے نہ رویا کرتے

مرکب تخلص کا خوبصورت انداز:

اختر شمار وہ بھی عجب دھوپ شخص ہے
پیڑوں سے لے گیا ہے جو سایہ اتار کر

مرزا غالب کی اختر شماری اور اختر شمار کی اختر شماریاں ملاحظہ کیجئے:

غالب:

کس طرح کاٹے کوئی شب ہائے تارِ برشگال ہے
نظر خو کردۂ اختر شماری ہائے ہائے

اختر شمار:

کتنا عجیب شغل ہے اختر شماریاں آنکھیں
اسیر رہتی ہیں تاروں میں ساری رات

اردو میں ہم، شمار وقطار کے الفاظ بھی ''حیثیت واہمیت'' کے معنوں میں استعمال کرتے ہیں۔اختر شمار نے بھی ان الفاظ کو بڑی خوبی سے اپنے اشعار میں استعمال کیا ہے۔دو ایک مثالیں دیکھئے:

۱: اُس کے نزدیک تھے مگر کیا علم کس قطار وشمار میں تھے ہم
۲: اِک تری سمت دیکھتے جائیں ہم قطار وشمار سے باہر

اختر شمار کا اصل نام یعنی اِسم، اعظم ہے۔نام کے ساتھ محمدؐ خیر و برکت کے واسطے لکھتے ہیں۔ڈاکٹر کے سابقے نے ان کے نام کو اور بھی اعظم اور عظیم بنا دیا ہے۔یہ سابقہ پی ایچ ڈی کی ڈگری کے حصول سے ممکن ہوا ہے۔اب آپ ان کے نام کی تختی پڑھیئے، آپ دیکھیں گے کہ سابقوں اور لاحقوں کے لئے ہیبت وعظمت اور محبت کی کرنیں چھوڑتی ہوئی ایک لکیر دور تک چلی گئی ہے اور آپ کے سامنے عبدالعزیز خالد کے کسی مضمون کی ایک وزنی سی سطر یوں نمایاں ہے:۔ ڈاکٹر محمد اعظم اختر شمار۔ایم۔اے پی ایچ ڈی''اعظم عموماً پہلوانوں، جرنیلوں اور پولیس افسروں کا نام ہوتا ہے۔اپنے نام اور کام کے سبب یہ لوگ بڑے رعب و

دبدبہ والے ہوتے ہیں۔جسم لباس اور مہارتِ فن کے باعث اِن کی شخصیت کے گرد قوت وتغلب کا ایک پُراسرار سا ہالا تنا رہتا ہے۔راہ چلتے چلتے لوگ ٹھٹھک کر اِن کو دیکھتے ہیں،سلام بھی کرتے ہیں مگر ہمیشہ ان سے ایک آرام دہ فاصلہ پر رہنے کی کوشش کرتے ہیں۔ڈاکٹر محمد اعظم بھی اپنی شکل وشباہت اور قدبت کے لحاظ سے درج بالا تین زمروں ہی کا ایک فردِ فرید معلوم ہوتا ہے۔ہم حیرت سے کبھی ڈاکٹر محمد اعظم کو دیکھتے ہیں اور کبھی اس کے نور پاروں کے صحیفے ''تمھی میری محبت ہو'' (دھیان) پر نظر ڈالتے ہیں سراسر دوائمل اور بے جوڑ سی چیزیں دکھائی دیتی ہیں پھر یکا یک حاشیۂ ذہن پر ایک خیال اُبھراتا ہے کہ بھئی ڈاکٹر محمد اعظم نرا ڈاکٹر محمد اعظم ہی تو نہیں ہے (ہے ذوقِ تجلی بھی اسی خاک میں پنہاں غافل تو نرا صاحبِ ادارا ک نہیں) وہ اختر شمار بھی ہے۔

اختر شماری اس کا محبوب ترین مشغلہ ہے اس شغل عجیب سے رغبت رکھنے والے لوگ معمولی لوگ نہیں ہوتے۔یہ دنیا والوں سے نرالے ہوتے ہیں۔اختر شمار بھی ایک غیر معمولی اور نرالا شخص ہے وہ صاحبِ درد،صاحبِ نظر اور صاحبِ عشق انسان ہے۔یہ تمام مراتب اُسے فطرت سے ملے ہیں۔عشق حقیقی ہو یا مجازی،دونوں جذبے دیدہ ودل کے لئے وسیع امکانات کے حامل ہوتے ہیں۔اعلیٰ اقدار کے حصول اور ان کی اشاعت وفروغ کے پاکیزہ عمل کو عشق سے تعبیر کیا جاتا ہے۔یہ جذبہ انسان کے تمام سفلی جذبات کو ختم کر کے اسے بلندی ہمتی اور اخلاق واستحسان ن کی ایسی رِفعتوں کی طرف لے اڑتا ہے جو (بقول مولانا صلاح الدین احمد) طوبیٰ کی ہمسر اور ثریا کی ہمدوش ہیں۔مولانا روم کا ارشاد ہے شاد باش اے عشقِ خوش ہودائے ما۔اے طبیبِ جملہ علت ہائے ما۔

اس مفہوم کو غالب نے اردو میں اس طرح بیان کیا ہے۔

عشق سے طبیعت نے زیست کا مزہ پایا
درد کی دوا پائی دردِ لا دوا پایا

اختر شمار اُسی جذبہ عشق سے سرشار ہے۔اس کے دیدہ ودل اور قلب و نظر،عشق کے سوز وتپش سے منور ہیں ں اور محبت کے وسیع امکانات سے مالا مال ہیں اسی جذبہ عشق کے نور سے وہ حیات وکائنات کو اجالنے،سنوارنے اور عدل و امن کی چاندنی سے آراستہ پیراستہ کر دینے کی آرزو رکھتا ہے۔شعر گوئی اور غزل سرائی کے ذریعے وہ شرحِ آرزو کرتا ہے اور تکمیل آرزو کے لئے جذبہ عشق،دلسوزی و جگر تابی کے علاوہ یقین محکم،عمل پیہم اور محبت فاتحِ عالم سے کام لیتا ہے۔اختر شمار کے خواب وخواہش کی دنیا مکاں سے لامکاں تک پھیلی ہوئی ہے۔اِس دنیا کو اس نے تتلیوں،پھول کلیوں،جگنوؤں،چاند تاروں،کہکشاؤں،دھنک کے سارے رنگوں،خوش رنگ وخوش آواز پرندوں،ابلتے چشموں،جوئے باروں،مرغزاروں،دامنِ کوہ میں کھلتے گلابوں،صحنِ چمن میں اترتی سہانی صبحوں،شفق رنگ شاموں،مسکراتے چہروں،تقدس مآب بزرگوں کی شفقتوں،ماں کی دعاؤں،بہنوں کے خلوص،بیوی کی وفاؤں،یادوں کے بے نام جزیروں،پھول سے بچوں کی معصوم مسکراہٹوں،محبتوں کی خوشبوؤں،نشاط انگیز وروح پرور نغموں اور ہزار ہا دل آویز و نظر افروز منظروں سے سجا رکھا ہے۔اس حسین وجنت نگاہ دنیا کی جھلک اور اس کے گل رنگ چہرے کی چاندنی ہمیں اختر شمار کی غزلوں میں ملتی ہے۔اختر شمار کے اشعار اس کے خوابوں کی شاداب بستیوں اور حیات افزا جزیروں کے ساحلوں پر چلنے والی ہواؤں کا ٹھنڈا جھونکا ہیں۔اختر شمار کی غزلوں کے پُرشوق مطالعے کے دوران ہم پر یکا یک ایک بجلی سی کوند جاتی ہے۔

آنکھیں تو ایک لمحے کے لئے خیرہ ہو جاتی ہیں لیکن ہمارے سامنے رنگ ونور کا ایک جھلملاتا دھارا سا نمودار ہوتا ہے۔جس کے سرے پر دور ایک دریچہ وا ہوتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔خوبصورت الفاظ وتراکیب اور حسین استعارات وتشبیہات سے بنے اس چوکھٹے کے اُس پار ہمیں اختر شمار کے سپنوں کی دنیا جھلملاتی،سانس لیتی اور دعوتِ نظارہ دیتی دکھائی دیتی ہے۔خیال وخواب کی اس دنیا کو ہم اپنی جاگتی آنکھوں سے دیکھنے،محسوس کرنے اور اُس میں آباد ہونے کی آرزو کرنے لگتے ہیں۔ایسی دنیا (شاعر کے حسین تخیلات ہی میں آباد سہی) کی تعمیر اور قارئین کے دلوں میں اس دنیا میں آباد ہونے کی آرزو جگا دینا اختر شمار کا شعری اعجاز ہے۔اختر شمار کی شاعری یا یوں کہیے کہ اُس کے حسن تغزل کی ساحری ہمیں (چند لمحوں کیلئے ہی سہی) اس جیتی جاگتی دنیا کے لئے تلخ حقائق وشدائد،اس میں پھیلی ہوئی نفرتوں،کلفتوں،انسانیت سوز رویّوں اور روح فرسا ہوس ناکیوں اور جبر واستبداد کی لرزہ خیز داستانوں سے نجات دلا کر ہمارے دلوں کو نشاط انگیز فضا میں دھڑکنے اور ہماری روحوں کو سکوں پرور اور کیف آگیں ماحول میں سانس لینے کا موقع فراہم کرتی ہے۔

اختر شمار ایک خوش فکر،بالیدہ خیال اور پُرگو سخن ور ہے پر گوئی کے لئے وسیع مشاہدہ عمیق مطالعہ سنجیدہ خیالی،زندگی آمیز اور زندگی آموز تجربات،زبان وبیان پر کامل عبور اور جدید وقدیم علوم سے گہری واقفیت ضروری عناصر ہیں۔ان کے بغیر ایک شاعر فکر وفن کے اعتبار سے کامل وماہر نہیں بن سکتا۔جیسا کہ سطور بالا میں مزکور ہوا اختر شمار ایک پر گو شاعر ہیں۔اظہار وبیان میں پختہ کار ہونے کے علاوہ فکر وفن کی جملہ اداؤں اور خوشرنگ قرینوں کے امین وراز دان بھی ہیں۔اختر شمار کے لبوں کا اعجاز ہمیں ان کی حسب ذیل تخلیقات میں ملتا ہے۔1: روشنی کے پھول 2: کسی کی آنکھ ہوئے ہم 3: یہ آغازِ محبت ہے 4: جیون تیرے نام 5: ہمیں تیری تمنا ہے 6: آپ سا نہیں کوئی 7: اکھیاں دے وچ دل۔

شاعر نے اپنے قارئین کی آسانی کے لئے مذکورہ صدر کتابوں کی غزلوں اور نظموں کا ایک حسین ودلکش انتخاب ''تمہی میری محبت ہو'' کے نام سے شائع کیا ہے۔یہ کتاب اختر شمار کی تخلیقات میں گل سرسبد کی حیثیت رکھتی ہے۔اس حسین کتاب کی غزلوں کا رنگ وآہنگ منفرد ہی نہیں دل آویز بھی ہے۔

ان غزلوں میں شاعر کا لب ولہجہ فکر انگیز ہونے کے ساتھ ساتھ نشاط انگیز بھی ہے منتخب غزلوں کے اس مجموعے میں اختر شمار یاد،دعا،دستار،وفا اور محبت

باقی صفحہ ۴۷ پر ملاحظہ کیجیے

''یہ آغازِ محبت ہے''

سجاد بخاری
(جھنگ)

اختر شمار ملک کے صفِ اول کے شعراء میں شامل ہیں۔ ان کی شاعری یہ احساس دلاتی ہے کہ وہ فن کی اُس منزل پر ہیں جہاں اپنے لفظ اور بحر اپنے ساتھ لاتا ہے اور وہ لفظ یا قافیے سے خیال کی طرف نہیں جاتے۔

ان کی شاعری کی خوبیاں تو اہلِ نظر پر عیاں ہیں۔ یہاں پر اُن کے شعری مجموعہ ''یہ آغازِ محبت ہے'' کو عروض کے حوالے سے دیکھنا مقصود ہے۔ تازہ شعری مجموعے میں اختر شمار نے تقریباً تیرہ یا چودہ بحروں پر طبع آزمائی کی ہے۔ ہندی بحریں اس سے الگ ہیں۔ انہوں نے اپنی کتاب میں جو بحور اور اوزان استعمال کیے ہیں ان کی تفصیل ہدیہ قارئین ہے۔

۱۔ بحرِ حدید۔ فاعلاتن فاعلن۔ اس وزن میں صرف ایک ہی غزل کہی گئی ہے۔ مثال:

ترک کر شہزادگی　　باقی باتیں بعد کی

۲۔ بحر ہزج مسدس اخراب مقبوض۔ مفعول مفاعلُن فعولُن۔ یہ بحر غالب کی ہے۔ اس بحر میں سات غزلیں کتاب میں شامل ہیں۔ جو بہت بڑی بات ہے۔ کیونکہ یہ بحر دیکھنے میں آسان نظر آتی ہے لیکن لکھنے میں بڑی مشکل ہے۔ مثال:

کس کس کی نگاہ سے بچے گی
جو شاخ بھی پھُول پھَل رہی ہے

۳۔ بحرِ خفیف مجنون محذوف۔ فاعلاتن مفاعلُن فعلُن۔ اس وزن میں آٹھ غزلیں ہیں۔ مثال:

چہرۂ خواب! آنکھ میں نہ سہی
میری سوچوں ہی میں بھٹکتا تُو

۴۔ بحر رمل مسدس محذوف۔ فاعلاتن فاعلاتن فاعلُن۔ اس وزن میں بھی صرف ایک غزل ہے۔ مثال:

تیری خاطر ہم ہنسے خود پر مگر
تیرے ہنسنے کا بڑا ہی رنج ہے

۵۔ بحر مجتث مجنون محذوف۔ مفاعلُن فعلاتن مفاعلُن فعلُن۔ یہ بحر غالباً اختر شمار کی پسندیدہ ہے کیونکہ اس وزن میں غزلوں کی تعداد سب سے زیادہ یعنی سترہ ہے۔ مثال:

نہ اُس نے خط ہی لکھا ہے نہ کوئی فون کیا
کچھ اس طرح بھی مجھے اُس نے بے سکون کیا

۶۔ بحرِ رمل مثمن مجنون محذوف۔ فاعلاتن فعلاتن فعلاتن فاعلُن۔ اس وزن میں چار غزلیں ہیں۔ مثال:

ہم پہ بھی ڈال کبھی اپنی گلابی نظریں!!
ہم بھی شامل ہیں چمن کے ترے خار و خس میں

۷۔ بحرِ رمل مثمن مخذوف۔ فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلُن۔ اس وزن میں بھی صرف ایک غزل کہی گئی ہے۔ مثال:

خواب میں بھی اپنے ہونے کا یقیں سانسوں میں رکھ
میں ترا اُڑتا ہوا پَل ہوں مجھے آنکھوں میں رکھ

۸۔ بحر ہزج مثمن سالم۔ مفاعلین مفاعلین مفاعلین مفاعلین۔ اس وزن میں تین غزلیں اور کچھ نظمیں ہیں۔ مثال:

لبوں پر آخری دم ہے ضم وہ رام کیا ہوگا
یہ آغاز محبت ہے تو پھر انجام کیا ہوگا

۹۔ بحر ہزج مثمن مقبوض۔ مفاعلُن مفاعلُن مفاعلُن مفاعلُن۔ اس بحر میں کتاب میں دو غزلیں شامل ہیں۔ مثال:

تباہ کر گئی کسے وہ تیری دل لگی فقط
تری ہنسی ہنسی میں کون اپنی جان سے گیا

۱۰۔ بحرِ مضارع مثمن اخراب مکفوف مقصور۔ مفعول فاعلات مفاعیل فاعلُن۔ اس بحر میں بھی دو غزلیں ہیں۔ مثال:

آنکھیں یہ جس کی راہ میں پتھر کی ہوگئیں
وہ چل دیا ہے آنکھ میں شیشہ اتار کر

۱۱۔ بحرِ متقارب مقبوض اثلم۔ فعول فعلُن فعول فعلُن فعول فعلُن۔ اس بحر میں صرف ایک ہی غزل کتاب میں شامل ہے۔ مثال:

وہ ایک چہرہ ازل سے میرے خیال میں ہے
مری دُعا ہے، کبھی نہ میرا خیال بدلے

۱۲۔ بحرِ متقارب۔ فعولُن فعولُن فعولُن فعولُن۔ اس بحر میں ایک نظم ہے جس کا عنوان ہے ''سفر کے بعد کا سفر''

اختر شمار نے جو ہندی بحریں استعمال کی ہیں اب اُن کی تقطیع کی جاتی ہے۔ مثال:

خطرے کی گھنٹی پر جاگ
جاگ بھی دل کے پتھر جاگ
فعلُن فعلُن فعلُن فعل (فع)

ایک اور مثال:

عین یقین کہ نقطے کا دروازہ میں
کاش کسی پل خود پر بھی تو کھُلتا میں
فعل فعولُن فعلُن فعلُن فعلُن (فع)

باقی صفحہ ۳۰ پر ملاحظہ کیجیے

محبتوں کا شاعر

ڈاکٹر نثار ترابی
(راولپنڈی)

عصری شعری ادب میں اختر شمار ایک ایسا نام ہے جس نے شعری عمر کے کم عرصے میں تخلیقی شناخت کے انفرادی نقوش ابھارنے میں قابلِ ذکر تاب و توانائی کا مظاہرہ کیا ہے۔۔ہائیکو، نظم، غزل قطعات اور فردیات کی صورت میں اس کا شعری سفر ہجوم میں اپنی پہچان کے رنگ واضح کرتا ہے۔

اختر شمار اردو پنجابی۔۔ہر دو زبانوں میں میں شعری ونثری اظہار کو اپنی آرٹ گیلری میں سجانے کے ہنر سے آگاہ ہے۔

ہائیکو کی شکل میں اس کا پہلا شعری مجموعہ ''روشنی کے پھول'' چھپا تو سنجیدہ ادبی حلقوں نے اسے خوب سراہا۔۔اس کے کچھ عرصہ بعد اس کی نظموں اور غزلوں پر مشتمل مجموعے ''کسی کی آنکھ ہوئے ہم''

''یہ آغازِ محبت ہے'' ''جیون تیرے نام'' اور پنجابی شعری مجموعہ ''اکھیاں دے وچ دل''

منظر عام پر آئے اور حلقہ فکر ونظر کو اپنے تازہ اور توانا لہجے کی بدولت بھاتے چلے گئے۔۔

اختر کے ہاں خیالات، جذبات اور احساسات کی معنوی آرائش کاری ہے نہ الفاظ اور مصرعوں کی دروبست میں کسی ذہنی ورزش کا فنی التزام۔۔۔اس کی فکر، ہئیت موضوع اور مواد سے زیادہ وجدان اور جذب وخلوص کی اس ازلی رفاقت کے دوش بدوش سفر کرتی ہے جسے ''آمد'' کا نام دیا گیا۔۔شاید اسی سبب سے ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا نے کہا ہے کہ:

''وہ (اختر) ایک فطری شاعر ہیں اور فطری شاعر اپنا راستہ الگ بناتا ہے۔''

ہم نے کہیں پڑھا تھا کہ عورت زندگی میں اپنی محبت کو کبھی نہیں بھولتی اور مرد اپنی آخری محبت کو ہمیشہ یاد رکھتا ہے۔۔مگر محبتوں کے باب میں ہمارا یار اختر شمار ذرا ''وکھری ٹائپ'' کا مرد واقع ہوا ہے۔۔یوں کہ پہلی محبت سے آخری محبت تک کے سبھی شاداب سلسلے اُس کی مچلتی سانسوں کا سدا حصہ بنے رہے ہیں، گویا اس کا شعری سفر پہلی محبت سے آخری محبت تک کا سفر ہے۔پہلی محبت کی کسک اور جاودانی جاذبیت واثر پذیری کا خصوصیت سے ذکر قدیم وجدید غزل گوؤں اور خصوصاً خالص رومانوی طرز فکر واحساس کے حامل سخن وروں کے ہاں ایک نمایاں داخلی رجحان کے روپ میں اظہار کی سطح پر عکس ریز ہوتا رہا ہے۔عصر موجود کی اردو غزلیہ روایت کی لاریب۔۔۔سب سے مقبول اور اہم آواز احمد فراز کے ہاں اس کی زندہ رہ جانے والی مثال سے یقیناً آپ آگاہ ہیں:

اول اول کی محبت کے نشے یاد تو کر
بے پئے بھی ترا چہرہ تھا گلستاں جاناں

عطاالحق قاسمی نے ''کسی کی آنکھ ہوئے ہم'' کا پیش لفظ تحریر کرتے ہوئے اختر شمار کی شاعری کو ایسی اچھوتی خوشبو قرار دیا ہے جو صفحہ قرطاس پر ابھرتی ہے اور پڑھنے والے کو اپنے دل پر بارش کی طرح اترتی محسوس ہوتی ہے۔''

اور ظاہر ہے کہ دل کی بات دل سے نکلے تو دل کی دھرتی پر بارش کے سخی روپ میں سخاوت تو کر ہی جاتی ہے۔۔خود اختر شمار نے متذکرہ شعری مجموعے کے دوسرے ایڈیشن میں اپنے مختصر اظہار میں قارئین ادب کو یہ اطلاع فراہم کر دی ہے کہ:

''مجھے اپنی یہ کتاب اس لئے بے حد عزیز ہے کہ یہ غزلوں کے حوالے سے میری پہلی تصنیف ہے اور پہلی محبت کے ساتھ وابستگی امر ہوتی ہے۔''

مطالعے کے دوران اس کا ثبوت یوں ملتا ہے کہ شاعر اپنے شاعرانہ سفر کے ہر موڑ پر محبت کی پہلی کہانی دہرا کر اگلے کسی پڑاؤ کا اہم کردار بنتا ہے۔محبت کی کسک، معراج محبت کی ان بلندیوں پر ہے کہ پہلے مجموعے کا انتساب سوچتے ہوئے بھی شاعر لحہ لحہ سوچتی اور اشک اشک بولتی۔۔۔ان آنکھوں کو نہیں بھولا جن سے اس نے پڑھنا سیکھا۔۔۔آنکھ اور دل۔۔۔اس کی شعری کائنات کے سب سے مرغوب اور تسلسل سے برتے جانے والے ایسے استعاروں کی شکل میں ہمارے سامنے آتے ہیں جو قدیم شعری روایت کے موضوعاتی تتبع میں اظہار پانے کے ساتھ ساتھ نئے اور مختلف انداز سے شعری پیکر میں ڈھلتے دکھائی دیتے ہیں بلکہ آنکھیں اور دل۔۔۔اسے اتنے عزیز ہیں کہ اُس کے پہلے پنجابی شعری مجموعے کا نام بھی۔۔۔۔شعر کی سطح پر عموماً تخلیقی واردات کے لیے بنیاد کا کام کرنے والے۔۔۔انہی دو لفظوں۔۔۔دو استعاروں سے ترتیب پایا ہے اور جس کا نام ہے ''آکھیاں دے وچ دل'' اردو کلاسیکی شعری روایت میں خدائے سخن میر تقی میر اور بعد میں فانی بدیوانی کو غم پسندی کے باب میں نمایاں حیثیت حاصل ہے۔اختر نے غزل سرائی میں اس غم پسندی کو پسند کرتے ہوئے میر کی ہم نوائی کا دم بھرا ہے اور برملا میر صاحب کو اپنا مرشد تسلیم کیا ہے۔

غزلیں کہنے سے پہلے !
اپنا مرشد میر بنا

یہی نہیں بلکہ غم پسندی کے ساتھ ساتھ اس کے ہاں بعض مقامات پر اداسی کی کیفیات اس رنگ خاص سے ہم آہنگ ہو جاتی ہیں جو بیسویں صدی کے ایک بہت اہم اور رجحان ساز شاعر ناصر کاظمی کے بام فکر پر نمایاں نظر آتی ہیں۔

کسی مزار پہ جلتے ہوئے دیے کی طرح
میں ایک عمر اداسی کے درمیان رہوں

جلتے ہوئے دیے کی طرح عمر اداسی کے درمیان رہنے کی اس تمنا نے شاعر کو خوابوں کے نامعلوم طلسماتی جہاں میں کہیں گم کر دیا ہے۔اس کے پہلے شعری

مجموعے ''کسی کی آنکھ ہوئے ہم'' سے اب تک کے آخری شعری مجموعے ''اکھیاں دے وچ دل'' تک اس کی اسی رومان پسند اور خواب تمنا زندگی کا شدید اظہار ہے۔

ڈاکٹر وزیر آغا۔۔۔اختر کی شعری دنیا کی اس مجموعی خواب ناک اور خواب آور فضا کو محسوس کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ''بند آنکھوں اور سلے ہوئے ہونٹوں کی معیت میں خواب سمندر کی سطح پر ایک سفینے کی طرح ہچکولے کھاتے پھرنا۔۔۔بس یہی وہ بنیادی امیج ہے جو اختر شمار کے اس شعری مجموعے میں ابھرا ہے''

اختر کی شاعری سے کھلتا ہے کہ غزلوں ہائیکو قطعات اور نظموں کی شکل میں ،اس کا شعری سرمایہ۔۔۔اس خواب اور رومان انگیز فضا کی بنت کاری سے وجود پاتا ہے۔۔۔''تیرے نام، اپنے بخت سے، دور تک پھیلی ہوئی آواز کی بازیافت ،ایک بوسیدہ کلینڈر کی تحریر، دل نہیں مانتا، اپنا آئینہ اپنے ہاتھ، ستاروں کی لو میں ایک گیت، نئے موڑ پر، تو آئے تو، دلدل، گئے دنوں کا دکھ، خوشبوؤں کے درمیان ایک شب، دن گزرتے جا رہے ہیں، ادھر سے گزرو تو، آنکھوں کا مکالمہ،، میں لوہا تو، سچی خوشی، خواب میں خواب اور اے میری شفاف محبت سمیت متعدد نظمیں ایسی ہیں جو غم پسندی اور اداس صفت مزاج کو فضا میں بسا کر پیش کرتی ہیں۔

وصل و انتظار کی ملی جلی، لہراتی اور بے چین ہوتی کیفیات کی حامل اور محبت کی ازلی خوشبوؤں میں بسی بعض شعری کلیوں میں گیت کی زبان، آہنگ، مزاج اور فضا کی کارفرمائی بھی مجسم ہوئی ہے۔

سچی خوشی اور ''کبھی آؤ نا'' کے ناموں سے اظہار پانے والی ایسی ہی دو خوب صورت مختصر نظموں سے آپ لطف اٹھایئے۔:

سچی خوشی
قریہ قریہ مہلک اٹھا ہے
دن کی شاخ پر پھول کھلا ہے
تو آیا ہے

کبھی آؤ نا
جھلمل جھلمل تاروں میں
کالے نین کٹاروں میں
ہنستے ہنستے پھولوں کی
خوشبو مہکے سوچوں میں
مہندی جیسی چھاؤں ہے
دھوپ کی چھت پر
بادل رتھ پر
نیلی نیلی آنکھوں والے
دل کے بھاگ جگاؤ نا
آؤ نا۔۔۔کبھی آؤ نا

ارمان انگیز موضوعاتی پرواز کے دوران اکثر شعراء حقائق پرستانہ فکر و خیال کا ساتھ ذرا کم ہی دیتے ہیں مگر اختر کے ہاں ایسا نہیں ہے۔اس کی شاعرانہ سوچ صداقت کے سفر کا استعارہ ہے۔ جادہ حق پر گامزن رہنے کے سبب وہ جراتِ اظہار عطا کر دی ہے کہ رہ حیات میں صداقت پسندی ہی اس کا چلن بن گیا ہے۔ سچ بولنے کی چاہ میں وہ کڑے سے کڑے امتحان سے گزر جانے کو آدمیت کا وقار خیال کرتا ہے۔

میں قتل گاہ میں جا کر بھی سچ ہی بولوں گا
میں وہ زبان نہیں ہوں جو کیل دی جائے

ہم تخلص شعراء اختر انصاری، اختر ہشیار پوری، اختر امام رضوی، اختر جعفری، اختر شیخ، اختر شاد، اختر عثمان کی طرح اختر شمار نے بھی لفظ ''اختر'' کو لفظی و معنوی رعایتوں کے تناظر میں فکر و فنی سطح پر اظہار کے عمدہ پیرائے میں پیش کرنے کی متعدد مثالیں یادگار چھوڑی ہیں بلکہ کہیں کہیں تو نام اور تخلص۔۔۔ہر دو بڑی ہنر مندی کے ساتھ یکجا ہوئے ہیں یہاں اس کی چند مثالیں بطور نمونہ درج کی جاتی ہیں۔

اختر شمار کرتے کٹی ہے تمام عمر
تاروں میں بانٹتا مری آنکھیں نکال کر
تارو ں کو شمار کر کے کوئی
اشکو ں کے چراغ گن رہا ہے
جاتے ہوئے بولا سورج
شام ہوئی ہے اختر جاگ
اے آسمان میں ترا اختر شمار ہوں
میری نظر کی کچھ تو صداقت شمار کر

اوپر درج کیے گئے آخری شعر کی حامل غزل کی ایک اسلوبی خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس کے ایک مصرعے میں لفظ ''شمار'' کا فن کارانہ استعمال خود شاعر کے تخلص سے مناسبت کی بنا پر اور بامعنی تکرار اور صوتی آہنگ کے سانچے میں ڈھل کر اسے دو آتشہ جمالیات کا نمائندہ بنا دیتا ہے۔

اس کے ہاں خالص پنجاب کا کلچر اپنی متنوع مگر زمانوں سے قائم شدہ روایات اور رسومات کی منظوم منظر کشی کرتا ہے۔اس کی شاعری یہاں کی مٹی۔ میلے ٹھیلوں، پنگھٹوں، کھیتوں کھلیانوں اور کھلے میدانوں کو حسی سطح پر محسوس کر کے اظہار کے قرینے سجاتی ہے۔اس کے ہاں محبوب کی یاد سالگرہ کے موقع پر انگڑائیاں لینے کی بجائے گاؤں کے میلے کے دنوں میں بیداری کی شدید لہر میں بدلتی اور اداس ہوتی دکھائی دیتی ہے۔

؎ چار دن رہ گئے ہیں میلے میں مگر اب بھی
اس نے آنے کے لیے خط میں لکھا کچھ بھی نہیں

یا پھر

ے جانے کون ہے شام ڈھلے جو پنگھٹ پر
گم سم بیٹھی سُونا رستہ دیکھتی ہے

اس کے ہاں مضمون آفرینی اور قافیے میں جدت طرازی کے نقش بھی ابھرے ہیں ل مثلاً

ے تارِ دل بجتے بجتے ٹوٹ گئے
جیسے ہی اس کا فون ختم ہوا
کس نے دل سے وداعی مانگی تھی
جب بیاسی کا جون ختم ہوا

''کلام اختر پڑھتے ہوئے یہ گمان گزرتا ہے کہ شاعر جیون کہانی کے کسی موڑ پر خود کو گم کر بیٹھا ہے۔ وہ ذات کے درِگماں سے نکل کر بابِ یقیں پر سجدہ ریز ہونا چاہتا ہے اور خواب کے سائے کو حقیقت کے لباس میں بدلنے کا خواہاں ہے۔ اپنی داستان کے درِ خود پر کھلتے دیکھنے کی چاہ میں اس کا ذوقِ صدا اسے اپنی دستکوں کا اسیر رکھے ہوئے ہے اس لیے کہ اُسے آنکھوں میں رُکی خوابوں کی کہانی کو عنوان دینا ہے۔ کوئی پہچان دینا ہے۔ اسے ایک ایسے دشت کا سفر درپیش ہے۔ جہاں مسافت کی داستاں رقم کرنے لیے مسافر کو پاؤں میں زنجیر رکھ کر بھی سفر کرنا پڑتا ہے۔ جہاں ل مخالف تیز ہواؤں اور دشمن تقدیروں کے ساتھ صحرا تمنا میں خواب کی عمر گنوا کر گونگی تحریروں کو قید کرنا پڑتا ہے اسے ایک ایسے دشت ستم نے آلیا ہے۔ جہاں بات کرنے پر ہونٹ سی دیے جاتے ہیں اور دیکھنے والی ہر آنکھ کو زمین میں گاڑ دیا جاتا ہے۔۔ مسافر منزل کے قریب لٹ کر زندگی ہار ہار جاتا ہے۔ آنکھوں میں ناچنے والا خواب صدیوں کی تھکن کا بہروپ بھر لیتا ہے جہاں قدم پڑتے ہی آنکھیں فرات بن جاتی ہیں اور سوچوں میں کرب بلا کا دشت ابھر آتا ہے جہاں ظلم کے جنازے اور راشکوں کے وظیفے پڑھنا رات کی کہانی کا مقسوم ہو گیا ہے جہاں اشک کپاس کی طرح آنکھوں کی سرزمین میں اُگ آتے ہیں۔ جہاں اک عمر سے زخموں کا لہو چاٹ کر اہل دل رہ دشت وفا میں محبت کی سزا کاٹ رہے ہیں جہاں انمول انسانی رشتے بھی تجارتی سطح پر تقسیم ہو جاتے ہیں۔۔۔ سارا ماحول ہی عجب بے اعتبار و بے حسی کے ظالم طلسم میں ہے۔ اس کے ایوان شاعری سے، مٹتی قدروں کے نوحے بلند ہوتے ہوئے سنائی دیتے ہیں اُسے محبت اور معاملات محبت سے کشید ہونے والی صداقتوں کے ساتھ ساتھ اپنے عہد، کی تلخ سماجی سچائیاں بھی یاد رہتی ہیں ۔۔۔ یہ درد۔۔۔ یہ کرب اس کے عصری ماحول کا پیدا کردہ ہے۔۔۔ جو اس نے شعروں کی صورت میں تصویر کر دیا ہے۔

ے جذبوں کی کوئی بھی یہاں قیمت نہیں رہی
اس دور میں تو خون کے رشتے بدل گئے
یہاں پہ اپنا کہیں تو کس کو عجیب دکھ ہے
شار اب تو تمام رشتے تجارتی ہیں
درخت آپس میں کہہ رہے تھے کوئی بتاؤ
ہوائیں جنگل میں رات کیسے گزارتی ہیں

آئی یہ کیسی چاپ کہ سپنے ٹوٹ گئے
رات ہوا کے ہاتھ کھلونے ٹوٹ گئے
آنکھوں میں اُگے ہیں اشک ایسے
جس طرح کپاس اگ رہی ہے
آنکھیں بھی فرات بن گئی ہیں
سوچوں میں یہ کیسی کربلا ہے
آنکھوں میں ستارے جڑ گئی ہے
کس دشت میں رات پڑ گئی ہے

متعدد شعری مقامات پر عصری کرب کے حقیقت پسندانہ تجزیاتی نقشے مصور کرنے کے باوجود مجموعی طور پر اختر کی شاعری۔۔۔

ے چاند تو سو جاتا تھا اور ہم اختر جاگتے رہتے تھے

والی پہلی محبتوں کے نشے میں ڈوبی رہنے والی اور ملن و جدائی کے سنجوگ سے ترتیب پانے والی اُس پیار کہانی کی ترجمانی ہے جس کا مرکزی کردار خود شاعر ہے اور اس نے اپنے شعری نگار خانے میں پہلی محبت کی پہلی یاد کی جو تصویر سجائی ہے وہ اس میں سات رنگوں کی شاعری بھر دینے کا تمنائی ہے مگر پیار کی سزا کاٹ کر بھی شکوہ کناں ہونے پر مائل دکھائی نہیں دیتا کہ اس سے اس کے بے لوث پیار کے سچے جذبے کی نفی ہوتی ہے۔

ے کاٹ لی پیار کی سزا ہم نے
آپ سے کچھ نہیں کہا ہم نے

اور اب آخر میں اختر شار کے غزلیہ سرمائے میں سے چند مزید شعر ملاحظہ ہوں جو عشق اور محبت ایسے انمول اور لازوال جذبوں کی ترجمانی کا فریضہ انجام دیتے ہوئے شاعر کی انفرادی شعری شناخت کے رنگ واضح کرتے ہیں اور کمال یہ ہے کہ انفرادی شعر شناخت کی یہ گواہیاں اس کے ہاں جگہ جگہ بکھری پڑی ہیں۔

ے کسی کی کھوج میں اب تک اداس پھرتا ہوں
میں اپنی عمر کے کتنے اداس سال لیے
میں پہلی کا چاند تھا لو گو!
افق پہ آکر ڈوب گیا ہوں
اپنی کل پونجی کا مان لیے پھرتے ہیں
تیرے لیے ہم اپنی جان لیے پھرتے ہیں
کتنی چمک تھی وقت کے آئینے میں لیکن
آنکھ بچا کر ہم اک دھیان لیے پھرتے ہیں
سر کا بوجھ ہے تیری چوکھٹ کے ملنے تک
کاندھوں پر تیرا سامان لیے پھرتے ہیں
تیرا غم بھی نیا نیا ہے ابھی !
میرے دل کی بھی ابتدا ہے ابھی

آدابِ خودآگاہی

جمیل احمد عدیل
(جھنگ)

قد آور ادیبوں کی فہرست جب بھی ترتیب پائے گی، اختر شمار کا نام وہیں درج ہوگا جہاں کشیدہ قامت حسیناؤں کی لسٹ میں سُشمیتا سین کھڑی ہیں۔ ہم اکثر سوچتے ہیں کہ اختر شمار آخر خود میں کیا کمی محسوس کرتے تھے جو ادیب شاعر ہو گئے وگرنہ یہ اس قدر دلکشی کے ساتھ شوبز کے گلزار میں گئے ہوتے تو سرو صنوبر سائے کی طرح ان کے ساتھ ساتھ پھرتے۔ جب یہ کسی تقریب کی صدارت کر رہے ہوں تو ایسا لگتا ہے اس خوش قامتی کے پیچھے ان کی کامیاب شعوری کاوشوں کا بھی کچھ حصہ ہے وگرنہ ہم ایسے مرکزی نشست پر بیٹھ کر اپنے قامت کی درازی کا بھرم آپ ہی کھول دیتے ہیں، بولتے جاتے ہیں اور طرّہ پیچ وخم خود ہی نکلتے جاتے ہیں۔ ان کا اصل نام محمد اعظم خان ہے۔ یقیناً یہ اختر شمار اس لیے ہوئے ہوں گے کہ اپنی رسائی کے کارن ستارے گننے میں انہیں خصوصی سہولت یعنی یدِ طولیٰ جو میسر ہے۔ ہر ستارے کے سیمیں ومرمریں شانے پر ہاتھ رکھ کر گنتے جاتے ہیں۔

ایک، دو، تین، چار

جن ستاروں کے کندھے اپنی ملائمت کے سبب انہیں زیادہ پسند آ جائیں وہاں گنتی بھولنا ہرگز نہیں بھولتے۔ سو دوبارہ شروع ہو جاتے ہیں:

ایک، دو، تین، چار

کسی ٹی سٹال پر جا کر جب بیرے کو آواز دیتے ہیں: اوئے چھوٹے! تو وہ انہیں یُوں گھور کر دیکھتا ہے جیسے کہہ رہا ہو: جناب! میں چھوٹا بالکل نہیں ہوں، بس آپ کی وجہ سے چھوٹا پڑ گیا ہوں۔ وہ بے چارہ اُس وقت مزید چھوٹا پڑ جاتا ہے جب اُسے آرڈر دیتے ہیں: جاؤ! دو فُٹ چائے لے آؤ! ایک روایت کے مطابق اہرامِ مصر نے بھی سر جھکا کر ان سے پیار لیا تھا۔۔۔! شمشاد رنگ اختر شمار ہمیں لالہ منصور آفاق کے ہمراہ کوئی ربع صدی قبل بابر مارکیٹ کے قرب وجوار میں دستیاب ہوئے تھے اور پھر ہم ایک عرصہ بلاناغہ ایک دوسرے بلکہ ایک تیسرے کو وہیں دستیاب ہوتے رہے۔ روسی ناول نگار دوستوفیسکی نے کہا تھا:

''ہم سب گوگول کے اوورکوٹ کی جیب سے برآمد ہوئے ہیں''

سو صاحبو! لاہور کے جملہ جمال پرست بانو بازار کے پہلوؤں سے ہی برآمد ہوتے ہیں۔ ہمارے ہم پیشہ وہم مشرب وہم راز اشفاق احمد ورک ایک روز کہنے لگے: یار ہر روز بانو بازار میں ہی گھومتے ہیں، کسی دن لبرٹی نہ چلیں؟ ہم نے کہا: خاموش! جو لبرٹی یہاں مہیا ہے وہ اور کہیں موجود نہیں! اگرچہ اختر شمار کا شوقِ آوارگی انہیں مصر تک لے گیا اور ہم اولیا کی سرزمین کے گمشدہ یوسف کی تلاش میں پیغمبروں کے علاقے میں نہ جا سکے کہ ہمیں معلوم تھا مصر کے بازار میں نئی تہذیب کے نئے آثار دیکھتے دیکھتے انہوں نے کسی نہ کسی عزیزِ مصر کے ہتھے چڑھ جانا ہے اور ہماری وہاں کے کسی داروغہ زنداں سے کوئی شناسائی نہیں ہے۔ خود ہی اسیری کاٹ کوٹ کر لوٹ کے پاکستان آ جائیں گے تو جی بھر کے مل لیں گے۔ اداسیاں دُور کر لیں گے۔

ویسے بھی ہمارا کبھی قاہرہ جانے کو جی نہیں چاہا کہ گھر میں جو ''قاہرہ'' موجود ہے۔۔۔ پھر یہ ہوا کہ یہ واپس آ گئے۔ شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ نثر نگار تو پہلے بھی تھے لیکن قیامِ مصر نے مقامِ نثر میں انہیں اور ممتاز کر دیا کہ اب ان کی بغل میں ایک ضخیم کتاب کا مسودہ تھا۔ ''موسیٰ سے مُرسی تک!'' دیارِ غیر سے انہوں نے جو کمایا یا زنانِ مصر سے جو زادِ سفر پایا، وہ سارا اندوختہ گھر کی تعمیر پر صرف کر دیا۔ یوں یہ بیش قیمت کتاب اپنے کابلی والے کتب فروش سے ہمیں قسطوں پر لے کر نہ دے سکے۔۔۔ رنج وانتقام کا تقاضا تو یہی تھا کہ بِن پڑھے آج ہم ان کی کتاب پر مضمون پڑھتے مگر ایک تو ہمیں بغیر وُضو کے نماز پڑھنے کی عادت نہیں، دوسرے یہ کہ جناب ہمارے Fair Weather Friend ہیں۔ سو ان کی ایک دوسری نثری تصنیف:

''آدابِ خودآگاہی''

کا مختصر تعارف پیش کرنے پر اکتفا کرتے ہیں۔ فروری ۲۰۱۱ء میں شائع ہونے والی اس کتاب میں چونتیس (34) مضامین شامل ہیں۔ اُسلوبِ بیان کے اعتبار سے سَبک خرام ندی کی مثال، فکر ودانش کی فراوانی، بصیرت افروزی اور خردمندی کے حوالے سے ایک عمیق قلزم! یہاں صرف سات جملے Quote کر کے اپنے دعویٰ کی تائید مطلوب ہے:

- انسان اپنی عمر کے کسی مرحلے میں بھی آواز کا عادی نہیں ہو سکتا۔
- دوسروں کی غلطیوں اور عیبوں پر اندر ہی اندر شکر ادا کیجیے کہ وہ نقائص آپ میں نہیں ہیں۔
- تین انچ کی زُبان چھ فٹ کے بندے کو ہلاک کر دیتی ہے۔
- عمل کی قینچی سے فرصت کے لمحوں کو کاٹ پھینکئے!
- انسان جیسی خوراک کھاتا پیتا ہے، اس کا باطن، اُس کی سوچ اور مزاج بھی ویسا ہو جاتا ہے۔
- پَل پَل اپنا حساب رکھا جائے تو بندہ میٹھا میوہ بن جاتا ہے۔
- ایک جگہ حضرت میاں محمد بخشؒ کی نسبت سے لکھتے ہیں:

''تیرے ریتلے وجود میں سونا چھپا ہوا ہے۔ ریت کے ذرّوں میں بعض چمکتے ذرّے بھی ہوتے ہیں، سو وجود کی ریت میں سونے کے ذرّات شامل ہیں شرط یہ ہے کہ آنسوؤں کے پانی سے باقی مٹی ریت دھو ڈالیں تو پیچھے خالص سونا رہ جاتا ہے۔''

دوستو! یہ فقرے در و بست کی صنّاعی، لفظوں کے چمتکار یا تراکیب کی چکاچوندھ کے مظاہر نہیں ہیں۔ یہاں ایک گیانی حکمت و دانائی کے سرچشمے پہ بیٹھا تشنہ روحوں کو سیراب کر رہا ہے۔ ان ایک سو بارہ صفحات کو ''عطرِ تصوف'' کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ ہمیں ان سنہرے اوراق میں الہامی کلام کی مہک اور مشرق و مغرب کے حکماء و مفکرین کے شعور کا نور قدم قدم پر رہنمائی کرتا ہوا ملتا ہے۔ واضح رہے یہ پند و نصائح پر مشتمل سرمن بھی نہیں ہے کہ وہ کسی بھی طرح خود کو واعظ کے منصب پر فائز دیکھنا پسند نہیں کرتے۔ انہیں خوب ادراک ہے کہ دل کی کشاد سے بیگانہ کیسے ہی معرکے کے واقعات (Stirring Events) سے اپنے بیان یا بیانیے کو آراستہ کرے ایسے Goody Goody خطیب کا خطاب جلد ہی بھاپ کی طرح اُڑ جاتا ہے۔ اختر شمار ایسے Theophilanthropist ہیں جو یہ رمز پا گئے ہیں کہ ''اقوالِ زریں'' حفظ کر لینے سے فرد کو اداسی اور مایوسی ایسے عذابوں سے نجات نہیں مل جاتی بلکہ:

''اصل بات انسان کے دل و دماغ کو عزم و یقین کی نعمت حاصل ہونا ہے اور عزم و یقین عمل کے بغیر پختہ نہیں ہو سکتے۔۔۔''

ڈاکٹر اختر شمار نے یقیناً بہت گہرائی میں مطالعہ کرنے کے بعد زوان کا یہ مخزن دریافت کیا ہے۔ منزلِ عرفان اگر انسان کی جستجو میں کہیں شامل نہیں ہے تو اس کی زیست دابۃ الارض سے بھی کمتر نوعیت کی ہے۔ لیکن اس کتاب کے مصنف نے کمال یہ دکھایا ہے کہ بدن اور روح کی اکائیوں میں بُعد قائم کر کے موجودات کی نفی نہیں کی بلکہ ظواہرِ جسم کو بطونِ ذات کے ساتھ منسلک کرنے کی معنویت اُجاگر کر دی ہے تا کہ مادی ترقی کا ہدف حاصل کرنے کی دھن میں ہم وجود کے انمول جوہر سکون سے محروم نہ ہو جائیں۔ اور نہ اس عافیت کدے (سکون) کی حفاظت کے جنون میں رعنائیوں سے مزّین اس دنیا کی نعمتوں سے تہی رہ کر خسارا پانے والوں میں سے ہو جائیں۔۔۔ آخر ربّ کریم نے ربنّا اتنا فی الدنیا۔۔۔ کی دعا خود ہمیں سکھائی ہے۔

البتہ ایک بات بصد معذرت عرض ہے کہ اپنے اختر شمار جانے گوشت خوری کے اس قدر خلاف کیوں ہیں؟ جبکہ واقعہ یہ ہے سیانے کہہ گئے ہیں: ماس بِنا سب ساگ اور ماس کھائے ماس بڑھے اَن کھائے اوجھڑی۔۔۔ چناں چہ ہم ان سے یہ پوچھنے کی جسارت ضرور کریں گے کہ مٹن کڑاہی، چرغے، چاپنوں، ٹکا ٹک، باربی کیو، پائے، کلیجی، ران روسٹ، قیمہ، فرائیڈ فش سمیت جتنی لذیذ ڈشز ہیں کیا ان کا انکار کروا کے آپ ہمیں قیامت والے دن ہندوؤں کے ساتھ اُٹھانا چاہتے ہیں؟ گویا دنیا میں نمکین لذت سے بے نصیب اور حشر کے روز سبزی خوروں کی ہمراہی میں جہنم میں سفر! اگر۔۔۔ حکمت کا یہ ایک موتی واپس لے لیں تو ہم ان کی باقی تمام باتوں پر فی الفور ایمان لانے کو تیار ہیں!!! اور اگر نظرِ ثانی کی کوئی صورت نہیں بنتی تو بھی کوئی بات نہیں۔ ہم پکے ہوئے سیاست دانوں اور پیشواؤں کے بارے میں یہ کہہ کر خاموش ہو رہیں گے:

''سُر خیاں اُن کی مٹن ہمارے!''

- بقیہ -

براہِ راست

☆ بطور مدرس تعلیمی معیار کی بابت آپ کی رائے کیا ہے؟ ایم اے، ایم فل، پی ایچ ڈی کے طالب علم بلکہ اساتذہ کا اردو املا اور تلفظ تک خراب ہے انگریزی میں سرے سے کورے۔ ہم کدھر جائیں۔؟

☆☆ آپ کی باتوں سے سو فیصد متفق ہوں مگر مایوسی گناہ ہے۔ ہمیں اپنا نظامِ تعلیم یکساں بنانا ہوگا۔ قومی زبان کو اپنانا ہوگا۔ انگریزی کو لازماً پڑھنا ہو گا۔ تبھی یہ صورتحال بہتر ہوگی۔ اساتذہ کو مالی مشکلات سے نکالا جائے تو وہ طلبا کے لئے مثالی استاد بن سکتے ہیں۔ جب تک اچھے استاد پیدا نہیں کیے جائیں گے اچھے شاگرد سامنے نہیں آسکتے۔

☆ موجودہ وقت اور حالات کو پیشِ نظر رکھا جائے تو اردو زبان ادب اور ان سے جڑی کمیونٹی کے مستقبل کی بابت آپ کی رائے اور تجاویز ایک طرح سے شافی علاج کے زمرے میں آئے گا۔

☆☆ اردو قومی زبان کے طور پر نافذ کر دی جائے یعنی دفتری زبان بن جائے تو پھر زیادہ مایوس ہونے کی ضرورت نہیں۔ فی الوقت اردو زبان اور خاص طور پر ادب کے بارے میں تشویش کا اظہار ملتا ہے۔ معاشرے میں کتاب کلچر عام ہونا چاہیے۔ لائبریریاں پھر سے آباد ہونی چاہییں۔ ان اداروں کو اَپ ڈیٹ کیے جانے کی ضرورت ہے۔ بہترین سہولیات دی جائیں تو اردو زبان و ادب کے فروغ میں تیزی آسکتی ہے۔ اب تو اردو سافٹ ویئر آنے سے موبائل میں لوگ رومن کی بجائے اردو میں لکھنے لگے ہیں۔ ای میل تک اردو میں ہوتی ہے۔ دفتری عدالتی زبان سے مزید بہتری ہو سکتی ہے۔ اس سے نئی ملازمتیں جنم لے سکتی ہیں۔ جب تک زبان معیشت سے نہ جڑے ترقی نہیں پا سکتی۔ ہمیں اپنی زبان کے لیے بہت کچھ کرنا پڑے گا۔

خوش بختی کا ستارہ

ڈاکٹر صغرا صدف
(لاہور)

عموماً شاعروں کے خیالات حسین ہوتے ہیں ان کی شخصیت اور چہروں سے دلکشی دور رہتی ہے۔ مگر گوراچٹا، دراز قد ڈاکٹر اختر شمار واقعتاً ایک وجیہہ و شکیل شخصیت کا نام ہے۔ جس کی روشن آنکھوں میں کئی خواب سجے ہیں اور جس کے دل میں ایک دنیا آباد ہے۔ والدین نے نام کیا اعظم خان رکھ دیا اختر شمار نے اعظم بننے کی ٹھان لی۔ فارغ وقت میں خیال کی دنیا بسائے ستاروں سے باتیں کرنا اسے اچھا لگتا ہے۔ اختر شمار کو روشنی سے خاص اُنسیت ہے حالانکہ وہ خود بہت اُجلا شخص ہے پھر بھی بہت ساری روشنی کو من میں اتارنے اور تن پر اوڑھنے کی آرزو اسے آسمانوں کی طرف متوجہ کرتی ہے۔ اس نے اختر شماری شروع کی اور اختر شمار تخلص رکھا یہ وقت گزارنے یا حالات سے چھٹکارا حاصل کرنے کا ذریعہ نہیں تھا۔ بلکہ ستاروں کی طرف دیکھنے سے اونچائی کی طرف سفر کرنے کی ترغیب ملتی تھی۔ اس نے راولپنڈی کی فضاؤں میں آنکھ کھولی، ملتان میں پلا بڑھا اور پھر لاہور نے اسے اپنی طرف کھینچ لیا جس طرح لاہور اکثر صاحبِ علم وادب کو اپنی سمت بلاتا رہتا ہے۔

ادب کے اس مہینوال نے گجرات کی ایک سلیقہ شعار سوہنی کو اپنا شریکِ سفر بنایا۔ اختر شمار کو ایف۔ اے کے بعد تعلیم کا باقاعدہ سلسلہ ترک کر کے ملازمت کرنا پڑی لیکن اس نے تعلیم سے اپنا سلسلہ منقطع نہیں ہونے دیا۔ اس نے اپنے دل سے عہد کر رکھا تھا کہ اسے بہت آگے اور اوپر جانا ہے وہ چلتا رہا ستارے گنتا رہا۔ ایک دن خوش بختی کا ایک ستارہ خود اس کی مرادوں کی طشتری میں آ گرا۔ ایم اے اردو کرنے کے بعد وہ پاکستان بلکہ ایشیا کے معروف کالج گورنمنٹ کالج میں بطور لیکچرر پہنچا۔ پھر وہ رکا نہیں اس نے پی۔ ایچ۔ ڈی کی اور ایک دن ایف سی کالج میں بطور چیئرمین اردو ڈیپارٹمنٹ آ گیا۔ زندگی میں محتاط متوازن چال چلتا ہوا دھیرے دھیرے سفر جاری رکھنے والا خاموشی سے اپنی منزل کی طرف مسلسل بڑھنے والا اختر شمار خوش بختی کے ستارے کو تعویز کی صورت گلے میں ڈالے وہاں پہنچ گیا کہ اس سے بہت پیشتر سفر شروع کرنے والے بھی اس سے بہت پیچھے رہ گئے۔ بہت جلدی اس نے ایک منفرد مقام حاصل کر لیا بڑے شاعروں میں اس کا شمار ہونے لگا۔ کئی لوگوں نے اس کا راستہ روکنے اور اسے گرانے کی کوشش کی مگر وہ ارادے کی مضبوط لاٹھی سے سب کے وار پسپا کرتے آگے بڑھتا گیا۔

محتاط تو وہ کھانے اور مشاغل میں ہمیشہ رہتا ہے اس لیے کہ زیادہ کھانے سے اسے وزن بڑھ جانے اور کھلم کھلا عشق سے عزت و توقیر کی سفید چادر پر داغ لگنے کا خدشہ پسپائی کا راستہ اختیار کرنے پر مجبور کرتا ہے۔ ورنہ اس کی آمد پر بہت سی آنکھوں میں روشنی کے دیئے جلنے لگتے ہیں اور بہت سے دل اس کے لیے محبت کے جذبے محسوس کرتے ہیں لیکن وہ بچ بچا کر یا معاف کرنا کہہ کر نکل جاتا ہے۔ اور اس واردات کو شعری صورت میں ڈھال کر کتھارسسز کرتا ہے شاعری میں بھی اس کا رویہ بہت سلجھا ہوا ہے۔ وہ علامتوں کے ذریعے راز و نیاز کی باتیں کرتا ہے۔ تو قاری کے دل کو حیرت میں ڈال دیتا ہے۔

اختر شمار ستاروں کی دنیا کا فرد ہے۔ ستاروں کی دنیا رازوں اور اسراروں کی دنیا ہے۔ اور راز تو اختر شمار کے لئے حجلۂ عروسی میں بیٹھی دلھن کی طرح ہے۔ جس کا چہرہ ڈھکا ہوا ہے مگر گورے سفید حنائی ہاتھ اور چھن چھن کر نکلنے والی حسن کی شعاعیں اسکے جذبۂ دیدار کو بھڑکاتی ہیں تو وہ بے تاب ہو جاتا ہے اصل حقیقت دیکھنے کے لیے لیکن حقیقت تک رسائی صرف ظاہری آنکھوں کے ذریعے ممکن نہیں ہوتی تو آنکھ کو استعارہ بنا کر چلنے والا آنکھیں بند کر لیتا ہے اور ایک نیا جہان کے دراس پر وا ہونا شروع ہو جاتے ہیں وہ آلتی پالتی مارے گیان کی دنیا میں کھویا رہتا ہے راز چل چل کر اس کے پاس آتے ہیں اور منکشف ہو کر سرخرو ہوتے ہیں۔ وہ ان دیکھی دنیا کی اتنی ساری حقیقتیں جان لینے کے بعد بے چین ہو جاتا ہے جس طرح مرغی انڈا دینے کے لیے جگہ تلاش کرتی ہے وہ اظہار کا راستہ تلاش کرتا ہے کہ نامعلوم دنیا کے اس راز کو لوگوں پر کس طرح ظاہر کرے کہ اس کا بھرم بھی قائم رہے اور بات بھی بن جائے۔ اس کام کیلئے اس نے کئی بابے تخلیق کر رکھے ہیں جو اس کی منشاء کے مطابق کردار ادا کر کے غائب ہو جاتے ہیں اور اپنی جگہ ایک جلتا ہوا دیا چھوڑ جاتے ہیں۔ دیا جو بذاتِ خود ایک ایسی علامت ہے جس کے کئی معنی و مفہوم ہیں۔

اختر شمار خود بابا ہے اور خود ہی دیا ہے۔ ایک دیا اس کے دل میں جلتا ہے جس کی روشنی شب و روز اس کی آنکھوں میں فروزاں رہتی ہے دن کی روشنی میں سورج کی طرح اور رات کو چاند کی مانند۔

پہلی نظر میں اکھڑ، سخت مزاج اور لاپرواہ دکھائی دینے والے اختر شمار سے اگر آپ کی دوستی ہو گئی یعنی فریکوینسی مل گئی تو پتہ چلے گا صاحب کتنے نرم دل مخلص اور مثبت شخص ہے۔

وہ سادہ ہے لیکن جلیبی کی طرح سیدھا نہیں۔ لہجے میں گھن گرج، آواز میں پورا ڈرامہ موجود ہے شکر ہے کسی فلم والے کے ہاتھ نہیں چڑھا ورنہ آج ضرور ناکام ہیرو ہوتا۔ کیونکہ ہماری فلمیں ہماری سیاسی زندگی کی طرح ناکام ہیں مگر وہ کامیاب ہے مسرور ہے۔

اس کے دوست اس سے عمر میں بڑے ہیں۔ اس لیے بزرگی کے لیے اس نے خاص کاوش کر کے کئی دن بوڑھے راوی کنارے دھوپ میں اور اب نیل کے کنارے بیٹھ کر بال سفید کئے ہیں۔ اسے چھوٹا لگنے کا نہیں بڑا بننے کا شوق ہے وہ کسی حوالے سے بھی چھوٹے مفہوم کا لفظ زندگی میں نہیں آنے دیتا بھلے یہ عمر کے حوالے سے ہو، معیارِ زندگی کے حوالے سے ہو یا فن کے حوالے سے۔

باقی صفحہ ۲۵ پر ملاحظہ کیجیے

''آنکھ ٹھہری ہوئی تھی''

ڈاکٹر اشفاق احمد وِرک
(شیخوپورہ)

گذشتہ چار سو سال سے اُردو شاعری پہ شاید ہی کوئی ایسا وقت آیا ہو کہ اسے درخورِ اعتنا نہ گردانا گیا ہو۔ اگر چہ اِس عہدِ مطوّل میں اس کے مزاج، رواج اور خراج میں ان گنت تبدیلیاں ہوتی چلی گئیں۔ آج اُردو شاعری کا شجرہ ترتیب دیں تو موسیقی کی طرح کئی گھرانے، یگانے، انجانے اس کی بساط پہ براجمان دکھائی دینے لگیں گے۔ ان میں کچھ تو ایسے ہوں گے جو صدیوں کے سنگھاسن پہ ہمیشگی کی دھونی رمائے بیٹھے ہیں۔ بعضے بعضے تو ایسے بھی ہیں جو ایک ایک غزل، حتیٰ کہ ایک ایک شعر کی مونچھوں کو مروڑا دے کے اپنی دھاک کا ادراک کروانے پہ پوری دل جمعی سے مُصر ہیں۔

استادِ محترم ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا نے بجا فرمایا ہے کہ: 'فی الوقت ہماری دنیائے شاعری میں اتنا شور ہے کہ کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی۔' یہ سچ ہے کہ شعر کا شور کے ساتھ بڑا گہرا تعلق ہے۔ شاعر، واہ کا قائل ہو تو شعر شور آمیز ہو جاتا ہے لیکن اگر شاعر، آہ کی برکات پہ سجدہ ریز ہو تو شعر میں شور انگیزی در آتی ہے۔ ہماری بہت سی بدقسمتیوں کے ساتھ ایک بدقسمتی یہ بھی ہے کہ ہم شعر کی طاقت سے آگاہی حاصل نہیں کر پائے۔ ہمارے بہت سے شعرا کی سمجھ میں اتنی سی بات بھی نہیں آ پائی کہ شعر کسی کو کاٹنے، حتیٰ کہ وقت کاٹنے کے لیے بھی نہیں ہوتا بلکہ یہ تو کاٹ کے رکھ دینے کے لیے ہوتا ہے۔ شعر تو شعور کی پسلیوں سے پھوٹتا ہے، دھیان کی وادیوں میں پرورش پاتا ہے اور اگر اس میں آنکھ کی نمی اور احساس کی آنچ کی مناسب آمیزش ہو جائے تو وجدان کی راج دھانی پہ صدیوں حکمرانی کرتا ہے۔

میرا خیال ہے کہ شعر ہماری ضرورتوں اور کدورتوں کی آبیاری کے لیے نہیں ہوتا بلکہ یہ تو زندگی کی انوکھی اِمکانی صورتوں کی تصویر کاری کا عمل ہے۔ شعر، داد کی بھیک کے لیے نہیں ہوتا، یہ تو یاد کی بھیگ کے لیے ہوتا ہے۔ شاعری کی دلداری کرنے والوں کو یہ جان لینا چاہیے کہ شعر، قافیہ پیمائی کا نام نہیں، قیافہ پیمائی کا کام ہے۔ اس کے اندر کا سفر مکمل نہ ہو تو باہر دو قدم چلنے کے لیے بھی اس کے قدم من من کے ہو جاتے ہیں۔ یہ بات ہمارے آج کے شاعر کو کون بتائے کہ شعر بھاگ کے جانے کا نہیں، بھاگ جگانے کا کام ہے۔ شعر جب دھیان کی پگڈنڈی پہ ننگے پاؤں چلنا سیکھ لیتا ہے تو شاعر سے زیادہ بولتا ہے۔ ہمارے خیال میں جو شعر حواس پہ طاری اور زبان پہ جاری نہ ہو سکے وہ شاعر کی بیاض برداری تو کر سکتا ہے، کسی کی ناز برداری نہیں۔

جہاں تک ڈاکٹر اختر شمار کے شعری سفر کا تعلق ہے تو میرا خیال ہے کہ ان کی سخن سازی کا سلسلہ تیسری دھائی کی دہلیز پورے اعتماد سے عبور کر کے ادب پروری کے چوتھے ڈکیڈ میں داخل ہو چکا ہے۔ ان کے کلام کا بالاستیعاب مطالعہ کرنے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے شاعری کو لکھا نہیں بسر کیا ہے۔ ان کی دبنگ کالم نگاری میں بھرپور زمانی آگہی دکھائی دیتی ہے اور شاعری کے ذریعے وہ ادبی دنیا میں سانس لیتے نظر آتے ہیں۔ اسی طویل ریاضت کا کرشمہ ہے کہ آج اپنے ہم عصروں میں ان کی آواز الگ سے پہچانی جا سکتی ہے۔ اردو اور پنجابی کی ایک درجن کے قریب کتابیں ڈاکٹر اختر شمار کے شعری وفور اور بے پناہ عصری شعور پہ دال ہیں۔

بہت سے لوگ اس بات سے آگاہ ہیں کہ ان کے شعری سفر کی باقاعدہ ابتدا ۱۹۸۴ء میں قارئینِ ادب کو ہائیکو کی پوشاک پہ کاڑھے 'روشنی کے پھول' پیش کرنے سے ہوئی تھی۔ ۱۹۹۲ء میں انھوں نے 'کسی کی آنکھ ہوئے ہم' کی روح افزا نوید سنائی۔ ۱۹۹۳ء میں 'یہ آغازِ محبت ہے' کا مزید اقرار سامنے آیا۔ ۱۹۹۴ء میں 'جیون تیرے نام' تک نوبت جا پہنچی۔ ۱۹۹۶ء میں 'ہمیں تیری تمنا ہے' کی صورت میں یہ محبت مزید یا شدید نوعیت اختیار کر گئی۔ ۱۹۹۶ء ہی میں ڈاکٹر اختر شمار نے اپنی مادری زبان میں 'اکھیاں دے وچ دل' کا مژدہ سنایا۔ اکیسویں صدی کے پہلے ہی سال انھوں نے ایک بار پھر 'آپ سا نہیں کوئی' کی تائید کی۔ ۲۰۰۲ء میں بھی ان کے انتخاب کا لبِ لباب: 'تمھی میری محبت ہو' والا تھا۔ ۲۰۰۵ء اور ۲۰۰۷ء میں ان کے شعری 'دھیان' کی یک سوئی برابر محسوس ہوتی رہی۔ ۲۰۱۰ء میں ایک بار پھر ڈاکٹر صاحب نے پنجابی کا 'میلہ چار دیہاڑے' انجوائے کیا۔

یہاں اس بات کا اعادہ بھی ضروری ہے کہ نئی صدی کے آغاز کے ساتھ ہی ڈاکٹر اختر شمار کا رجحان شدت سے اردو نثر کی جانب بھی منتقل ہوا تو ان کے ادبی پلڑے میں 'مسلم تہذیب و فکر کا مطالعہ' (۲۰۰۲ء) 'پنجابی ادب رنگ' (۲۰۰۲ء) 'انتخابِ جمال' (۲۰۰۳ء) 'بھرتری ہری: ایک عظیم شاعر' (۲۰۰۴ء) 'مَیں بھی پاکستان ہوں' (۲۰۱۰ء) 'ہم زندہ قوم ہیں' (۲۰۱۰ء) 'ویلے دی اکھ' (۲۰۰۹ء) 'دنیا مسافر خانہ اے' (۲۰۱۰ء) 'خطوں میں دفن محبت' (۲۰۱۰ء) 'آدابِ خود آگاہی' (۲۰۱۱ء) 'موسیٰ سے مرسی تک' (۲۰۱۳ء) 'لاہور کی ادبی ڈائری' (۲۰۱۴ء) 'جی بسم اللہ' (۲۰۱۶ء) تیزی سے شامل ہوتے چلے گئے۔ پھر اسی برس ان کا پی ایچ۔ڈی کا مقالہ بھی 'حیدر دہلوی: احوال و آثار' کے نام سے کتابی شکل اختیار کر گیا۔ اور اب ۲۰۱۷ء میں وہ اپنی اس 'عاجزانہ' پیشکش کے ساتھ اُردو کی شعری دنیا میں حاضر ہیں۔ ان کی شعر نگری میں حمد، نعت، سلام، مناجات، غزل، نظم، گیت، ترانے جیسی خوش رُو اصناف کا بسیرا ہے۔ لیکن آثار و قرائن بتاتے ہیں کہ غزل کی آب و ہوا اس سرزمین کو بالخصوص راس آئی ہے۔ دیگر شعری شواہد کی مینا کاری اپنی جگہ لیکن ناقدینِ شعر و ادب کے نزدیک، غزل کے رنگ ڈھنگ ان کی ادبی پوشاک پہ سب سے فزوں گل کاری کرتے ہیں۔

غزل، جس کے ساز پہ کبھی محض محبوب کی کج ادائیوں کا راگ الاپا جاتا تھا، آج اُسی غزل کا تاج محل عشق، فلسفہ، تصوف اور انقلاب کے چار غیر

متوازی ستونوں پہ کھڑا ہے۔ ڈاکٹر اختر شمار کی غزل کا طواف بھی ان چاروں ستونوں کے گرد رواں رہتا ہے لیکن عشق اور تصوف کے دھارے میں آ کے ان کے قدم زیادہ متانت اور استقامت کے ساتھ رقص کرتے دکھائی دیتے ہیں بلکہ اگر کہا جائے کہ ان کے قلم کا علَم عشق و محبت کے مینار پہ ایستادہ ہے تو بے جا نہ ہوگا۔ ذرا انداز ملاحظہ ہو:

ہم اُس سے بچ کے چلنا چاہتے ہیں
مگر وہ خوبصورت ہے کریں کیا ؟

میرے ماتھے پہ ترا نام لکھا ہے شاید
لوگ تکتے ہیں مجھے راہ کے آتے جاتے

حسن شبنم میں ترا دیکھ کے مَیں نے جانا
یہ ہوا آئنہ بردار بھی ہو سکتی ہے

ان کی شاعری میں انقلاب کا دورانیہ اور بیانیہ محض حالاتِ حاضرہ سے آگاہی کی خبر دینے ہی کے لیے نہیں آتا بلکہ وہ وطنِ عزیز میں سچے اور سُچے انقلاب کے تہِ دل سے متمنی بھی ہیں۔ قیامِ مصر کے دوران وطن اور اہلِ وطن سے ان کی محبت، ان کے لفظ لفظ سے پھوٹتی دکھائی دیتی ہے۔ اس سرزمین میں پھیلتے یا بدخواہوں کے پھیلائے گئے انتشار اور خلفشار کو وہ اپنے دل پہ محسوس کرتے ہیں۔ ایسے میں ان کا جسم مصر میں اور دل پاکستان میں دھڑکتا دکھائی دیتا ہے۔ کچھ مثالیں:

ریزہ ریزہ ہونے لگا ہوں مَیں ہر پل
کھا جائیں گے مجھ کو پاکستان کے دکھ

رکھنا پاکستان سلامت یا اللہ!
پاک وطن کی شان سلامت یا اللہ

انقلاب کی یہ تمنا اور کوشش ان کے ظاہر و باطن میں عملی و خیالی دونوں صورتوں میں محسوس ہوتی ہے:

۔ تیرا انکار کسی وقت بھی کر سکتا ہوں
میری کمزوری کو اقرار نہ سمجھا جائے
دھیان سے دیکھیے یہ میرے کشادہ بازو
مَیں کہ دروازہ ہوں دیوار نہ سمجھا جائے

کبھی کبھی تو یہ اظہار للکار کی صورت بھی اختیار کر لیتا ہے:

پاکستان کے ٹھیکے دارو!
چور اُچکو اور زردارو
افسر شاہی کے ہرکارو
یادر کھو سرمایہ دارو!!

تھوڑے دن ہیں

آنکھیں ہمیشہ سے اُردو شاعری کا سب سے مرغوب موضوع رہی ہیں۔ اس کا سلسلہ ولی کے 'جادو ہیں تیرے نین' سے لے کے فیض کی 'دنیا میں رکھا کیا ہے' تک پھیلا ہوا ہے۔ ڈاکٹر اختر شمار کے ہاں بھی اس مرغوب موضوع کے ساتھ خاص سلوک بلکہ حسنِ سلوک روا رکھا گیا ہے۔ انداز ملاحظہ ہو:

تیری آنکھوں کو ہوں شہکار بنانے والا
سامنے بیٹھے رہو یوں ہی غزل ہونے تک
آخری دید سے یہ ہجر مکمل ہو گا
زہر بھی زہر نہیں خون میں حل ہونے تک

آنکھ ٹھہری ہوئی جب منزلِ دیدار پہ تھی
ایک ہیبت سی مسلط کسی تلوار پہ تھی

موج در موج نکل آئی ہیں آنکھیں ہر سُو
کس نے دریاؤں میں اشکوں کی شجر کاری کی

بلھے شاہ کے میلے میں وہ اِک مجذوب
آنکھیں سننے ، باتیں دیکھنے جاتا ہے

انھی آنکھوں کے اِک اشارے نے مری بگڑی بنائی ہے
انھی آنکھوں کا حصہ ہے مری دنیا بنانے میں

اُردو شاعری کے ایک معمولی قاری ہونے کے ناتے مجھے یہ تسلیم کرنے میں کوئی باک نہیں کہ جب سے مجھے شعر کی اہمیت، نوعیت اور ماہیت کا اندازہ ہوا ہے، میرے لیے شعر ڈھال اور دھمال کا ہم معنی ہو گیا ہے۔ مجھے ہر اُس شخص سے پیار ہے جو اپنے آنسو ردیف قافیے میں پرونا اور مسکراہٹیں شعر کے ہونٹوں پہ دھرنا جانتا ہے۔ مجھے اس احساس کا اظہار بھی ضروری لگ رہا ہے کہ اِس وقت جدید اُردو شاعری واضح طور پر دو خانوں میں بٹ چکی ہے۔

نمبر ا: معقول شاعر
نمبر ۲: مقبول شاعر

ڈاکٹر اختر شمار کی انفرادیت یہ ہے کہ انھوں نے مقبولیت کی دوڑ میں شامل ہونے کے باوجود، معقولیت کا دامن ہاتھ سے چھوٹنے نہیں دیا۔ پھر یہاں آخر میں یہ بات کہے بِنا بھی نہیں رہا جاتا کہ زندگی کے جن رویوں، رواجوں، رنگوں ڈھنگوں اور نشیب و فراز کا ہمیں لٹریچر کے توسط سے اِدراک ہو سکتا ہے، ان کی تفہیم کسی اور ادارے، سلسلے یا افراد کے ذریعے ناممکن ہے۔ اس لیے ہم نے اپنی موجودہ نسلوں کو لٹریچر سے دور کر کے کھویا زیادہ، پایا کم ہے۔

''عذاب آنکھوں کا''

(ڈاکٹر اختر شمار کے نظمیہ کلام سے بصد اہتمام)

عطیہ سکندر علی (سکھر)

مرا عشق ہے پاکستان

اس پہ نچھاور ہے میری کُل پونجی میری جان
اس کی مٹی سے وابستہ خواب گلاب اور جیون
اس کے ہر اک ذرے میں ہے میرے دل کی دھڑکن
اس کے رنگ و رُوپ کی خوشبو ہے میری پہچان
بھوک اور ننگ کا ساتھی، میرے آنسو پونچھنے والا
اچھے دنوں کا یار مری خوشیوں پر جھومنے والا
میرے دل اور آنکھ کی ٹھنڈک، ہونٹوں کی مسکان
مرا عشق ہے پاکستان

☆

گئے دنوں کا دُکھ

ہر شام تمام ہی فرصت ایک اُس لمحے کی
جس لمحے میں
ہر حال وہ رستہ دیکھنا ہے
جس رستے کا
ہر خواب اور دھیان طواف ہے ایک ہی چہرے کا
ہر درد عذاب اُن آنکھوں کا
جنہیں دیکھتے ہی
ہم ہوش حواس ہی کھو بیٹھیں
دل ڈولتے ہی
وہ جا بھی چکیں۔۔۔وہ کیسے رُکیں
ہم آنکھیں ملتے رہ جائیں
اس شام کا دُکھ بھی سہہ جائیں

انقلابِ مصر

(۲۵۔جنوری ۲۰۱۱ء)

جنوری کی سرد راتوں میں ٹھٹھرتی یخ ہوا۔۔۔
نیل کے ساحل کے ساتھ
گولیوں کی سنسناہٹ میں دھواں آلُود ہے
ہر طرف اِک آگ میں لپٹا ہوا بارُود ہے
کمبلوں میں ہم ٹھٹھرتے ہیں
گھروں میں قید ہیں
ہر گلی، جوں نیند میں ڈوبی ہوئی تاریک ہے
اور قاہرہ خاموش ہے
لیکن۔۔۔اُدھر اک چوک ہے
چوک ہے ''تحریر'' کا اور اہلِ مصر کا ہجوم
بچے، بوڑھے، مرد و زن سب نوجوان
تشنگی اور بھوک، سردی، خوف و ڈر سے بے نیاز
ایک جھنڈے کے تلے ہے ایک ہی نعرے کی گونج۔۔۔
ختم ہو یہ جبر کا سارا نظام
چاہتے ہیں سب عوام
انقلاب اور انقلاب
(اٹھارہ روز بعد)
ہو مبارک تیس سالہ رات کی یہ صبحِ نو
کاٹ دی زنجیر تم نے جبر و استبداد کی
رنگ لایا ہے تمہارا جنوری کا انقلاب
پاؤ گے تعبیر، تم نے دیکھ رکھے ہیں جو خواب۔۔۔
کاش پاکستان میں بھی آئے ایسا انقلاب

تیرے نام

جیون تیرے نام ستارے
جیون تیرے نام
پَل پَل تیرے ناز اُٹھاؤں
گیت سناؤں
ہو بھی جا اب رام
میری شبوں کے راج دلارے
تجھ کو پکارے
میری سوچ کی بام
تیرا رستہ دیکھ رہی ہیں
بھیگ چلی ہیں
آنکھیں صبح شام

☆

اپنے بخت سے

روشن روشن
چہروں والے
رستوں جیسے
اُجلی اُجلی
آنکھوں والے
تاروں جیسے
لوگ مجھے اچھے لگتے ہیں
روشن چہرے
اُجلی آنکھوں والے تارے
میرا دوست بنے گا؟

☆

ایک بوسیدہ کیلنڈر کی تحریر

اے کالج میں پہلے سال کے لڑکے
پیاری پیاری
میٹھی میٹھی غزلیں پڑھنے والے
دو جے سال کی نیلی آنکھوں والی کے
گُن گانے والے سن۔۔۔
اس سے قبل کہ خواب نگر کے جادو موسم
تجھ پر اپنا رنگ جمائیں
اور کھا جائیں
پیار میں خود کو جاگتے رکھنا
بھول نہ جانا
اپنے آپ کو بھولنے والے
اپنے زمانے بھول کے پتھر ہو جاتے ہیں

☆

ادھر سے گزرو تو۔۔۔

کبھی اس شہر کے رستوں کے گرد آلود پیڑوں کی خبر لینا
کبھی سوکھے ہوئے تالاب پر
بیٹھے پرندوں کی دعا سننا
کبھی ویران قبروں کے لکھے
کتوں کی تحریروں پہ آ رُکنا
کبھی خاموشیوں کے ڈاک بنگلے
کی اُداسی میں سحر کرنا
کبھی ان ریتلے ٹیلوں پہ اک انجان راہی کے نقوشِ پا
پہ چلنا اور اسی راہی کے بارے میں سوچنا کچھ پل
جہاں تیری رفاقت میں
کسی نے زندگی کے وہ سنہرے دن گزارے تھے
مگر اس وقت یہ سب کچھ بہت دلکش نظارے تھے

ہائیکو

تیری حمد و ثنا کے عالم میں
محویت جب بھی حد سے بڑھتی ہے
دل مُصلّے پہ بھول آتا ہوں

روشنی دُھول سے بہتّر کی
اب بھی ظلمت پناہ مانگتی ہے
کربلا سُورجوں کی بستی ہے

جب کبھی رات کو نکلتا ہُوں
چاندنی ذکر تیرا کرتی ہے
اشک دامن کو چوم لیتے ہیں

کُونج یادوں کی دل سے کیا گزرے
ڈار اشکوں کی آ کے کاغذ پر
راگ غزلوں کے چھیڑ دیتی ہے

موسموں کی سویٹ کلکلاری
روز چپ چاپ شام سے پہلے
دھوپ نارنگیوں پہ لکھ جائے

میں چنبیلی کو روز تکتا ہوں
تیری یادیں سزائیں دیتی ہیں
ایک مدّت عذاب سہنا ہے

چھوڑ دے آس کے کبوتر کو
ہیر کھیڑوں میں اب مقیّد ہے
کون آئے گا تیری ونجلی پر

ستاروں کی لو میں ایک گیت

تیری دھن میں تری
آرزو کو لیے
ہم ادھر چل دیئے
جس طرف خوشبوؤں کو ہوا لے گئی

اک نیا موڑ ہے
زندگی کے لیے
ہم بھٹکتے پھریں
روشنی کے لیے
کس طرف ہیں ترے
راستوں کے دیئے
ہم اُدھر چل دیئے
جس طرف خوشبوؤں کو ہوا لے گئی

جستجو میں تری
ہے ستارہ کوئی
اس بھنور میں کہیں
ہو کنارہ کوئی
ایسے منجدھار میں
کوئی کب تک جیے
ہم اُدھر چل دیئے
جس طرف خوشبوؤں کو ہوا لے گئی

☆

افسانہ

وقت کی آنکھ

۔پنجابی سے ترجمہ۔

ڈاکٹر اختر شمار

ڈاکٹر گلزار اپنے کمپیوٹر کے آگے بیٹھا آن لائن ''سائنسی کانفرنس'' میں شریک تھا۔ ایک مقالہ نگار اپنے سامعین کے سوالوں کے جواب دے رہا تھا۔

''آپ بالکل ٹھیک کہتے ہیں۔ اب آپ بہت جلد ایسا ''موبائل سیٹ'' بھی دیکھیں گے جس میں کمپیوٹر کی مکمل سہولت کے ساتھ ایسا نظام بھی ہوگا کہ انسان کو ہاتھ سے ٹائپ کرنے کی ضرورت نہیں پڑے گی بس انسان بولے گا اور کمپیوٹر کی سکرین پر تحریر خود بخود نمودار ہو جایا کرے گی۔''

ایک اور سائنس دان بولا: ''یہ تو کچھ بھی نہیں ہم ایک ایسی سم بھی تیار کرنے میں مصروف ہیں جو انگوٹھی کی طرح آپ انگلی میں لیے پھریں گے ایسی ہی سم اگر کسی دوسرے کی انگلی میں ہو تو دوسرے سے ہاتھ ملاتے ہی ایک سم کا سارا ڈیٹا دوسرے کمپیوٹر کو فیڈ ہو جائے گا۔''

کچھ دیر خاموشی طاری رہی۔۔۔ پھر ایک اور مقالہ نگار نے اپنے مقالے کا خلاصہ پیش کیا وہ کہہ رہا تھا: ''ہم بہت جلد ہر بیماری (مرض) پر قابو پانے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ اب ایک ایسا کیپسول تیار کیا جا رہا ہے جسے کھانے کے بعد چوبیس گھنٹے تک انسان کو بھوک نہیں ستائے گی بلکہ انسان بغیر کچھ کھائے پیئے خود کو چاک و چوبند اور چُست محسوس کرے گا۔ یہ ''کیپسول'' متوازن غذا اور توانائی کا ایک ایسا جدید ٹانک ہوگا جو انسان کو دال روٹی کے چکر سے بھی نکالنے میں معاون ثابت ہوگا۔ اُس وقت دنیا کیا ہوگی یہ تو علم نہیں البتہ یہ ضرور ہے کہ پیٹ کا دوزخ بھرنے کا مسئلہ ہمیشہ کے لیے حل ہونے کے بعد دنیا جنت کا نمونہ بن سکتی ہے۔ کیونکہ اس مسئلے کے حل کے بعد ہر شخص محبت اور دوسرے کی خدمت کے لیے جینے کی کوشش کرے گا۔''

اب سامعین میں سے ایک آواز آ رہی تھی: ''یہ تو بہت خوشی کی خبر ہے کہ لوگ دال روٹی کے چکر سے آزاد ہو جائیں گے لیکن اس وقت طاقت اور اختیار کے بھوکے اپنی بادشاہی کے لیے شاید کوئی نیا راستہ نکال لیں۔''

ڈاکٹر گلزار نجانے کب سے یہ باتیں سن رہا تھا اس سے رہا نہ گیا اور اس نے بھی ایک سوال داغ دیا:

''دنیا کے عظیم سائنس دانو! انسان کی بیماری اور اس کے دیگر مسائل پر قابو پانے والو! میرا بھی ایک سوال ہے اس پر بھی غور کریں کہ سائنس کو انسان کے بارے میں بھی سوچنا چاہیے کیونکہ انسان سے بڑا کوئی معجزہ نہیں ہے۔ انسان بھی ایک کمپیوٹر مشین ہے بلکہ یہ کمپیوٹر سے بھی بڑھ کر ہے۔ ہمیں اس پر غور و فکر کرنی چاہیے کہ انسان کون ہے اور یہ کہاں سے آ کر کہاں چلا جاتا ہے؟ اسے سوچ کہاں سے آتی ہے؟ اس کے بدن میں ایسا کون سا ''انٹینا'' ہے جو خیال کے سگنل کیچ Catch کرتا ہے۔ اس سوچ کا مرکز کہاں واقع ہے؟ اگر سائنس دان اس پر ''فوکس'' کریں تو شاید انسان کی اصل کا سرا بھی ہاتھ آ جائے اور انسان کی حقیقت کا راز فاش ہو جائے۔ دوستو! یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ انسان کو سوچوں کے ذریعے کنٹرول کرنے والی کوئی طاقت موجود ہو۔ اگر اس کنٹرول روم کا پتہ چلا لیا جائے تو انسان جو اس دنیا کا عظیم ترین راز ہے خود بخود آشکار ہو جائے گا۔''

ڈاکٹر گلزار کے ساول پر ایک سناٹا چھا گیا تھا۔ کافی دیر تک کانفرنس روم میں خاموشی پھیلی رہی۔ پھر منتظمین میں سے ایک صاحب نے ڈاکٹر گلزار سے اپنا مکمل ''سی وی'' ارسال کرنے کی فرمائش کی۔ ڈاکٹر گلزار نے جھٹ اپنا CV ارسال کر دیا۔ کچھ دیر بعد اسے دعوت نامہ ارسال کیا گیا جس کے مطابق اسے اگلے ماہ منعقدہ ہونے والی عالمی کانفرنس میں مدعو کرنے کے ساتھ دنیا کی عظیم سائنسی لیبارٹری میں کنٹریکٹ دینے کا اعلان تھا۔ کانفرنس میں شرکت کرنے وہاں قیام اور آنے جانے کے تمام اخراجات ''عالمی لیبارٹری'' کے ذمے تھے۔ ڈاکٹر گلزار نے دعوت نامہ وصول کر لیا۔ کچھ دیر بعد کانفرنس کے اختتام کا اعلان کر دیا گیا۔ گلزار نے کمپیوٹر بند کر دیا وہ سوچ رہا تھا کمپیوٹر نے انسان کو بھی مشین بنا دیا ہے۔ اس کے اعصاب شل ہو چکے تھے اب اس نے جسم ڈھیلا چھوڑ کر آنکھیں موند لیں ۔۔۔ ڈاکٹر گلزار نفسیات میں پی ایچ ڈی تھا اور یونیورسٹی میں بطور پروفیسر خدمات سرانجام دے رہا تھا۔ دنیا میں ایک چھوٹی بہن اور خالہ کے سوا اس کا کوئی نہیں تھا۔ بہن شادی کے بعد سسرال جا بسی تھی اور وہ بوڑھی خالہ کے ساتھ رہ رہا تھا۔ خالہ کئی بار اسے گھر آباد کرنے کا کہہ چکی تھی مگر ہر بار وہ یہ کہہ کر ٹال دیتا کہ مرد کو چالیس برس بعد کوئی لڑکی مشکل سے پسند آتی ہے۔ اگر پسند آ بھی جائے تو اس کے عادات و اطوار پسند نہیں آتے۔۔۔ اب کوئی حور پری دانشور قسم کی لڑکی کہاں سے میسر آئے۔ ہاں اگر ایسی لڑکی مل گئی تو وہ شادی ضرور کرے گا۔

ڈاکٹر گلزار اپنے شعبے کا ایک لائق فائق پروفیسر تھا۔ ویسے تو وہ کئی ممالک کے سیمیناروں اور کانفرنسوں میں شرکت کر چکا تھا مگر دنیا کے چوٹی کے سائنسدانوں اور ان کی انٹرنیشنل لیبارٹری میں کام کرنے کی آفر اس کی بہت بڑی کامیابی تھی۔ وہ اپنے آپ کو دنیا کے عظیم ترین سائنسدانوں میں شامل دیکھ رہا تھا۔ وہ جیسے ہواؤں میں اُڑ رہا تھا کہ اچانک ایک خوبصورت ائیر پورٹ اس کے سامنے تھا۔ اسے ایک گنجے سر والا انگریز خوش آمدید کہہ رہا تھا۔ اب وہ ایک لمبی لیموزین کار میں بیٹھ چکا تھا اور گاڑی فراٹے بھرتے ہوئے لمبی سڑک پر دوڑ رہی تھی۔ ارد گرد اونچے اونچے پلازے اور عمارات دکھائی دے رہی تھیں۔ سرسبز شاداب پھولوں سے بھرے ہوئے پارک سڑک کے ساتھ ساتھ اسے بہت بھلے لگ رہے تھے۔ سڑک پر ٹریفک کا کہیں کوئی نام و نشان نہ تھا، کہیں بھی کوئی گاڑی یا کار اسے

دکھائی نہ دی۔۔۔یوں لگ رہا تھا جیسے وہ ایک خالی شہر میں آ چکا تھا۔آخر کار اس سے نہ رہا گیا۔۔۔اس نے گنجے سر والے انگریز سے پوچھا۔کیا آج شہر میں ہڑتال ہے کہیں کوئی گاڑی دکھائی نہیں دیتی نہ ہی کوئی انسان نظر آتا ہے؟

''ہاں،اس شہر میں کوئی انسان نہیں ہے۔'' گنجے سر والے انگریز نے پیچھے دیکھے بغیر آرام سے جواب دیا تو وہ حیران رہ گیا۔''لیکن کیوں'' اس نے دوسرا سوال کر دیا۔''وہ اس لیے کہ یہ شہر کچھ عرصہ قبل گیس بم بمباری سے تباہ ہو چکا ہے۔گیس بموں نے شہر کے تمام انسان ہلاک کر دیے ہیں البتہ شہر کی عمارات اور دیگر اشیاء جوں کی توں سلامت ہیں۔'' ڈاکٹر گلزار کے سر پہ جیسے آسمان گر پڑا تھا۔ کیا؟۔۔۔اسے اپنی آواز دُور سے آتی سنائی دے رہی تھی۔تو کیا اس شہر میں اب کوئی انسان موجود نہیں؟اس نے پوچھا تو جواب ملا۔

''بارہ سائنس دانوں اور ان کے عملے کے سوا اس جزیرے پر کوئی انسان موجود نہیں'' گنجے سر والا انگریز یہ تفصیل دے کر کار سے باہر دیکھنے لگا۔ڈاکٹر گلزار کے دل میں جیسے بھونچال آ گیا تھا۔کار ایک بہت بڑے محل کے پورچ میں رُک گئی تھی۔اسے ایک نہایت خوبصورت ڈرائنگ روم میں بٹھایا گیا تھا۔کچھ دیر بعد ایک گورے اور اس کے ساتھ ایک نیلی آنکھوں والی میم نے گلزار کو خوش آمدید کہتے ہوئے کہا''میرا نام جوزف ہے اور یہ روزی ہے،روزی آپ کی خدمت میں حاضر رہے گی'باقی کے تمام معاملات اور آپ کا شیڈول سب کچھ روزی آپ کو سمجھا دے گی۔اب آپ سے کل ملاقات ہو گی۔''

جوزف چلا گیا تو نیلی آنکھوں اور سنہری بالوں والی گوری چٹی میم کہنے لگی۔ڈاکٹر گلزار چلئے میں آپ کو آپ کی خواب گاہ دکھا دوں۔آپ کچھ دیر آرام کر لیں۔اب وہ ایک خوبصورت کمرے میں تھا۔''آپ کا نام روز ہے'' ڈاکٹر گلزار نے روز سے بات کا آغاز کیا۔Yes Sir روز نے جواب دیا۔آپ کو علم ہے روز ہماری زبان میں کس کو کہتے ہیں؟Every Day پر آپ تو گلاب سے بھی زیادہ خوبصورت ہیں۔اوتھینکس روز مسکرائی۔روز نے فریج میں سے جوس نکالا اور گلزار کے آگے رکھ دیا اور بولی آپ کچھ دیر آرام کر لیں پھر میں آپ کو سارا محل دکھاؤں گی۔آپ یہ موبائل رکھ لیں جب بھی میری ضرورت ہو بس یہ بٹن دبا دیں میں آپ کے بہت قریب ہوں۔روز نے اپنی بات مکمل کی اور اچانک کمرے سے باہر نکل گئی۔

ڈاکٹر گلزار اس کے حسن کے خمار میں ڈوبا ہوا تھا۔وہ سوچ رہا تھا کہ ایسی آنکھیں اور سنہری کرنوں کی طرح چمکتی زلفیں اس نے دنیا میں کہیں نہیں دیکھیں۔اس نے اٹھ کر ٹی وی آن کیا جہاں کوئی سائنسی فلم چل رہی تھی۔اس نے ٹی وی بند کر دیا۔اب اس نے کھڑکی کا پردہ سرکایا اور باہر دیکھا،سامنے ایک پہاڑی سلسلہ تھا ساتھ ہی ایک آبشار دکھائی دے رہی تھی۔پارک میں ہر طرف پھول ہی پھول تھے کیا شاداب خطہ ہے۔اسے محسوس ہوا جیسے وہ کسی جنت کے ٹکڑے میں آ گیا ہے،نجانے کیوں اس نے اچانک موبائل پُش کر دیا،بٹن دبتے ہی روز سامنے آ گئی اسے محسوس ہوا جیسے روز دروازے کے ساتھ ہی کہیں موجود تھی۔اس نے مسکرا کے روز کی طرف دیکھا اور کہا''کہیں باہر نہ چلیں۔یہاں بوریت محسوس کر رہا ہوں۔''Why Not its Ok اب وہ ایک خوبصورت پارک میں تھے۔اور بادل انہیں چھو کر گزر رہے تھے۔ٹھنڈی ہوا نے ڈاکٹر گلزار پر خمار سا طاری کر دیا تھا اسے روز کی سنہری بکھری ہوئی زلفیں اور بھی خوبصورت لگ رہی تھیں۔ایک بینچ پر بیٹھتے ہوئے گلزار نے کہا۔اس علاقے میں کس قدر خاموشی اور تنہائی ہے،آپ کا دل یہاں کیسے لگا ہوا ہے؟ہم اس تنہائی کے عادی ہیں ویسے بھی ہمارے پاس سوچنے کے لیے وقت نہیں ہے۔روز نے دھیرے سے جواب دیا۔اچھا روز یہ بتائیں اس شہر میں کتنے لوگ موجود ہیں۔ڈاکٹر گلزار نے اپنی معلومات میں اضافہ چاہا تو روز بولی:''لیبارٹری کے عملے کے علاوہ یہاں کوئی انسان نہیں ہے،اصل میں نیوٹران بمباری کے بعد اس شہر کو بسانے کی کوشش نہیں کی گئی۔'' تو کیا نیوٹران بمباری نے لیبارٹری کے عملے اور سائنسدانوں کو کچھ نہیں کہا؟لیبارٹری بم پروف ہے یہاں تو ہوا بھی پر نہیں مارتی۔روز کی باتیں گلزار کو حیران کر رہی تھیں۔روز نے کہا اب چلئے۔آپ کا انتظار ہو رہا ہے۔

کھانے کی میز پر آٹھ لوگ موجود تھے پہلے تعارفی مرحلہ طے کیا گیا۔ڈاکٹر ڈیوڈ نے اپنا اور اپنی ٹیم کا تعارف کرایا اور ڈاکٹر گلزار کو بتایا کہ کل پہلے سیشن میں ہم آپ کے خیالات سنیں گے،ہم آپ کو اپنے ساتھ کام کرنے کے لیے دو سال کا کنٹریکٹ دے سکتے ہیں۔لیکن آپ پہلے کچھ دن یہاں رہ کر دیکھ لیں۔ڈاکٹر گلزار نے کہا دراصل میں اس شہر کی تنہائی پر حیران ہوں؟حیران ہونے کی کوئی بات نہیں۔یہاں آپ کے آرام کا ہر طرح سے خیال رکھا جائے گا،آپ بھی ہماری طرح چند روز میں اس ماحول کے عادی ہو جائیں گے۔ہم بھی یہاں کے باسی نہیں ہیں۔آپ سات روز ہمارے مہمان ہیں۔تین دن آپ کے سیر وتفریح کے ہیں،آپ چل پھر کر ہمارا جزیرہ دیکھیں جگہ جگہ سائنسی کمالات کے کرشمے ملاحظہ کریں اور لطف اٹھائیں۔کھانے کے بعد سارے دانشور رخصت ہو گئے۔

اگلے دو روز اس نے لیبارٹری میں گزارے۔اسے سچ بتایا گیا تھا، لیبارٹری کی ہر شے دیکھ کر وہ حیران تھا۔اسے وقت گزرنے کا احساس ہی نہ ہوا۔ شام کو وہ روز کے ساتھ محل کے پھولوں بھرے پارک میں تھا ایسے پھول اس نے زندگی میں پہلے نہ دیکھے تھے۔

اس نے روز سے پوچھا۔

معاف کرنا مجھے جلد بے تکلف ہونے کی عادت ہے۔کیا میں تمہیں روزی کہہ سکتا ہوں۔

Sure کیوں نہیں۔۔۔روز نے جواب دیا۔

ڈاکٹر گلزار بولا روزی مجھے یہاں دو سال تک رہنے کی پیشکش کی گئی ہے۔لیکن یہاں کی تنہائی مجھے عذاب کی طرح لگ رہی ہے البتہ''روزی'' کے

لیے یہاں دوسال گزارے جاسکتے ہیں۔۔۔ سچی روزی اس تنہائی میں تیرا روپ میرے لیے آکسیجن سے کم نہیں ہے۔خدا کی قسم اگر تم یہاں نہ ہوتیں تو میرا کب کا دم نکل چکا ہوتا۔روز اس کی باتوں پر انگشت بدنداں تھی وہ حیرت سے اسے دیکھے جا رہی تھی۔ڈاکٹر گلزار بولا روزی میں نے بہت سی کانفرنسیں دیکھی ہیں کئی ممالک میں جاچکا ہوں وہاں کی خواتین سے ملاقات رہی ہے لیکن تم جیسا حسن میں نے دھرتی پر کہیں نہیں دیکھا۔روزی میں اپنے دل کی حالت کیسے بیان کروں، کیا کبھی پانی نے بھی اپنی پیاس چکھی ہے؟ روزی تمہاری آواز میں عجیب سا جادو ہے جو مجھے مدہوش کیے دیتا ہے، میں نے جب سے تمہیں دیکھا ہے اپنی ساری دانش فراموش کر بیٹھا ہوں۔'' آپ کیسی باتیں کررہے ہیں۔۔۔روزنے گلزار کی ساری باتیں ان سنی کرتے ہوئے کہا۔۔۔''مجھے خود بھی علم نہیں نجانے میں تیرے ریشمی خیالوں میں کیا کہے جاتا ہوں، مجھے ڈر ہے کہیں میں تیری آس میں مہندی کا بوٹا (پودا) نہ بن جاؤں۔نجانے کیوں آج میں بادل بادل رونا چاہتا ہوں۔وطن سے دور یہاں میں اس تنہائی کے خواب جزیرے میں اکیلے کبوتر کی طرح اُڑتا پھرتا ہوں، روزی کبھی تمہاری نیند اُڑی ہے؟''

No ناٹ ایٹ آل۔۔۔ مجھے نیند نہیں آتی۔روز نے جواب دیا۔ یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟ اچھا یہ بتاؤ تمہیں کبھی کوئی اچھا لگا ہے۔ڈاکٹر گلزار نے روز کے قریب ہوکر پوچھا۔''سبھی اچھے ہیں'' روز نے برجستہ جواب دیا۔۔اب گلزار نے خود ہی روزی کا ہاتھ تھام لیا لیکن یہ ہاتھ تھا یا برف کی سِل۔۔۔روزی کا ہاتھ تھام کر اسے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ کسی عجیب مخلوق کا ہاتھ دیکھ رہا ہے۔روزی کے ہاتھ پر کوئی لکیر نہیں تھی، وہ حیران ہو رہا تھا۔اس نے روزی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔جو بالکل خالی تھیں۔اس نے آہستہ سے روزی کا ہاتھ دبایا روزی کے چہرے پر کوئی تاثر نہ ابھرا، ڈاکٹر گلزار نے روزی کا ہاتھ قدرے زور سے دبا کر پوچھا۔روزی یہ بادامی پھولوں کی خوشبو اور گھاس کی ہریالی میرے لہو میں گھل گئی ہے۔پلیز مجھے اپنی روشنی میں شامل کرلو۔میرے بدن کی ریت مزید ٹوٹنے سے قاصر ہے۔تو اس پیاسی ریت پر اپنی پیاس کا صدقہ اتار دو۔۔۔ڈاکٹر گلزار ایک عجیب نشے میں تھا۔وہ روزی کو آنکھوں میں بھر لینا چاہتا تھا۔۔''روزی کیا میں اَن سلا کرتا ہوں یہ تم مجھے کس دھاگے سے سینا چاہتی ہو؟ کبھی تم مجھے میری آنکھوں کا آسمان لگتی ہو۔ میں تمہاری نیلی آنکھوں میں اپنا نام تحریر کرنا چاہتا ہوں۔''

میرا خیال ہے آپ کے آرام کا وقت ہوگیا ہے۔روزی نے اٹھتے ہوئے کہا۔ڈاکٹر گلزار نے اس کا ہاتھ کھینچ کر دوبارہ بٹھانے کی کوشش کی۔اسی اثنا میں ایک کالا کلوٹا حبشی سامنے آ گیا، اس کا ہاتھ چھوڑ دیں اُس کی آنکھوں سے آگ ٹپک رہی تھی۔''لیکن تم کون ہو'' ڈاکٹر گلزار نے پوچھا تو وہ بولا''آپ بہت آگے بڑھ رہے ہیں۔''

اب ڈاکٹر گلزار کی مردانگی جاگ اُٹھی تھی۔''کیا تم اس کے مامے لگتے ہو جو مجھے روک رہے ہو۔چلو بھاگو یہاں سے۔ہمارا جو دل چاہے گا کریں گے۔'' ڈاکٹر گلزار نے بے نیازی سے جواب دیا۔''میں نے آپ سے کہا ہے آپ کے جانے کا وقت ہوگیا ہے'' حبشی دوبارہ بولا۔اب روزی اٹھ کھڑی ہوئی۔ ڈاکٹر گلزار نے اسے دوبارہ کھینچا چاہا۔کالا کلوٹا شخص ڈاکٹر گلزار پر جھپٹ پڑا، ڈاکٹر نے اسے بالوں سے گرفت میں لے لیا۔حبشی بول رہا تھا۔آپ سے کہا ہے اس کا ہاتھ چھوڑ دیں اسے مت کھینچیں مزید آگے نہ بڑھیں۔''پر تمہیں کیا تکلیف ہے؟'' ڈاکٹر گلزار نے اس کے بالوں کو زور سے کھینچتے ہوئے کہا۔کالا شخص بولا:''یہ آپ کی محبوبہ نہیں یہ محض ایک روبوٹ ہے'' ڈاکٹر گلزار کو بجلی کا جھٹکا لگا۔اس کی آنکھیں باہر آ گئیں۔اس نے دیکھا اس کے ہاتھ میں اپنے بال تھے اور اس کا سر چارپائی سے نیچے ڈھا کا ہوا تھا۔

☆

- بقیہ -

''محبت علم کا ماتھا ہے''

کے استعارے بڑے خلوص اور قرینے سے استعمال کرتا ہے اور بالیقین اِنکے مطالعے سے قارئین کے فکر و نظر کے اُفق زمان و مکاں کے آخری کناروں تک پھیلتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں اور ان کی روحوں کے آنگن میں دردِ محبت کی چاندنی نور و خوشبو بن کر تراوش کرنے لگتی ہے۔

تنہی میری محبت ہو کے اشعار کی کہکشاں میں ایسے نور پارے بھی آپ کو 'لشکاں' مارتے ہوئے ملیں گے جن میں ضرب المثل اور کہاوت کی سی روانی و جوانی موجود ہے۔بعض غزلیں سہل ممتنع (یعنی دیکھنے میں آسان و سادہ مگر کہنے میں بے حد مشکل) کی چاندنی سے روشن ہیں۔ایسی چاندنی ہمیں میر و غالب، آتش و داغ اور حالی و اقبال کے کلامِ بلاغت نظام میں دیکھنے اور لطف و اندوز ہونے کو ملتی ہے۔

☆

''اشکوں کے چراغ''

محمد انعام الحق (اسلام آباد)

اختر شمار دور جدید تر کا ایک ایسا غزل گو ہے جو مسائل حیات پر غور وفکر کرنے سے خوف زدہ نہیں ہے اور جو اس غور وفکر کو غزل کی زبان میں قاری تک پہنچانے پر قدرت رکھتا ہے۔ یہ درست ہے کہ شاعری محض فکر وفلسفہ نہیں ہوتی مگر یہ بھی دوست ہے کہ جب فکر وفلسفہ کو شاعری کا طلسم مس کرتا ہے تو شاعری میں گہرائی پیدا ہو جاتی ہے۔ اختر شمار کے ہاں سوچ کی یہ گہرائی جگہ جگہ خوبصورتی سے اظہار پاتی ہے اور جدید تر غزل میں یہ اسلوب نہایت درجہ خوش آئند ہے۔

احمد ندیم قاسمی

اختر شمار کی پنجابی شاعری میں ''انتظار'' جا بجا بکھرا ہوا ملتا ہے جبکہ ''اکھیاں دے وچ دل'' اس نوجوان کی پنجابی شاعری کا پہلا مجموعہ ہے جس میں نظمیں زیادہ ہیں اور غزلیں کم۔ اور یہ اچھی بات اس لیے بھی ہے کہ اس کی نظمیں بہرحال غزلوں پر بھاری ہیں جبکہ اس کی اردو غزلیں اپنے طور پر قابل ذکر ہیں۔ نظمیں زیادہ تر مختصر اور بے حد مختصر بھی ہیں اور یہ رجحان بجائے خود پسندیدہ ہے کیونکہ لمبی نظم کا شاید اب زمانہ بھی نہیں رہا۔

ظفر اقبال

میرے خیال میں یہ اختر شمار کی قبولیت دعا کا لمحہ ہے کہ دعا اور اس کی قبولیت کے بھی مختلف روپ ہوتے ہیں۔ چنانچہ اس کی شاعری ایک اچھوتی خوشبو کی طرح صفحۂ قرطاس پر ابھری ہے اور پڑھنے والے کو اپنے دل پر بارش کی طرح اترتی محسوس ہوتی ہے۔ دل کے موسم پر چھانے والے وہ مناظر جو نظر نہیں آتے اور دل میں اتر جانے والی شاعری ایک ہی حقیقت سے وابستہ اسرار ہیں اور ان حقیقتوں کا اظہار اسرار ہی میں ہوتا ہے۔ اختر شمار کی کامیابی یہی ہے کہ اس نے دھند میں لپٹی ہوئی حقیقت تک پہنچنے کے لیے شاعری کے اسرار تک رسائی حاصل کر لی ہے۔

عطاء الحق قاسمی

محبی ڈاکٹر اختر شمار صاحب۔ دعائیں۔

برسوں بعد ایک مسرّت انگیز اور وجد آفریں خوش خبری سُنی کہ آپ نے میرے استادِ گرامی خیام الہند سیّد جلال الدین حیدر دہلوی مرحوم پر پی۔ ایچ۔ ڈی کر لی ہے اور نوٹیفکیشن جاری ہو گیا ہے۔ یہ وہ معرکہ ہے جس کو کوئی دوسرا سر نہیں کر سکا اور آپ نے سر کر لیا۔ یہ ایک اہم ادبی فریضہ تھا اس وقت میرے محسوسات یہ ہیں کہ یہ کام صرف آپ ہی نے سرانجام نہیں دیا بلکہ استاد حیدر کے تمام پرستاروں نے یہ ڈگری حاصل کی ہے۔ میری طرف سے ہدیۂ تبریک قبول کریں۔ آج شام کو استاد کے قدِ آدم کلر ڈ پورٹریٹ پر پھولوں کا ہار چڑھاؤں گا اور گھنٹوں اُن سے باتیں کروں گا۔ یہ پورٹریٹ غزالی نے بنا کر دیا تھا۔ آپ نے تو اگلے پچھلے تمام گلے شکوے دُور کر دئے۔ مزید مبارک آپ کے منہ میں گھی شکر اور آپ کے قلم کو دھن بھاگ۔

بیدل حیدری

مکرمی، سلام مسنون۔

آپ کا مکتوب مورخہ یکم ستمبر موصول ہوا۔ اور ساتھ ہی ''جنگ آمد'' کا ایک شمارہ بھی۔ ان عنایتوں کے لیے ممنون ہوں۔

افسوس کراچی کے حالات کی وجہ سے آپ سے ملاقات کی کوئی صورت پیدا نہ ہو سکی۔ طالب دہلوی کی کتاب کا عکس میں نے بنوالیا ہے۔ آج کل لاہور کے رفاقت علی شاید کراچی میں ہیں۔ اگلے دو تین روز میں واپس جا رہے ہیں۔ یہ عکس ان کے حوالے کر دیا ہے وہ آپ کی خدمت میں پیش کر دیں گے۔

بمبئی والے حیدر دہلوی کا مجموعہ کہیں نظر آ گیا تو مطلع کروں گا۔ پرانے رسالوں میں خیام الہند کے بارے میں کوئی چیز نظر آئی تو اس کا عکس بھجوا دوں گا۔ خدا کرے آپ خیریت سے ہوں۔

مشفق خواجہ

برادرِ عزیز ڈاکٹر اختر شمار صاحب۔

بالآخر آپ نے ڈاکٹریٹ کی مہم سر کر لی۔ دلی مسرت ہوئی۔ اللہ مبارک کرے اور آپ کو سدا اس سندِ اعزاز و اعلیٰ کا مستحق بنائے رکھے۔

بالکل ابتدائی منازل سے آخری مراحل تک مجھے آپ نے اس معاملے میں دخیل رکھا۔ اس لیے مجھے خوب خوب اندازہ ہے کہ آپ روّیوں کی کس درجہ بدصورتی سے دوچار ہوئے اور نتیجتاً عمرِ عزیز کے کتنے قیمتی برس اور غیر یقینی کے عالم میں برباد ہوئے۔ آپ کے دل پر ملالِ کدورت کا ہونا بالکل فطری ہے۔

اس لیے ایک بات بہت زور دے کر کہتا ہوں کہ ''نفرت بُرائی سے کرنی چاہیے، بُروں سے نہیں'' اُمید ہے میری اس بات کو آپ مناسب اہمیت دیں گے۔ اس کے برعکس آپ کا طرزِ عمل ہوا تو یہ صلاحیت کُش ہوگا۔ کیا عجب ''اغیار'' یہی چاہتے ہوں۔ آپ اس دام سے بچیں اور بلند رہیں۔ ان ''اصحاب'' کی زندگیاں معلوم نہیں کیسی کیسی محرومیوں اور نفسی پیچیدگیوں کا مرکب رہی ہوں جہاں اس راہ میں آپ کا بدی کے مجسم نمونوں سے سامنا ہوا، وہاں کچھ بھلوں سے بھی آپ کا سابقہ پڑا ہوگا۔۔۔ اس آخری بات کو انعامِ ربانی جانیے۔ بدوں کے تعاقب میں اپنی صلاحیتوں کو ضائع کرنے کا دھیان بھی دل میں نہ لائیں۔۔۔ اور بُروں کو اپنے حافظے کا بوجھ بالکل نہ بنائیں۔۔۔ ان پر تو زیادہ سے زیادہ ترس کھایا جا سکتا ہے، اور بس۔

ڈاکٹر معین الرحمٰن

اختر شمار تعارف کے محتاج نہیں۔ اختر شمار کا شمار آج کے اچھے تخلیق

کاروں میں ہوتا ہے۔خوب یاد نہیں آپ سے ملتان میں ملاقات ہوئی ہو آپ نے اشعار سے لطف اٹھایا ہے اور داد دی ہیں۔آپ کی ہائیکو کا ذکر بھی منیر نے اپنے کسی مضمون میں کیا ہے۔غرضیکہ میں آپ کی تخلیقات سے مستفید ہوتا رہتا ہوں اور اختر شمار کے نام اور کام سے خوب آشنا ہوں۔

فرمان فتح پوری

اختر شمار بیک وقت بہت تلخ اور بہت شیریں شاعر ہے اور یہ دونوں رویے اس کے ہاں بڑی تیزی سے تبدیل ہوتے ہیں۔یوں محسوس ہوتا ہے کہ اس کے پاس درمیان کا کوئی راستہ نہیں۔وہ جھوٹ کو جھوٹ اور سچ کو سچ کہتا ہے۔محبت سے محبت اور نفرت سے نفرت کرتا ہے۔غلط کو غلط اور صحیح کو صحیح کہتا ہے اور ایسا کرتے ہوئے کہیں اس کا لہجہ بہت واضح اور کہیں طنز آمیز کاٹ سے ہمکنار ہوتا ہے۔وہ جب حق گوئی کو خلافِ صداقت شمار کرتا ہے تو دراصل معاشرے کے اس دکھ کو محسوس کرتا ہے جہاں سچ بات کہنا جرم تصور کیا جاتا ہے۔وہ خود تو سچ کی فصل بوتا ہے مگر اسے نفرت شمار کرنے کو کہتا ہے۔آخر کیوں؟ کیا وہ ایسے معاشرے میں زیست بسر تو نہیں کر رہا جہاں سچ کی فصل کو کاٹنے والا کوئی نہیں؟ جہاں آہ بھرنے کو بھی بغاوت شمار کیا جاتا ہے۔تلخ معاشرتی رویوں کو طنز آمیز پیرائے میں بیان کرتے کرتے اچانک اختر شمار اس معاشرے سے ہم کلام ہوتا ہے جو ایک سچے شاعر کا فریضہ انجام دیتا نظر آتا ہے۔وہ اسے بتاتا ہے کہ دستار وجہِ فضیلت نہیں کہ یہ اُتر بھی سکتی ہے۔اس کی سوچ اس کے لہو میں دوڑ رہی ہے۔اسی باعث اس کے لہو کا ہر ہر قطرہ ایک تازہ سوچ اور نئی قیادت کو وجود میں لانے کا باعث بنتا ہے۔

ڈاکٹر عارف ثاقب

اختر شمار کا شمار ان خوش نصیب قلمکاروں میں ہوتا ہے جو اشاعتی دوڑ میں شامل نہیں ہوئے بلکہ انہوں نے محنت، ریاضت اور غور و فکر کو شعار بنایا۔اب تک ان کے پانچ مجموعے منظرِ عام پر آ چکے ہیں اور ان کے ہر مجموعے سے ان کے شعری سفر کے مختلف مراحل سے مترشح ہوتا ہے کہ انہوں نے لحہ بہ لحہ اپنی تخلیقی صلاحیت کو سنوارنے اور نکھارنے میں خونِ جگر صرف کیا ہے۔

اسلم کولسری

اختر شمار کو ان خوب صورت شاعروں میں شامل کرنا چاہیے جنہیں میں اپنے ہاتھ کی انگلیوں پر گن سکتا ہوں۔ان کی شاعری میں فضا کے دھنک کے رنگ بھی ہیں اور مٹی کی سوندھی مہک بھی۔۔۔اختر شمار نئی شاعری کے آسمان اور زمین کے درمیان اپنا توازن برقرار رکھنے والے خوب صورت شاعر ہیں۔ہمارے عہد میں محبت کرنے والوں کی اس قدر کمی ہو رہی ہے کہ محبت کی شاعری بھی کسی عہدِ گزشتہ کی بازگشت معلوم ہوتی ہے۔اس صورتِ حال میں اختر شمار کا مجموعۂ کلام ''ہمیں تیری تمنا ہے'' شعری ادب کے باطن میں محبتوں کا دروازہ کھولتا ہے۔کیا ہمیں اس دروازے میں داخل نہیں ہونا چاہیے؟

نذیر قیصر

اختر شمار کا یہ مجموعہ میرے خیال میں ان امکانات کی یافت اور تسخیر کا منظر نامہ ہے جن کی جھلک اس کی پہلی کتاب میں بار بار چہرہ نما ہوتی رہی ہے۔تسلسل کا یہ عمل اس کے افکار اور موضوعات تک ہی محدود نہیں، اسلوب اور طرزِ ادا بھی اسی لڑی میں پروئے ہوئے نظر آتے ہیں۔جدید غزل میں ایمائیت کے حوالے سے جو نئی لسانی تشکیلات اور تمثال کاری کا عمل جاری ہے اور جس طرح الفاظ اور تراکیب کو نت نئے تناظر میں پیش کرنے کی کاوشیں ہو رہی ہیں اختر شمار بھی ان میں بساط بھر اپنا حصہ ڈال رہا ہے کہیں کہیں وہ جدید ہونے کی کوشش میں ابلاغ کے مروّجہ اور سکّہ بند طریقوں سے بہت زیادہ انحراف کر جاتا ہے جس سے کچھ مسائل یقیناً پیدا ہوتے ہیں۔مگر میں ذاتی طور پر اس رویے کے حق میں ہوں کہ بنے ہوئے سانچوں میں ٹھیک ٹھاک شاعری تو ہو سکتی ہے مگر غیر معمولی شاعری کا اسٹیشن اس لائن پر نہیں آتا۔

امجد اسلام امجد

اردو ہائیکو کی مقبولیت سے یہ خدشہ پیدا ہو گیا ہے کہ بیشتر شعراء ایک ہی اسلوب موضوع پر دیر تک لکھتے رہیں گے تو یہ صنفِ نو وارد جلد ہی اکتاہٹ پیدا کرنے لگے گی۔وہ ہائیکو جو بالکل ماہیا کے انداز میں لکھے جا رہے ہیں انہیں ہائیکو کہنے کا کوئی جواز نہیں۔اختر شمار نے آغاز میں ہی ان خدشات کا اندازہ کر لیا ہے اور اس نے کوشش کی ہے کہ وہ اپنے ہائیکو دوسرے شعراء سے جس حد تک ممکن ہو سکے مختلف رکھے چنانچہ اس نے تین ایسی باتیں کی ہیں جو اسے دوسرے ہائیکو لکھنے والوں سے ممیّز کرتی ہیں۔پہلی بات تو یہ ہے کہ اختر شمار نے اُردو ماہیا کے اثرات سے اپنے ہائیکو کو مکمل طور پر بچا رکھا ہے۔اس کے ہائیکو کا ہر مصرعہ دوسرے مصرعوں سے مکمل طور پر مربوط ہے۔ایسا نہیں ہے کہ پہلا مصرعہ ماہیا کی طرح محض بیت رکھ دیا گیا ہو۔اس کے ہر ہائیکو کا پہلا مصرع اصل موضوع کی پہچان فراہم کرتا ہے جبکہ بیشتر دوسرے ہائیکو نگار موضوع کو دوسرے اور تیسرے یا ان میں سے کسی ایک مصرعے کو وضاحت کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔دوسری بات جو اختر شمار کے ہاں نئی ہے یہ ہے کہ اس کے ہائیکو کے تینوں مصرعے الگ الگ ردیف قافیہ رکھتے ہیں۔یعنی اس نے کسی بھی ہائیکو میں کوئی سے دو مصرعوں کو ہم قافیہ نہیں بنایا جبکہ بیشتر دوسرے ہائیکو نگار التزام کے ساتھ کم سے کم دو مصرعوں کو ہم قافیہ ضرور بناتے ہیں۔تیسری بات کا تعلق موضوعات سے ہے۔جاپانی ہائیکو کی طرح ہمارے شعراء نے بڑی حد تک مناظر فطرت کو موضوع بنایا ہے ایک گروہ نے محبت کو خاص طور سے ہائیکو کے موضوعات میں شامل کیا ہے۔ان میں بھی دو رویے ہیں ایک عمومی چاہت کا اور دوسرا شدید ذاتی نوعیت کا، جو ہائیکو کو ماہیے کے قریب لے آتا ہے۔اختر شمار نے یہاں بھی انفرادی رنگ پیدا کرنے کی کوشش کی ہے اور منجملہ دوسرے متذکرہ موضوعات کے مضامین، مناجات و نعت سے اُردو ہائیکو کو آراستہ کرنے کی ایک خوشگوار کوشش کی ہے۔

پروفیسر عرش صدیقی

تم نہیں سمجھو گے

انل ٹھکر
(ہبلی)

بچہ جب پالنے میں ہوتا ہے، تب کاتبِ تقدیر اس کی قسمت لکھنے آتا ہے۔ آج جب ایک پالنے کے سامنے ایک نوزائیدہ کا نصیب لکھنے آیا، اس پر نظر ڈالی تو اسے علم ہوا کہ وہ نوزائیدہ بچہ ایک خوبصورت لڑکی ہے۔ گلابی رنگ، چاند سا گول چہرہ، ہرنی جیسی تیز آنکھیں، ریشم سے بھی زیادہ ریشمی بال اس کے چھوٹے سر پر بکھرے ہوئے تھے۔ عموماً اس نے دیکھا تھا کہ نوزائیدہ بچہ پالنے میں پاؤں مارتے ہوئے مسکراتا ہے یا روتا ہے، مگر یہ لڑکی نہ تو ہاتھ پاؤں مار کر مسکرا رہی تھی نہ رو رہی تھی۔ اس کے چہرے پر سنجیدگی کا کُہر چھایا ہوا تھا۔ اور کاتبِ تقدیر کو ٹکٹکی باندھے دیکھ رہی تھی۔ مگر اسے ان باتوں سے کوئی مطلب نہیں تھا۔ وہ اپنی نظریں چرا کر اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔

اس نے جانے کتنے انسانوں کی تقدیریں لکھی تھیں۔ پیر اولیاء، سنت مہاتما، راجا مہاراجا، بادشاہ شہنشاہ، لیڈر، سیاست دان، امیر غریب، عجیب سے عجیب تر مگر ہر کسی کا نصیب لکھنے کے لیے اس نے ایک بوند روشنائی سے زیادہ استعمال نہیں کیا تھا۔ سب زندگیوں کا لیکھا جوکھا ایک بوند میں وہ نصیب لکھ کر اسے اس انسان کی زندگی کے صحرا میں جذب ہونے کے لیے ریت میں ملا دیتا تا کہ اسے کوئی جان نہ سکے۔ راز، راز ہی بنا رہے تا عمر!!

وہ نوزائیدہ لڑکی پالنے میں جھول رہی تھی، اتنے دن ہسپتال کے جھولے میں پڑ رہی تھی۔ آج اسے اور اس کی ماں کو ہسپتال سے گھر آنے کی اجازت ملی تھی۔ آج اسے پیدا ہوئے سات دن ہو گئے تھے۔ اتفاقاً اسے معاشرتی پہچان دینے کا اور نام دینے کا رواج بھی ساتویں دن ہی ہوا کرتا ہے۔ اس لیے گھر والوں نے آج عجلت سے وہ رسم پوری کرنے کا طے کر لیا۔ اس کی ماں کو ابھی کمزوری تھی اس رسم کی ادائیگی کے وقت اسے اسی کمرے میں ایک پلنگ پر لٹا کر موجود رکھا گیا تا کہ وہ بھی رسم کی ادائیگی کو دیکھ کر اس خوشی میں شامل ہو سکے۔ سب خوش تھے۔ گھر کا ماحول شادمانی سے لبریز تھا۔ عورتیں گیت گا رہی تھیں۔ چھوٹے بچے اودھم مچائے ہوئے تھے۔ وہ گاہ بہ گاہ موقعہ نکال کر پالنے میں بچی کو جھانک جاتے۔ انہیں اس ننھی سی بچی کے رخسار پر کاجل کا ٹیکا دیکھ کر حیرت ہوتی تھی۔ ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا اتنے گورے، گلابی گال پر یہ سہا سا ٹیکا کیوں لگایا گیا ہے!!۔۔۔ شاید اسی لیے کہا گیا ہو ''چشمِ بدّ ور''

رواج کے مطابق نوزائیدہ کا نام رکھنے کا حق پھوپھی کو ہوتا ہے۔ بے اولاد پھوپھی خوش وخرم، قیمتی ساڑی زیب تن کیے وہاں حاضر تھی۔ وہ یہ سوچ کر خوش تھی کہ بھگوان نے مجھے اولاد نہیں دی تو کیا ہوا؟ اپنے بھائی کی اولاد کا نام رکھنے کا حق تو عطا فرمایا ہے۔ جو تا عمر اس کے ساتھ جڑا رہے گا۔ تبھی پھوپھی کی بیمار بھابی نے اسے اپنے پاس بلایا اور کہا:

''بچی کو یہاں لے آؤ۔ مجھے اسے دودھ پلانا ہے۔''

تبھی پھوپھی نے دیکھا اپنی بھابی کے چولی کا سامنے کا حصہ دودھ سے بھیگا ہوا ہے۔ اس کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ اس کی اپنی چھاتیوں سے کبھی دودھ نہیں ٹپکا تھا۔ وہ رنجیدہ ہو کر بچی کو لے آئی۔ بچی کی ماں نے اپنی چولی اوپر کی تو اس کے دونوں پستان دودھ سے تر ہو گئے۔ بچی دودھ چوسنے لگی۔ پچ پچ کی آواز سنی تو پھوپھی کا دل بھر آیا۔ اسے اپنی بدنصیبی پر رونا آیا۔ اس کی اپنی چھاتیوں سے دودھ ٹپکنا نصیب نہیں ہوا نا!! اس کی چھاتیاں سوکھی رہ گئیں۔۔۔ اس نے اپنے آنسو پونچھے اور کہا:

''بھابی، اس کا نام آپ ہی رکھیئے۔''

''نہیں نہیں، بھلا میں کیسے رکھ سکتی ہوں؟!! یہ تو آپ کا حق ہے''

''میں خوشی سے اپنا حق آپ کو دیتی ہوں۔''

''نہیں۔۔۔ سب لوگ کیا کہیں گے۔''

لمحہ بھر خاموش رہ کر پھوپھی بولیں۔

''آپ ایسا کریں اس کے نام کا پہلا حرف ''ر'' سے شروع کریں۔''

میں وہاں اپنی طرف سے اعلان کر دوں گی۔

کچھ سوچ کر ماں نے کہا:

''روپالی۔۔۔''

خوبصورت ہے۔ تو میں ہمارا یہ ساجھے کا نام اعلان کر دیتی ہوں۔

ماں مسکرائی۔

ایک طرف گھر میں روپالی نام کا اعلان ہوتے ہی تالیوں اور خوشی کا شور وغل اپنے نقطۂ عروج پر پہنچ گیا۔ تب اسی گھر کے بغل والے کمرے میں ایک شخص بجھا بجھا سا، غم زدہ، اداس بیٹھا ہوا تھا۔ پہلے ہی سے وہ فطرتاً چڑچڑی طبیعت کا سر پھرا انسان تھا۔ آج یہ شور اس کے لیے ناقابلِ برداشت ہو رہا تھا۔ وہ اس شور کو روکنے کے لیے بے صبر تھا۔ بار بار اس کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ وہاں جا کر انہیں ڈانٹ کر شور وغل بند کرنے کے لیے کہے مگر وہ حوصلہ نہیں جُٹا پا رہا تھا۔ وہ اپنی اس لاچاری کے عالم میں مجبور کڑھتا بیٹھا رہا۔

جب سے ڈاکٹر نے اسے بتایا ہے کہ ماں بیٹی کی جان بچانے کی خاطر اسے زچّہ کے پیٹ سے اس کی بچہ دانی نکالنی پڑی۔ دوسرا کوئی علاج نہیں تھا۔ یہ سنتے ہی اس کے پیروں تلے کی زمین نکل گئی۔ اسے اپنے پیر ٹکانے کی کوئی ٹھوس جگہ نہیں مل رہی تھی۔ اسے ان دونوں کو بچانے کی خوشی اس لیے بھی نہیں تھی کہ جب پتنی کے جسم سے بچہ دانی ہی نکالی گئی ہے ایسا کر کے ڈاکٹر نے اس کے زرخیز جسم کو ہی اجاڑ کر رکھ دیا ہے۔ اب وہ آگے کبھی ماں نہیں بن سکے گی۔ تو پھر میری خواہش کا

کیا؟!! مستقبل میں بیٹے کا باپ نہیں بن سکتا!! میں ایک عدد بیٹا پیدا نہیں کر پاؤں گا؟!! میرے خاندان کا نام!! کیا انجام ہوگا اس کا؟!! وہ آگے نہیں بڑھ پائے گا؟!! میرا کوئی بیٹا نہ ہونے سے میری موت کے بعد میرے بدن کو کوئی غیر آدمی نذرِ آتش کرے گا؟!!! ایسا ہوا تو میں یقیناً نرک میں جاؤں گا۔ نرک کا تصور کرتے ہی اُس کی روح کانپنے لگی۔ بعد ازاں اس خیال سے اسے پل بھر چین نہیں آ رہا تھا۔

اپنی مایوسی میں کھویا رفتہ رفتہ وہ ڈپریشن کا شکار ہونے لگا۔ اپنے آپ کو تنہا محسوس کرنے لگا۔ دن بہ دن جان پہچان والوں، رشتہ داروں اور دوستوں سے کٹتا چلا گیا۔ نہ کچھ کھانے کو جی کرتا نہ کچھ پینے کو۔ گم صم رہنے لگا۔ گاہ بہ گاہ جھنجھلا کر کسی سے بھی بے وجہ اُلجھ جاتا۔ دفتر کے کام سے بھی دل برداشتہ ہو گیا۔ دفتر کے کاموں میں غلطیوں کا جیسے سیلاب اُمڈ آیا۔ صاحب نے ایک روز ناراض ہو کر اسے نوکری سے برطرف کر دیا۔ اب دن بھر گھر میں پڑا رہتا۔ نہ کہیں آتا نہ کہیں جاتا۔ نہ ہی کوئی نوکری تلاش کرتا۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر آپے سے باہر ہو جاتا۔ جب دل کی بھڑاس نکالنے اور کوئی نہ ملتا تو بے وجہ گھر والی پر برس پڑتا۔ کسی نہ کسی بہانے اس پر ہاتھ اٹھانے سے بھی نہ چوکتا۔ گھر والی بھلا کیا کہتی!! آنسو بہا کر رہ جاتی۔

مگر جب اس کی بے کاری سے گھر میں لالے پڑے، گھر کے حالات خستہ ہونے لگے تو اس نے کوئی نوکری تلاش کرنے کی سوچی مگر نوکری کیا راہ میں پڑی ملتی ہے؟ بچّی چھوٹی تھی اس کی چھاتیوں کا دودھ سوکھنے لگا تھا۔ اس معصوم کو دودھ کی اشد ضرورت تھی۔ جس کے لیے اسے اچھی غذا لینا ضروری تھی تو ہی چھاتیوں میں دودھ اُتر سکتا ہے۔ اس نے کافی سوچا، بچی کی خاطر اطراف کے امیر لوگوں کے گھروں میں جھاڑو پوچھا اور برتن مانجھنے کا کام قبول کر لیا۔ ان گھروں میں اچھی جھوٹن کھانے سے اس کی چھاتیاں شاداب ہو سکتی ہیں۔ اور ساتھ ہی اپنے لئے کوئی نوکری کی تلاش بھی جاری رکھی۔ وہ پڑھی لکھی تھی مگر پتی کی انا نے اسے کام پر کبھی جانے نہیں دیا۔

گذشتہ کئی مہینوں سے اس کا جینا محال ہو گیا تھا۔ اس کی سوچ کے باہر تھا کہ اس کے پتی کو ایسا کیا ہو گیا ہے؟!! وہ جہاں کام پر تھی اس میں ایک گھر ڈاکٹر کا بھی تھا۔ اتوار کا دن تھا ڈاکٹر صاحب فرصت سے چائے نوش فرماتے ہوئے اخبار پڑھ رہے تھے۔ اس نے ڈرتے ہوئے جھجک کر دبی زبان میں اپنا دکھڑا ان کے روبرو رویا۔ اس سے پوری تفصیلات جان کر ڈاکٹر نے نرم لہجے میں کہا:

''تمہارے Husband میرے خیال سے ڈپریشن میں ہیں۔ بہتر ہے تم انہیں علاج کے لیے جلد از جلد کسی سیکیاٹرسٹ کے پاس لے جاؤ۔''

لمحہ بھر کی خاموشی کے بعد ڈاکٹر نے کہا:

''ڈاکٹر آنند کا کلینک بڑے بازار کے نکڑ پر ہے۔ میں ان کے نام ایک لیٹر دیتا ہوں۔''

ڈاکٹر نے خط لکھ کر اس کے ہاتھ میں تھما دیا۔ اس نے خط لیا، بے حس ہاتھوں میں خط لئے وہ سوچتی رہی۔۔۔

''اس ڈاکٹر کو دینے کے لیے پیسے!!! بڑا ڈاکٹر ہے فیس بھی ویسی ہی ہوگی!! یہاں دن کو دو نوالے جھوٹن کے نصیب سے مل جاتے ہیں، تو رات کو کھانا سوالیہ نشان بن کر منہ پھاڑے سامنے آ جاتا ہے!!

اس نے خط کو مٹھی میں دھیرے سے دبایا جیسے اپنی مجبوری کا گلا گھونٹنا چاہتی ہو۔

اس نے کچھ رقم بچانے کی غرض سے مجبوراً دو گھروں میں کام کرنا شروع کیا۔ کام اسے بہ آسانی دستیاب ہو گیا۔ کیونکہ جہاں وہ اب تک کام کرتے آئی تھی ان گھروں کی عورتوں کی رائے اس کے متعلق کافی اچھی تھی۔ مہینے گزر گئے، اپنی لگن، محنت اور ایمانداری سے وہ ارادے میں کافی حد تک کامیاب ہو گئی تھی۔ اُس نے اتنے روپے بچائے تھے کہ وہ اپنے پتی کو ڈاکٹر آنند کے پاس جانچ کے لیے لے جا سکے۔

ایک روز اس کا پتی حسبِ معمول اپنے خیالوں میں محو تھا، تب وہ اپنی بچت کی رقم کی خوشی پر قابو نہ رکھ سکی۔ اس نے اپنے پتی کے پاس بیٹھتے ہوئے خوشی سے کہا۔

سنیئے جی۔۔۔

پتی نے اس کی بات پر بنا غور کیے، اس کی جانب توجہ نہ دیتے ہوئے کہا۔

کیا ہے؟

میں آپ کو ڈاکٹر کے پاس لے جانا چاہتی ہوں۔

اس کی سوچ میں خلل پڑا۔ بولا۔

کیا ہوا ہے مجھے؟!!! اس کی آواز میں خفیف غصہ نمایاں ہوا۔

آپ کی صحت اچھی نہیں ہے۔ ہمیشہ کھوئے سے رہتے ہیں۔

اب اس کی بات میں ناراضگی کھُل کر سامنے آ گئی مگر وہ اپنی خوشی میں اس کی ناراضگی سمجھ نہیں پائی۔

ایسا کیا؟!!! ایسے کس ڈاکٹر کو ڈھونڈ نکالا ہے؟ جس سے میرا علاج کروانا چاہتی ہو۔

ڈاکٹر آنند۔ بڑا سیکیاٹرسٹ ہے۔

اتنا سنتے ہی وہ بھڑک اٹھا۔ بولا۔

عقل تو نہیں ماری گئی تیری؟!!! مجھے پاگل سمجھا ہے کیا؟ یا معاشرے میں مجھے پاگل قرار دینے کا ارادہ ہے؟

اسے اپنے پتی سے ایسی توقع نہیں تھی۔ اس کے دل میں ٹیس اٹھی۔ اپنی ازدواجی زندگی میں آج پہلی مرتبہ اپنے پتی پر وہ بھڑک اٹھی۔

سوکھ کر کانٹا ہو گئے ہو، میں چاہتی ہوں آپ کی صحت سنبھل جائے۔ دنیا میں کوئی ڈاکٹر میرا علاج نہیں کر سکتا۔ ڈاکٹر نے ہی تو میری لٹیا ڈبوئی ہے۔

''چہارسُو''

نہ وہ حرام زادہ تمہارے پیٹ سے بچہ دانی نکالتا نہ میں ایک بیٹے کا باپ بننے سے محروم رہ جاتا۔

اتنا ایک ہی سانس میں کہنے سے اس کا سانس پھول گیا۔ وہ سینے میں سانس بھرنے کچھ لمحے رکا۔

میرے خاندان کے نام کو بڑھنے سے روک دیا۔ بریک لگا دیا، اس بھڑوے نے۔ اچھا ہوتا اسی وقت میں دوسری شادی کر لیتا۔ مرد تھا بیجڑا نہیں تھا۔ بے وقوف میں نے ایسا نہیں کیا۔

اس کا کھانستے ہوئے دم گھٹنے لگا۔ وہ کھانستا رہا۔ کھانسی کا دورہ پڑ گیا اسے۔

وقت کسی کے لیے کبھی روکا ہے نہ روکے گا۔ مگر کبھی کبھی اس وقت کے الفاظ ذہن میں اٹک جاتے ہیں۔

وہ الفاظ اس کے ذہن میں ایسے چبھ گئے کہ تا عمر وہ اسے نکال نہ سکی۔ اس کا دل بجھ گیا۔ وہ زار و قطار رونے لگی۔ اس کا رونا آگ میں گھی کا کام کر گیا۔ وہ اور آگ بگولہ ہوا۔ جبراً کھانسی کو روکتے ہوئے بولا۔

ابھی میں زندہ ہوں، مرا نہیں، میری موت پر رونے کے لیے یہ ٹہسوے بچا کے رکھ۔ چل دفع ہو یہاں سے۔

وہ تیزی سے اٹھی۔ اپنے زخمی جذبات کو سمیٹا اور بغل والے کمرے میں جا کر رونے لگی۔ اس کمرے سے اس کے کھانسنے کی آواز برابر آ رہی تھی۔

اس واقعہ کے بعد زندگی بھر کبھی اپنے پتی سے اس کے متعلق بات چیت نہیں کی۔ اس کی فکر کے لیے اس کی خدمت کے لیے اس کے دل میں محبت کا چشمہ خشک ہو گیا تھا۔ پھر بھی وہ مجبور اور لاچار ہو کر اس کے ساتھ ایک ہی چھت کے نیچے جی رہی تھی۔ بار ہا اس کے ذہن میں یہ خیال آتا کہ زمانے، سماج کے رہنماؤں سے یہ پوچھے وہ اس رشتہ کو کیا نام دے؟؟؟

البتہ بعد ازاں اُس کی زندگی میں ایک نئی روشنی کی کرن طلوع ہوئی۔ فاقہ کشی نے اسے دہلیز لانگنے کو بے بس کر دیا۔ اُس نے گھر سے باہر قدم رکھا باہر کی دنیا کو حیرت سے دیکھتی رہ گئی۔ معاشرے میں عورتوں کو مردوں سے کندھے سے کندھا ملا کر کام کرتے دیکھا تو اس کا حوصلہ بڑھا۔ اس نے بھی زمانے کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلنے کا عہد کیا۔ اس ارادے سے اُس نے دن دیکھا نہ رات جُٹ گئی اپنے لیے کام حاصل کرنے میں، پڑھی لکھی تو وہ تھی ہی۔ اپنے ناکارہ مرد سے زیادہ تعلیم حاصل کی ہے۔ مگر اس کے مرد کی اَنا نے اسے کبھی نوکری کرنے کی اجازت نہیں دی۔ گھر کے ماحول میں بھوک نے اپنی پکڑ مضبوط کی تو آخر کار اسے گھر کی چوکھٹ کے باہر نکلنے پر مجبور ہونا ہی پڑا۔ بھوک انسان سے کیا کچھ نہیں کروا سکتی!! باہر قدم رکھتے ہی اس نے نئی روشنی دیکھی، جس سے وہ ناواقف تھی۔

کافی جدوجہد کے بعد اسے ایک قابل قبول کام مل ہی گیا۔ جو اس کی نظروں میں با اخلاق تھا۔ وقت اپنی رفتار سے بڑھتا رہا۔ دن گزرے، مہینے بیت گئے۔ کئی موسم آئے، گئے، سال کے بعد سال قلانچے بھرتے اپنے سفر پر رواں رہے۔ جاتے جاتے ماہ و سال اس کے پتی کو مایوسی اور بے اعتمادی کے گہرے غار میں دھکیلتے گئے۔ وہ دن رات ایک ہی احساسِ کمتری میں مبتلا رہا۔۔۔ کاش مجھے ایک بیٹا ہوتا!!!

وہی ماہ و سال اس کی پتنی اور بیٹی روپالی کو بہت آگے لے آئے۔ دفتر کے ایک رفیق نے اسے مشورہ دیا کہ لڑکیوں کے اسکول میں معلّمہ کی ایک جگہ خالی ہے۔ وہاں عرضی داخل کر دو۔ اس کلرکی میں کیا رکھا ہے۔ وہاں تنخواہ بھی اچھی ہوگی اور تمہارے لئے محفوظ جگہ بھی رہے گی۔ وہاں تم اپنی بیٹی کو اپنے ساتھ رکھ کر پڑھا بھی سکو گی۔ اس نے عرضی داخل کر دی۔ اوپر والے کا کرم، اسے کام مل گیا۔

روپالی اس کے اسکول میں اس کی نظروں کے سامنے پڑھنے لگی۔ ساتھ مل کر جاتے، مل کر گھر آ جاتے۔

انسان زینہ در زینہ ترقی کی سیڑھیاں چڑھنے لگتا ہے، مگر یہ ترقی دو دنوں میں نہیں ملتی۔ برسوں درکار ہوتے ہیں۔ قدم بہ قدم آگے بڑھتے ہوئے آخر کار اس کی محنت رنگ لائی۔ وہ ہائی سکول کی معلّمہ سے وہاں کی پرنسپل بن گئی۔ روپالی نے بھی اپنی تعلیم مکمل کر کے کالج میں داخلہ لے لیا۔ وہ خوش تھی کہ بیٹی نے آگے کی تعلیم کے لیے کالج پڑھنا طے کیا۔ زندگی کے ساتھ آگے بڑھتے بڑھتے اب اس کے چہرے کی جھریاں نمایاں ہونے لگیں تھیں۔ یہ عمر سے زیادہ سخت جدوجہد کا نتیجہ تھا۔ بالوں میں کہیں کہیں چاندنی کی شعاعیں نظر آنے لگی تھیں۔ دوسری طرف روپالی کی جوانی کا آفتاب ٹھیک سر پر ٹھہرا تپ رہا تھا۔ ماں کے پیار اور ممتا کی گنجان چھاؤں میں بڑھی روپالی نے گھر کے باہر اس ٹھنڈک کی کمی محسوس کی۔ باہر کے ماحول میں چھاؤں تو تھی مگر چھلنی چھلنی، جس میں چھاؤں اور بکھری دھوپ دونوں جھیلنے پڑتے۔ مصیبتیں جھیلی ماں کی بیٹی نے اسے مسکرا کر قبول کر لیا۔ کالج کی تعلیم کے دوران ایک لڑکے سے جان پہچان ہوئی۔ وہ اس کے قریب آئی۔ دوستی قربت میں بدلی۔ ویسے تو وہ لڑکا سانولی رنگت کا تھا۔ چہرہ مہرہ ٹھیک ٹھاک ہی تھا مگر ایک خوبی اس میں بلا کی تھی۔ دینے والے نے وہ خوبی اسے بے پناہ دی تھی۔ رنگ روپ، چہرہ مہرہ، ایسی کمیوں کو نظر انداز کر کے وہ اس کی ذہانت سے متاثر ہوئی۔ یہ اس کی عمر کا تقاضا تھا بات پسند آ گئی تو آ گئی۔

ایک روز شام کو اسکول سے لوٹ کر اس نے گھر کا قُفل کھولا۔ ہاتھ دھو کر چائے بنا کر پی اور رات کا کھانا پکایا۔ وقت پر اپنے پتی کے لیے کھانا لے کر اس کے کمرے میں گئی تو دنگ رہ گئی۔ کھانے کی تھالی اس کے ہاتھ سے گر گئی۔ اسے یقین نہیں ہو رہا تھا۔ یہ کیا ہے؟ اس کا پتی گلے میں کپڑا باندھے چھت کے پنکھے سے لٹکا ہوا ہے۔ زبان باہر نکل آئی ہے۔ آنکھیں بند ہیں۔ سر جھکا ہوا ہے۔ وہ سنبھل گئی۔ فوراً پولیس کو خبر کی۔ پڑوس اور گلی کے لوگ جمع ہو گئے۔ لاش کو پوسٹ مارٹم کے لیے لے جایا گیا۔ پولیس کو اس کی جیب سے ایک چھٹی ملی۔ لکھا تھا۔ میں اپنی مرضی سے خودکشی کر رہا ہوں۔ اس کے لیے اور کوئی ذمہ دار نہیں ہے۔ میں

''چہارسُو''

ایک لڑکے کا باب بننا چاہتا تھا اب یہ ممکن نہیں ہے، آخر میں اس کے دستخط تھے۔

دوسرے روز، پوسٹ مارٹم ہو گیا تو اس نے پڑوسیوں سے ہاتھ پاؤں جوڑ کر درخواست کی کہ وہ وہیں سے اسے سیدھا شمشان لے جا کر لاش کو سپردِ آتش کرے گی۔ اس پر مہربانی کریں۔ اس کے گھر میں کوئی مرد نہ ہونے سے پڑوسیوں نے پڑوسی دھرم نبھایا۔

اس کا جسم راکھ ہو گیا۔ کچھ دنوں میں بات آئی گئی ہو گئی۔ زندگی اپنے ڈھرے پر چلنے لگی۔

گوپال اور روپالی ہر وقت کالج میں ساتھ نظر آنے لگے۔ یونین کے کاموں میں یا کالج کی کینٹین میں یا کلاس روم میں۔ ان کے آپسی برتاؤ میں ایسا کوئی چھچھورا پن نہیں تھا جو کالج میں غلط سمجھا جاتا۔ وہ تو دوستی کی علامت بن بیٹھے تھے۔ مگر وہ دل سے بہت قریب ہو گئے تھے۔ اب ان دونوں میں دل کھول کر باتوں کا لین دین ہونے لگا تھا۔ ایک روز گوپال نے بڑی سادگی سے روپالی سے پوچھا:

تم مجھ سے شادی کرو گی؟

اچانک یہ سوال سن کر روپالی کے اندر مانو بھونچال آ گیا ہو۔ اسے محسوس ہوا وہ غش کھا کر گر پڑے گی۔ تبھی گوپال نے اس کے شانہ پر ہاتھ رکھ کر کہا:

یہ میری خواہش ہے۔ تم چاہو تو انکار کر سکتی ہو۔ مجھے بُرا نہیں لگے گا۔

روپالی یک لخت گھبرا گئی۔ جیسے کسی نے چھوٹے بچے کو کھلونا دے کر واپس لے لیا ہو۔ جذبات نے کچھ سوچنے کا موقعہ ہی نہیں دیا۔ جھٹ سے بول اٹھی:

مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ مگر۔۔۔ وہ خاموش ہو گئی۔

گوپال مسکرایا، بولا۔۔۔ ماں نہیں مانے گی کیونکہ میں دلت ہوں۔

روپالی نے فوراً اس کے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے چپ کرا دیا۔

دونوں خاموش رہے، پھر گوپال نے کہا۔

خالقِ کائنات تو صرف اور صرف انسان بناتا ہے۔ یہ ذات، پات بنانے کا ٹھیکہ تو انسانوں نے لے رکھا ہے۔

پل بھر خاموش سوچ کر اس نے کہا۔۔۔ کم از کم مجھے ایک مرتبہ ان سے ملوا تو دو۔

ٹھیک ہے میں کوشش کروں گی۔ روپالی نے کہا۔

اس رات کھانا کھاتے ہوئے روپالی نے ماں سے دبے لفظوں میں کہا۔

ماں میرا دوست تم سے ملنا چاہتا ہے۔

ماں کا ماتھا ٹھنکا مگر اس نے پوچھا نہیں کیوں؟ وہ چاق و چوبند ہو گئی۔ اپنی بیٹی کے چہرے کو ٹکٹکی باندھے دیکھتی رہی کچھ نہیں بولی۔ منہ کا نوالہ آہستہ آہستہ چباتی رہی۔ اس کے کھانے کی رفتار سست پڑ گئی۔

رات سونے کے وقت کروٹیں بدلتے ہوئے دونوں سونے کا ڈھونگ کرتی رہیں۔

روپالی کی امید کا دیا بجھنے کی کگار پر تھا۔ اسے کوئی راہ نظر نہیں آ رہی تھی۔

ماں سوچ رہی تھی زندگی کا دریا کیسے اطمینان سے رواں تھا۔ اچانک اس میں یہ لہریں کیسے اٹھیں؟!! ہر چیز تہس نہس کر دیں گی!! تبھی خیال کے ایک جگنو نے پر تولے۔ وہ ڈر گئی مگر خیال نے پیچھا نہیں چھوڑا سوچنے لگی۔۔۔ دریا جیسے جیسے سمندر کے قریب پہنچتا ہے تو اس میں لہریں اٹھنا فطری ہے۔ پھر یہ عمر ہی ایسی ہے اگر وہ اپنی زندگی بسانا چاہتے ہیں تو کیا بُرا ہے؟ آج نہیں تو کل میں بھی تو اس کے لیے لڑکا تلاش کروں گی نا؟

ماں نے ایک لمبی سانس لی، چھوڑی، رفتہ رفتہ نیند نے اسے اپنی آغوش میں لے لیا۔

دوسرے روز روپالی بھاری من سے کالج کے لیے نکلتے وقت ماں سے کہا۔

میں کالج جا رہی ہوں۔

ماں نے رسوئی گھر کی چوکھٹ پر آ کر کہا۔

سُن، شام کو آتے وقت اپنے دوست کو لے آنا۔

روپالی کی امید کا دیا جو بجھنے کی تیاری میں تھا اس کی لَو ایک لخت تیز ہو اٹھی۔ پھر ایک بار اس کی لو پھڑ پھڑا کر اُوپر اٹھی۔ مگر ساتھ میں ایک ڈر لیے جانے ماں گوپال کو کیسے کیسے لفظوں میں لتاڑے گی!!!

آج اسکول سے وہ پہلے گھر آنے کے لیے نکلی۔ اس نے سوچ رکھا تھا اگر لڑکا قابل رہا تو اس سے تفصیل سے بات کر کے کسی نتیجے پر آ جائے گی۔ اس نے آتے ہوئے بازار سے کچھ نمکین اور مٹھائی خریدی۔ جب وہ دکان کا زینہ اتر رہی تھی تب اتفاقاً اس کی نظر ایک خوبصورت بچے پر پڑی۔ جسے دیکھ کر وہ ٹھٹھک گئی۔ اس کی معصومیت کو دیکھتی رہ گئی۔ اچانک اسے اپنے پتی کی یاد آ گئی۔ اس کی آخری تمنا تھی کہ وہ ایک لڑکے کا باپ ہوتا!!! میں اگر ایک بیٹا اسے دے سکتی تو وہ خودکشی نہیں کرتا۔ اور ہماری زندگی آج خوش حال ہوتی۔ اچانک اس کے دل میں چاہت ابھری۔ اس نے مٹھائی کا ڈبہ کھولا۔ تھوڑی مٹھائی نکال کر بچے کو کھانے کے لیے دی۔ بچہ اسے حیرت سے دیکھنے لگا۔ اُس نے بچے کو پیار سے مٹھائی لینے کو کہا۔ بچے نے مسکرا کر مٹھائی لی اور خوشی خوشی کھانے لگا۔ قریب ہی بچے کی ماں اپنی سہیلی سے باتیں کرتی کھڑی تھی۔ اچانک اس کی نظر بچے پر پڑی تو اس نے جھٹ سے آ کر اس کے ہاتھ سے مٹھائی چھین کر پھینک دی اور چلانے لگی۔ واویلہ مچا دیا کہ یہ عورت بچہ چور ہے۔ یہ میرے بیٹے کو مٹھائی کھلا کر اسے اغوا کرنا چاہتی تھی۔ اس کا چلّانا سن کر بھیڑ جمع ہو گئی۔ شور شرابہ بڑھ گیا۔ اسی ہفتہ شہر میں بچہ چوری کے تین واقعات ہو چکے تھے لوگ بھڑک اٹھے انہوں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ اسے مارنا پیٹنا شروع کر دیا۔ وہ چلّاتی رہی، رو رو کر گڑگڑاتی رہی کہ وہ بچہ چور نہیں ہے۔ مگر کسی نے اس کی ایک نہ سنی، ہنگامہ دیکھ کر بچے کی ماں اپنے بیٹے کو لے کر

وہاں سے کب غائب ہوگئی کسی کو علم ہی نہیں ہوا۔اب یہ بے قصور شریف مار کھانے درندوں کے ہاتھوں میں رہ گئی۔ان دہشت پسندوں نے مار مار کر اسے موت کے گھاٹ اتار دیا۔تب پولیس آئی کچھ لوگوں کو حراست میں لیا۔قتل کا کیس داخل کیا گیا۔پولیس کا کام پورا ہوا۔اب انصاف کا کام تھا مگر انصاف جانے کب ملے؟ بھگوان جانے!!انصاف کسے ملے گا!!انصاف کا حقدار تو رہا نہیں!!

ایک نمبر اور کم ہوگیا۔۔۔ایسا ہوا تو دیش کا کیا ہوگا؟۔۔۔جمنا لال جی نے سوچتے ہوئے کہا۔

کیا ہوا؟۔۔۔ان کے دوست نے سوال کیا۔

ایک ہندو کم ہوگیا۔

مر گیا کیا؟

مر گیا ہوتا تو کوئی بات نہیں تھی۔ یہاں تو ایک اونچے گھرانے کی پڑھی لکھی لڑکی نے دلت سے شادی کر لی۔

جمنا لال جی ممبر آف پارلیمنٹ تھے۔انہی کی پارٹی کی سرکار تھی۔ انہیں منسٹر کے قابل نہیں سمجھا گیا اس لیے وہ ایم پی رہے۔وہ کم تعلیم یافتہ مگر عقل کے دھنی تھے۔پکّے سیاست دان۔خبروں کی سرخیوں میں رہنے، آئے دن کچھ نہ کچھ ایسا کرتے یا بیان دیتے جس سے وہ ٹی۔وی اور اخباروں میں بنے رہیں۔ انہوں نے ایک شاعر کو پال رکھا تھا وہ نثر بھی اچھی لکھ لیتا تھا۔جوان کا لنگوٹیا تھا۔ اس یار سے وہ اپنی تقریریں لکھواتے، زہر آلود نعرے خلق کرواتے۔اس کی رائے لیتے۔ماننا نہ ماننا ان کی مرضی پر منحصر ہوتا۔گھر کا خاص مے خانہ، مے نوشی کا شرف اسے حاصل تھا۔ وہیں پر بیٹھ کر ایم۔پی صاحب کے سب فتنے تیار کیے جاتے تھے۔آج انہیں ایک ہندو کے کم ہونے کی فکر لاحق ہوئی تو ان کے ہاتھوں میں کھجلی ہونے لگی۔انہوں نے اپنے یار سے کہا۔

کوئی ایسا نعرہ لکھو کہ میں کل جیسے ہی اچھالوں شہر بھر میں دلتوں کے خلاف فساد برپا ہو جائے۔سالوں کے بدن میں جانے کیا کیا کھا کر چربی بڑھ گئی ہے۔

اتنا کہہ کر جام پٹخ کر تپائی پر رکھا۔

شاعر دوست نے سوچا۔کنگ نرو کی طرح اس پاگل کی کھجلی جانے کتنے بے قصور دلتوں کی زندگی تباہ کر دے گی۔اس نے اس کی بات سے انکار تو نہیں کیا مگر اپنی جانب سے ایک مہرا چل کر دیکھا، کہا۔

نعرہ تو لکھ دیتا ہوں۔مگر یار تم یہ کیوں نہیں سوچتے؟ مرد ایک انسان پیدا کر سکتا ہے۔جبکہ عورت ایک نسل کو پیدا کرتی ہے۔تم اس کے لیے کونسا نعرہ اُچھالو گے؟!!

میں سمجھا نہیں۔

شاعر مسکرایا گھونٹ لیا، کہا:

تم نہیں سمجھو گے۔

نوبل 2019ء

امن

ایتھوپیا کے وزیر اعظم آبے احمد علی

خدمات

پڑوسی ملک اریٹیریا سے بیس سالہ جنگ کے خاتمے پر

ادب 2018ء

ستاون سالہ اولگا کارزک پولینڈ

ادب 2019ء

چھتر سالہ پیٹر ہینڈ آسٹریا

خدمات

اچھوتے خیالات اور سادہ اندازِ بیاں

(سابقہ برس ایک جج کے راستعفیٰ دینے کے باعث ایوارڈ دیا نہ جا سکا تھا)

کیمسٹری

۱۔ ستانوے سالہ جان گڈ نف امریکہ

۲۔ ایم اسٹینلی ونگھم برطانیہ

۳۔ اکیرا یوشینو جاپان

(انعام کی چودہ کروڑ رقم کا نصف جان گڈ نف بقیہ رقم باقی دونوں فاتح سائنسدانوں میں مساوی تقسیم کی گئی)

خدمات

بیٹری کی ایجاد، استعداد میں اضافہ اور کاروباری استعمال کے قابل بنانا

فزکس

۱۔ مائکل میئر (سوئٹزر لینڈ)

۲۔ ڈی ڈیئر کلیوز (سوئٹزر لینڈ)

۳۔ جیمز پیبل (کینیڈا)

خدمات

تھیوریٹیکل ڈسکوریز ان فزکس کوسمولوجی

اکنامکس

۱۔ ابی جیت بنرجی (بھارت)

۲۔ ایشٹر ڈفلو (فرانس)

۳۔ مائیکل کریمر (امریکہ)

خدمات

غربت کے خاتمے کے لیے پر مثبت تجربات

نوبل میڈیسن

۱۔ ولیم جی کیلن جونیئر (امریکہ)

۲۔ پیٹر ہیر یڈکلف (یوکے)

۳۔ گریگ جی ایل سیمنز (امریکہ)

خدمات

آکسیجن کے ذریعہ انسانی خلیات کی دریافت

کیس ہسٹری

طاہرہ اقبال
(فیصل آباد)

جیل کی صاف ستھری روشوں کے اطراف بچھی تراشیدہ باڑیں گلاب، چنبیلی اور گل برگے کی خوشبوؤں میں نہائی تھیں جن پر ست رنگی تتلیاں منڈلاتی تھیں اور مدھ مکھیاں میٹھا رس چوستی تھیں۔ جرائم، گناہ اور معصیت کے اس بندی خانے میں یہ لطافت، یہ تازگی، صفائی اور آراستگی کتنی انمل اور غیر فطری ہے۔ عنایا نے یہ سب حیرت سے دیکھا۔ یہ فطرتیں ناموافقتوں، دہشتوں اور وحشتوں میں بھی کیونکر جاری رہ پاتی ہیں کس جبلی مجبوری کے تار سے بندھی ہوتی ہیں۔ شاید وہی مجبوری جو بچپن کو جوانی میں، جوانی کو بڑھاپے میں تبدیل کرتی اور تغیرات کو حاوی کر دیتی ہے۔ اس قدر ناموافق ماحول میں پھولوں کو کھلنا، مدھ مکھیوں کو شہد بنانا، اور تتلیوں کو اُڑان بھرنا زیب دیتا ہے۔

حفاظتی اسکارڈ کے ہمراہ اُسے سپرنٹنڈنٹ کے آفس میں پہنچایا گیا وہاں پُرتکلف چائے کا انتظام موجود تھا۔ وہ پھر سٹپٹا گئی۔ جبری موت، ڈیتھ وارنٹ، تشدد اور گناہوں سے لبریز درشت چہرہ ماحول میں اس قرینے اور اہتمام کا کیا کوئی جواز بنتا ہے؟

''مجھے چائے نہیں پینی، مجھے تو وہاں جانا ہے، جہاں میرا کیس ہسٹری بند ہے۔''

''اُسے یہیں حاضر کیے دیتے ہیں۔''

''کئی مسلح وارڈن سپرنٹنڈنٹ کے اشارۂ ابرو پر دروازے سے واپس پلٹے۔''

''لیکن مجھے تو اُسے کال کوٹھری میں بند دیکھنا ہے کہ وہاں اُس کا رویہ کیسا ہے۔ اپنے کیس ہسٹری کے مختلف رویوں، نفسیات اور جذبات کو جانچنا ہے اور پھر رپورٹ لکھنی ہے۔''

پیروں میں بیڑیاں اور سر پر نماز والی ٹوپی پہنے کئی قیدی باڑوں کو تراش رہے تھے اور جیل کے لہلہاتے کھیتوں میں مشقت کر رہے تھے۔ زخمی کونج جیسے لال خونیں ڈیلے دراز قامتیں اور بھرپور جوانیاں ان میں سے ہر کوئی ایک کیس ہسٹری تھا۔ ناموافقت سے ٹکراتی خام فطرتوں کا ردِعمل۔

''میڈم! یہ بڑے خطرناک لوگ ہوتے ہیں۔ خصوصاً موت کی سزا پانے والے مجرم تو انتہائی فرسٹیڈڈ ہو جاتے ہیں اُنھیں آزاد، بے گناہ، صاف ستھرے افراد خود پر گالی معلوم ہوتے ہیں۔ وہ اس گالی کا جواب دینے کو پاگل ہو جاتے ہیں۔۔۔ آپ کی ضد ہے۔۔۔ لیکن محتاط رہیے گا وہ تین افراد کا قاتل اور عصمت دری کا مجرم ہے۔''

'میں سمجھتی ہوں، جس سے جو چیز چھن جائے گی وہ دوسروں کے پاس اُسے کیونکر برداشت کرے گا، فطری بات ہے۔''

مضبوط آہنی جنگلوں کے پیچھے انسانی شباہت والے خوفزدہ وحشی گوریلے بند تھے، پسینے میں نچڑتے اور شدید گرمی میں اُبلتے ہوئے سوجی ہوئی آنکھوں میں سرخ انگارہ لہو اور بوٹیوں کا قیمہ سا تیرتا ہوا، جیسے برزخ کی سولی پر چڑھے ہوں گرمی دانوں سے لتھڑے جسموں پر قمیضیں نہیں تھیں، لیکن نماز والی ٹوپی سر پر ضرور دھری تھی۔

''جرم کے بعد اکثر مجرموں کا رجحان مذہب کی طرف کیوں ہو جاتا ہے۔''

''فطری بات ہے ہر سمت سے دُھتکارے ہوؤں کے لیے بس یہی ایک در کھلا رہتا ہے۔''

سپرنٹنڈنٹ نے عنایا کی دلیل سے جیسے اپنے جواب کی منطق نکالی ہو۔

''لیکن یہ لڑکا جس سے آپ کو ملنا ہے جب یہاں لایا گیا تو بھی اس کے ماتھے پر محراب موجود تھا اور پنجگانہ نماز کا عادی معلوم ہوتا تھا۔''

''فطری بات ہے نماز کا عادی ہوگا تو ہی محراب موجود تھا نا۔''

عنایا کو منہ بھر کے ہنسی آئی۔

''ارے ہماری گفتگو میں فطرتوں کا ٹکراؤ اور عمل کا ردِعمل کچھ زیادہ نہیں ہے۔''

پھولوں کی خوشبوئیں شہد کے چھتے کی میٹھی مہک، ہل چلی زرخیز مٹی کی باسنا، جیل کے باورچی خانے سے اُٹھتی گوشت بھننے کی اشتہا انگیز خوشبو ان کال کوٹھریوں میں گھسی چلی آتی تھیں۔ موت کے دن گنتے ان مجرموں پر زندگی کے محسوسات والا دروازہ ابھی کھلا تھا۔ موت کے تیز رفتار قدموں کی چاپ میں کیا یہ زندگی کی آہٹ کو محسوس کرتے ہوں گے۔ زندگی والے لوازمات کتنے ڈھیٹ ہیں، موت کی کوٹھریوں میں بھی گھسے چلے جاتے ہیں۔

ہوائیں، خوشبوئیں، آوازیں، جذبات و محسوسات زندگی کی جانب، دُنیا والی سمت ایک کھڑکی ابھی بھی ان کے لیے کھلی تھی۔

''کیا یہ کھاتے پیتے سوتے اور باتیں بھی کرتے ہیں۔''

''میڈم! فطرت اپنا عمل کبھی نہیں چھوڑتی یہ زندگی والے سارے کام کرتے ہیں، بلکہ خود کو زیادہ دلیر اور نڈر ثابت کرنے کے لیے پھانسی والی رات بھی سو جاتے ہیں۔ اچھا کھانے کی فرمائش کرتے ہیں اور اللہ اکبر کے نعرے لگاتے ہوئے پھانسی گھاٹ پر چڑھتے ہیں۔ انھیں مرتے ہوئے بھی اپنی عزت اور اَنا کا دھیان رہتا ہے۔ وہ اپنا ایک تاثر چھوڑ کر مرنا چاہتے ہیں کہ دیکھنے والوں کی یادداشتوں میں زندہ رہیں۔''

''ارے کیا یہ سہما ہوا بھولا سا لڑکا بھی پھانسی کی رات ایسا سب کچھ کرنے والا ہے جس کی رحم کی اپیل خارج ہو چکی ہے۔ اسلامی ٹوپی اور ماتھے کے محراب پر درد بھری معصومیت ٹنگی تھی۔''

''تمہارا نام کیا ہے۔''

''بھولا۔''

''ارے یہ تو عرفیت ہوئی اصلی نام کیا ہے۔''

''قاری سلیم الرحمٰن۔''

اُس نے نماز والی سفید ٹوپی سر سے اُتاری، گرمی دانوں سے اُدھڑی ٹینڈ پر ہاتھ پھیرا اور ٹوپی درست کر کے دوبارہ جمائی۔

''اب بھی قرأت کرتے ہو۔''

''الحمدللہ، ہر روز فجر کی نماز اور عصر کی نماز سے پہلے عمر بھر کا معمول ہے۔''

تفاخر کے احساس سے اُس کے زرد پچکے ہوئے گالوں میں خون کی لہریں نمایاں ہوئیں۔

''موت کی سزا سے پہلے جیل میں یہی تراویح پڑھاتا تھا اور اذان بھی یہی دیتا تھا۔ اس کا لحن ماشاءاللہ بہت سریلا ہے۔''

''وارڈن کی بندوق کا رُخ بھی اُسی کی سمت تھا۔

''ماشاءاللہ'' کتنا بے جوڑ کلمہ تھا۔ یہ پھانسی کا مجرم جس کے اندر موجود کوئی بھی خوبی اس کے وجود سے الگ کر کے سنبھالی نہ جا سکتی تھی اس کی سبھی خوبیوں کو اس کے وجود کے ساتھ ہی پھانسی چڑھنا تھا۔

''قاری سلیم الرحمٰن کیا یہ درست ہے کہ تم نے ایک میاں بیوی اور اُن کے ڈیڑھ برس کے بچے کی جان لی ہے۔''

عصمت دری کا لفظ عنایا کی زبان سے چاہ کر بھی نہ نکل سکا۔

''جی ہاں۔''

''کیوں۔''

آسمانوں تک کھنچی جیل کی فصیلوں اور سیاہ آہنی دروازوں پر حیرت ٹنگی رہ گئی اگر ان فصیلوں کو کوئی پھاندنا چاہے تو کتنی عمروں کی کھپت ہو گی، یاجوج ماجوج جس فصیل کو چاٹ رہے ہیں وہ شاید اسی سے ملتی جلتی ہو گی۔

''بس تقدیر اور وقت نے سازش تیار کر لی تھی ورنہ میں نے تو زندگی میں پہلی بار اُنھیں اُسی رات کو دیکھا تھا۔''

سزائے موت کے قیدی آہنی جنگلوں کے ساتھ خوفزدہ وحشی درندوں کی طرح چمٹے تھے، اچانک نوجوان لڑکی کو سامنے پا کر وہ ہیجانی قہقہے لگانے، اضطراری چیخیں مارنے اور اپنے ہی جسموں کو نوچنے اور جنگلے بجانے لگے، جیسے بے قابو قوی گوریلے کود پھاند تو کر رہے ہوں لیکن ان کی بے پناہ فالتو توانائیوں کو زائل کرنے کے لیے جگہ انتہائی تنگ و تاریک ہو وہ برسوں کے جمع شدہ حبس کے اخراج کے لیے پاگل ہو رہے تھے۔ ایک دوسرے پر گھونسے اور لاتیں چلا رہے تھے، وارڈن نے بندوق کے بٹ دو چار سروں پر بجائے۔

''میم صاحبہ! آپ کمرے میں تشریف لے چلیں وہیں اسے حاضر کر دیتے ہیں۔''

بیڑیوں کی جھنکار، ہتھکڑیوں کی کھنکار، جیل کے سبزہ زاروں پر برسی، سبزہ کُریدتے رنگ برنگ پرندوں نے کوئی توجہ نہ دی جیسے یہ معمول کا پس منظری ساز ینہ ہو۔ کوئل کی کوک، فاختہ کی کوکو، چڑیوں کی چہچہاہٹ پرانے چھتنارے درختوں میں سے اُبھرتی رہی۔ جہاں لمبے مخروطی چھتے میں سے منہ سر لپیٹے قیدی اپنے افسروں کے لیے شہد نچوڑ رہے تھے اور مسکرا بھی رہے تھے۔ شاید عنایا پر یا اُس کے پیچھے چلنے والے کیس ہسٹری پر۔ ''یہ مسکراتے بھی ہیں ان کے پاس بھی خوش ہونے کا کوئی جواز موجود ہے؟''

قیدی نے شہد سے بھرا موم کا ٹکڑا منہ میں دبایا دونوں باچھوں سے شہد کی لکیریں بہنے لگیں۔ سیاہ کالی سانپ سی زبان نکال کر چاٹا۔ موم کو حلق سے نیچے اُتارا کہ عنایا کو، لیکن اس خیانت پر اس کے سر پر کوئی بٹ نہیں برسا کیونکہ اُس روز اس جیل خانے میں معمولات سے ہٹ کر بہت کچھ ہو رہا تھا۔ سبھی قیدی صاف ستھری وردیوں میں ملبوس تھے۔ کسی سے کوئی غیر انسانی سلوک روا نہ رکھا جا رہا تھا۔ کھانا وقت سے پہلے تیار ہو رہا تھا۔ کیونکہ ڈی آئی جی کی بھتیجی آج وزٹ پر تھی لیکن کال کوٹھریوں کے معمولات میں کوئی فرق نہ آیا تھا۔ اُنھیں کسی اضافی سہولت کے لائق نہ سمجھا گیا تھا، اُس نے اپنی زخمی زخمی لال آنکھوں کو دونوں ہتھیلیوں میں دبا کر بے دردی سے رگڑا، جیسے جیل کے آسمانوں کے نیچے اُڑان بھرتی ان چیلوں نے ٹھونگیں مار مار کر ڈیلوں کا قیمہ بنا دیا ہو۔

''ارے نہ رگڑو آنکھیں بڑی نازک شئے ہوتی ہیں۔''

عنایا نے اپنی چیخ کو حلق میں دبا لیا۔۔۔ آخر فائدہ۔۔۔ جس شخص کی رحم کی اپیل بھی مسترد ہو چکی ہو۔ اُس کے صحت مند اعضا کی اہمیت ہی کیا ہے۔ سوائے یہ کہ پھانسی گھاٹ پر چڑھنے سے پہلے ڈاکٹر رپورٹ لکھ سکے کہ وہ مرنے سے پہلے صحت مند اور بقائمی ہوش و حواس تھا۔ صحت، زندگی تحفظ کتنے بے کار لفظ ہیں۔ تمام ہمدردوں، انصاف پسندوں اور قانون کے رکھوالوں اور خود زندگی نے جسے دُھتکار دیا ہو، جس کی پناہ گاہ موت ہو۔۔۔ موت! کتنی فراخ دِل، پردہ پوش اور مہربان، جو ہر ایک کو خود میں سمو جانے دیتی ہے، اگر موت بھی زندگی جیسی محدود، اتھلی اور کم ظرف ہوتی تو پھر ان ارزل اور گنہگاروں کو جائے پناہ کہاں ملتی۔

جیل کے سبزہ زاروں پر سورج کی شعاعیں سیدھی ہو چکی تھیں اور باورچی خانے سے مصالحوں اور گندم کی تازہ روٹی کی خوشبوئیں ہواؤں میں رچ گئی تھیں۔

عنایا نے ان ذائقوں کا تاثر قیدی کے بے تاثر چہرے پر کھوجا۔

''اچھا تو بتاؤ تم نے اُن تین بے گناہوں کو کیوں مارا۔''

شرعی شرم والی جھکی جھکی آنکھیں ناگہانی گولیوں کی طرح عنایا کی آنکھوں میں دغیں۔

''نہ وہ پورے بے گناہ تھے اور نہ میں پورا گنہگار ہوں۔''

عنایا نے گڈے جیسے معصوم چہرے پر فلسفۂ قسمت کی کرختگی کو پھیلتے ہوئے دیکھا جیسے سائیکالوجی کی طالبِ علم وہ نہیں یہ سزائے موت کا قیدی ہے۔ وہ بنا کہے خود ہی بولنے لگا، جیسے اندر کا ناقابلِ برداشت بوجھ خود ہی سارے بند توڑ کر

باہر اُبل پڑا ہو، جیسے وہ پھانسی کے تختے پر چڑھنے سے پہلے اپنا مؤقف واضح کر کے مرنا چاہتا ہو۔

''اُس روز مدرسے میں چھٹی دیر سے ملی تھی جب میں چناب کے پتن پر پہنچا تو آخری بیڑی نکلنے کو تیار کھڑی تھی۔ میں نے ملاح کی بہت منت سماجت کی کہ وہ مجھے بیٹھا لے، لیکن وہ کیسے بیٹھاتا اس حادثے کی بنیاد جو پڑنی تھی۔ استغفراللہ۔۔۔ استغفراللہ! ملاح نے رسہ کھولتے ہوئے چیخ کر کہا۔

''کیوں تمہارا کیا خیال ہے کہ میں کشتی ڈبودوں۔ دریا پہلے ہی چڑھا ہوا ہے اور وزن ضرورت سے زیادہ ہے۔''

''اگر وہ مجھے بٹھا لیتا تو۔۔۔ تو۔۔۔''

وہ اپنی لال بوٹی آنکھوں کو پھر بے دردی سے رگڑنے لگا اور کانوں کی لویں پکڑ کر توبہ استغفراللہ کا وِرد کرنے لگا۔

''تو تم اس وقت پچھتا رہے ہو۔''

عنایا نے اُس کے صحت مند خوبصورت اعضا کی بے اہمیتی کے فلسفے پر پھر غور کیا۔

''نہیں پچھتاوا کیسا تقدیر والا تیر پھینکا جا چکا تھا اور اُسے اپنے نشانے پر لگنے کے لیے حالات کو تو سازگار بنانا ہی تھا۔''

''تو تم یہ کہہ رہے ہو کہ تمہارے گناہ کا محرک وہ ملاح تھا۔''

''اُس نے تڑپ کر تردید کی جیسے اُس پر ایک ایسا جرم بھی تھوپ دیا گیا ہو جو اُس نے سرے سے کیا ہی نہ ہو۔''

''نہیں میں یہ نہیں کہہ رہا۔ میں تو یہ کہہ رہا ہوں کہ قدرت کا کیا ہوا فیصلہ لاگو کرانے میں اُس نے اپنے حصے کا کام کیا اگر اس حادثے کا اُسے علم ہو جاتا تو وہ اس کے تانے بانے کی تہ تک بھی نہ بنتا وہ مجھے ضرور بٹھا لیتا آخر بیس افراد اور بھی تو اُس نے بٹھا رکھے تھے مجھ ہلکے پھلکے انسان سے کیا کشتی ڈوب جاتی۔۔۔ شاید ڈوب ہی جاتی۔ تقدیر کی تانی کو کون سمجھا۔ لاشریک لاشریک۔''

جیل کی چھتوں پر ریت سے بھری بوریوں کے مورچے بنائے محافظ بندوقیں تانے ہوشیار کھڑے تھے جو اس جیل میں بھرے ہزاروں مجرموں کو تقدیر کے نہیں قانون کے قیدی سمجھ کر حفاظت پر معمور تھے۔

''ہاں تو پھر تقدیر نے تمہارے ساتھ اپنا کون سا کھیل کھیلا۔''

''ہاں۔۔۔ میں کہہ رہا تھا کہ جب کشتی کے پتوار چل پڑے تو پیچھے سے کسی عورت کے چیخنے کی آوازیں آئیں، یہ عورت اس حادثے کی دوسری کڑی تھی جو پہلی کڑی سے بروقت جڑ گئی اُسے بھی اسی کشتی میں سوار ہونا تھا کشتی کنارے چھوڑ چکی تھی لیکن وہ دیوانہ وار کشتی کی طرف لپک رہی تھی اور چیخ رہی تھی۔'' اب قیدی کی لال بوٹی آنکھوں میں عجب خواب گوں سی کیفیت ہویدا ہوئی، جیسے قیدی کی واحد اچھی یاد اُس کے جلتے اُبلتے دماغ کو تسکین کا کوئی لمس دے گئی ہو۔

''وہ چیخ رہی تھی۔''

''او بھائیا ہمیں لیتے جاؤ ہمارے ساتھ چھوٹا بچہ ہے۔ رات اندھیری ہے۔ پتن بپھرا ہوا ہے۔'' وہ کنارے کے ساتھ ساتھ بھاگ رہی تھی۔ اُس کے پیروں تلے دریا کنارے کی جنگلی ڈھب چڑھ مڑ ہو رہی تھی۔ پیر گیلی ریت میں دھنس رہے تھے۔ سیاہ دھوتی کا پلّو ہوا میں اُڑ رہا تھا اور گھٹنوں تک پنڈلیاں ننگی ہو رہی تھیں۔''

''استغفراللہ استغفراللہ۔'' قیدی کے پورے بدن میں جُھرجُھری پیدا ہوئی۔ ''اُف خدایا۔۔۔ وہ پنڈلیاں جیسے آسمانی بجلی کی دمکتی ہوئی دھاریں، ملگجے اندھیرے میں بجھتی ہوئی مشعلیں، جیسے شراب کی بلوریں بوتلیں۔۔۔ پھر ان پنڈلیوں کے اُوپر رانیں اور پھر۔۔۔ کولہے اور ناف اور پھر۔۔۔ استغفراللہ استغفراللہ۔۔۔ میرے تصوّر میں اُس جسم کے شیش محل کا نقشہ آراستہ ہونے لگا۔ میرے پورے وجود کے بند مسام بھاپیں چھوڑنے لگے۔۔۔ نعوذ باللہ۔۔۔ استغفراللہ۔ استغفراللہ۔ نعوذ باللہ۔'' قیدی بار بار کانوں کی لَویں پکڑنے اور فرش پر ناک رگڑنے لگا۔ عجب ہیجانی کیفیت جیسے گناہ سے زیادہ اُس کے محرکات کے دباؤ میں ہو۔ اُس لمحے کے نوکیلے پنجے ہر ہر نس کو زخمی کر رہے ہوں اور ساری رگیں وریدیں پھٹ گئی ہوں۔

ماہرِ نفسیات عنایا کے تصوّر میں بھی ایک تصویر بننے لگی۔ اُن بلوریں پنڈلیوں کی نہیں بلکہ ان پنڈلیوں سے ٹکرا کر مشتعل ہونے والے وحشی جذبات کی، جب اُس کے وجود میں بندھے مدرسے کے کٹر ماحول کے سدھائے ہوئے وحشی گھوڑے خودسر ہو گئے، پاگل اُونٹ بے مہار ہو کر ڈکرانے لگے۔ اُس کا وجود بے پناہ فالتو توانائیوں اور بے قابو افعال کا کوئی نقطۂ ارتکاز بن گیا۔ ہر فعل ہر سوچ ان مشتعل توانائیوں سے ٹکرا کر بارُود ہو گئے، جو پھٹنے کے لیے کسی چنگاری کے منتظر تھے۔

قیدی لائنیں بنا کر دوپہر کا کھانا وصول کر رہے تھے۔

''جاؤ تم بھی اپنا کھانا لے آؤ۔''

عنایا نے تصوّر کے غبارے میں جیسے سوئی چبھوئی۔ طاری کیفیت کو جھٹکا لگا لیکن وہ اُٹھا نہیں جیسے وہ اُسی پتن پر کھڑا رہ گیا ہو جب مدرسے کے اس طالبِ علم کے اندر سے کسی دیوانے اُونٹ نے جنم لیا جب شرعی حد بندیاں اپنی ہی شدتوں سے ٹکرا کر ٹوٹ پھوٹ کا شکار تھیں۔۔۔ بس وہ بلوریں پنڈلیاں۔۔۔ جن پر سیاہ چادر پھٹپھٹا رہی تھی اور وحشی منہ زور گھوڑوں کی سرپٹ ٹاپیں پڑ رہی تھیں، تبھی وارڈن کے جھڑکنے اور اُونچا بولنے کی آوازوں نے طاری کیفیت کو چڑمڑا دیا۔ کسی دُور دراز کے گاؤں سے کوئی بے خبر ماں پنجیریاں، ٹکڑے اور دیسی کھانوں کی پوٹلی بھر باندھ، قیدی بیٹے سے ملنے چلی آئی تھی اور اب وارڈن کے پیروں پر سر پٹک رہی تھی وارڈن چیخ رہا تھا۔

''عورت! سمجھتی کیوں نہیں تو۔۔۔ آج ملاقات کا دن نہیں ہے تو کسی وزیر کی رن ہے جو تیرے حکم پر جیل کے دروازے کھول دوں۔ یہ پوٹلی حوالے کر دے اُس تک پہنچ دی جائے گی۔''

عورت پر وحشت حملہ آور ہو گئی اُس کے اندر پاگل اُونٹ ڈکرانے لگے۔ وہ اپنا سینہ کوٹنے اور بال نوچ کر اُڑانے لگی۔

''تو پھر میری آنکھیں بھی نوچ کر ساتھ لے جاؤ۔ دل جگر کے ٹوٹے بھی کھسوٹ کر لے جاؤ۔۔۔ اُسے کہنا ماں کو اپنے بچے سے ملنے کی اجازت نہیں ہے۔ ماں کو۔۔۔ بچے سے۔۔۔ ملنے کی۔۔۔ اجازت۔۔۔''

جنگلی لحن میں بلند ہوتے بین شاید اُس کے بیٹے کی بیرک کے بے حس جنگلے کو بھی پھاند رہے ہوں گے۔ شاید وہ اُن آہنی سلاخوں سے سر بھی ٹکرا رہا ہو گا، جن پر تڑپتے پھڑکتے دل کلیجے اور آنسوؤں بھری لال بوٹی آنکھیں بجھی تھیں۔

''استغفراللہ۔۔۔ استغفراللہ۔۔۔''

پھانسی کے قیدی نے شرعی داڑھی میں اُنگلیاں پھنسائیں اور کانوں کی لویں پھر پکڑیں۔ ''یہ تو یہاں کا معمول ہے۔ یہ مائیں بڑی بے وقوف ہوتی ہیں بس آنسو بن کر بہہ جانے اور جگر پھونک کر مر جانے کے لیے ہی تو بیٹے جنتی ہیں۔''

جنگلی ملن کے سوگوار لحن چناب کے ساکن پانیوں میں جوار بھاٹا اُٹھا رہے تھے۔

''شالا بیٹوں کو بھیڑی دُنیا کی ہوا کبھی نہ لگے۔ مائیں انھیں کوکھ میں رکھ پالیں اور جوان کریں۔''

''تمہاری ماں بھی کبھی آتی ہے کیا۔''

سیاہ داڑھی اور محراب چھپے ماتھے پر ڈھلکی ملوٹی ٹوپی والا چہرہ کرنڈ ہو گیا۔

''نہیں وہ بھی شاید مجھ سے نفرت کرتی ہے۔''

جیل کے ادھ کچرے کھیتوں سے رنگ برنگ چڑیوں کے پرے اُڑے جن کی چونچیں دانوں سے بھری تھیں۔

''جس بھٹی میں تو بھن رہا ہے نا۔ اُس کی حدت اُسے بھی جھلسا رہی ہو گی لیکن وہ اپنی مامتا کے سامنے شرمندہ ہو گئی ہے۔ وہ اپنے قاری اور مؤذن بیٹے کو اس کال کوٹھری میں دیکھنے کا حوصلہ نہیں رکھتی۔ اُسے اپنی کوکھ پر اعتبار نہیں رہا۔''

''استغفراللہ! کاش میں اُسے بتا سکتا کہ میں بُرا نہیں ہاں بُرا وقت مجھ پر آ کر ٹھہر گیا۔ ہونی نے میرا انتخاب کر لیا۔''

''ارے واہ سارے مجرم ایسے ہی کہتے ہیں۔۔۔ کسی پاگل لمحے کا ناگہانی حملہ ہی تو جرم بنتا ہے۔ اس لمحے پر قابو پانا ہی تو انسان کا ظرف ہے، خیر آگے بولو وہ لمحہ تو اب تمہاری گرفت سے چھوٹ چکا ہے۔''

وہ اپنی لال بوٹی آنکھوں کو پھر بے دردی سے رگڑنے لگا جیسے پھانسی پر چڑھنے سے پہلے ان سے چھٹکارا پانا چاہتا ہو جیسے ان کے حصے کی سزا وہ خود اپنے ہاتھوں دینا چاہتا ہو۔ کسی نے اُس کے سامنے کھانا لا کر رکھ دیا تھا ایک پلیٹ میں مرغ کی بوٹیوں والا شوربا۔ دوسری میں بھنڈی کی سبزی اور دو موٹی موٹی روٹیاں۔

''جیل میں کھانا اچھا ملتا ہے۔''

''ہاں رُوح افزاء کا شربت بھی ہر شام کو ملتا ہے دودھ پتی والی چائے بھی دو ٹائم ملتی ہے۔ ہفتے میں تین دن مرغے کا ایک دن بڑا گوشت۔۔۔''

''واہ ہماری جیلیں تو بڑی امیر ہیں۔ باہر غریب بے چارے سوکھی روٹی کے لیے مر رہے ہیں۔ تمہیں پتہ ہے مُلک میں اناج کا قحط پڑا ہے۔ آٹا اتنا مہنگا ہو چکا ہے کہ غریب اپنے بچے بیچ رہے ہیں اور یہاں مجرم عیش کر رہے ہیں۔''

باہر والی چوکی میں بیٹھے وارڈن دُکھیاری ماں کی لائی ہوئی پنجیری یوں حلوؤں پر ٹوٹے پڑ رہے تھے۔ دیسی گھی سے مونچھیں اور اُنگلیاں لتھڑی تھیں اور مرغن غذا کی سیری سے ڈیلے پھٹ کر باہر اُبل آئے تھے جن میں خون بھری موٹی موٹی نسیں پھٹنے کو تھیں۔

''ہمیں جیل کی دُنیا سے باہر کی زندگی کی کیا خبر۔ ہم تو ہر روز موت سے ملنے کو تیار ہوتے ہیں، جب گھڑیال ڈھائی بجاتا ہے تو تہجد پڑھ کر فرشتوں کے قدموں کی چاپ سنتے ہیں۔ نعرۂ تکبیر اللہ اکبر کی آوازوں سے کال کوٹھریاں گونج اُٹھتی ہیں۔ اندھیرے کے ترازو میں آنکھیں بھاری باٹوں کی طرح انتظار کے سیاہ چہرہ پلڑوں میں تلتی ہیں کسی کو کیا معلوم کہ ہر روز موت کا انتظار کرنا کیا ہوتا ہے۔

اور جب وہی گھڑیال چار بجنے کا اعلان کرتا ہے تو سو جاتے ہیں یہ سوچ کر ایک دن زندگی کا مزید بڑھ گیا ہے۔''

''خوش ہو کیا۔''

عنایا نے ہر روز مرنے اور جی اُٹھنے کے احساس کو موت کی جھرجھری کی طرح جھیلا۔

''ہماری خوشی سے زندگی اور تقدیر کو کوئی واسطہ نہیں وہ تو اپنی رفتار اور اوقاتِ مقررہ میں محوِ خرام ہیں۔ پھولوں کو سوگھتی منڈلاتی سنہری تتلی اُس کی ٹوپی میں اُلجھ گئی تھی۔ لیکن دُنیا کے دروازے تو ابھی تمہاری سمت کھلے ہیں۔ تتلیاں منڈلا رہی ہیں۔ خوشبوئیں اُڑ رہی ہیں۔ اشتہا انگیز کھانے مل رہے ہیں اور تم شاعری کر رہے ہو۔''

''تعلیم اچھی لگتی ہے تمہاری۔''

''پتہ نہیں تعلیم وجود میں قید وحشی کو قابو کرتے کرتے بعض اوقات اُسے بے قابو کر دیتی ہے۔ از خود سیکھنے اور سکھانے میں یہی فرق ہے، وہاں سیکھانا جھاڑ دیتا ہے۔ کھانا اُس کے سامنے پڑا ٹھنڈا ہو رہا تھا۔ اُسے رغبت نہ ہوئی۔ مکھیاں اُس کے چہرے اور بازوؤں کو کاٹتی رہیں اُسے احساس نہ ہوا۔ اُس شام کے طلسم میں وہ ماحول سے کٹ چکا تھا اور اندر بھرے بوجھ کو پھر اُنڈیلنے لگا تھا۔

''عورت بضد تھی کہ جوار بھاٹا اُڑاتے دریا کو وہ تیر کر پار کرے گی لیکن مرد یہ خطرہ مول لینے کو تیار نہ تھا، کہ کہیں پیٹھ سے بندھا بچہ کوئی دریائی بلا اُچک نہ لے جائے اور میں نمازِ مغرب کے بعد والی لمبی دُعا مانگ رہا تھا، کہ وہ یہیں رُک جائیں جانہ سکیں پھر میری دُعا قبول ہو گئی دل سے نکلی اور سیدھی عرش کو چھو گئی یوں خود میری دُعا اس حادثے کی تیسری کڑی بن گئی۔ پھر وہ عورت غصے سے اُٹھی تو اُس کی سیاہ دھوتی گھٹنے سے اُوپر ران کی مچھلی تک ہوا ہو گئی۔ قمیص کا دامن ایک جھٹکے سے اُٹھایا اور بچے کو دودھ پلانے لگی۔ پلک جھپکنے میں اس شیش محل

کی ایک جھلک مجھے پورے کا پورا خاکستر کر گئی اُسے احساس تک نہ تھا کہ کوئی تیسرا شخص بھی وہاں موجود ہے۔ عجب جنگلی گھمنڈ تھا اُسے خود پر۔۔۔ دو درخت چھوڑ کر میں بیٹھا تھا لیکن اُن دونوں کے لیے شاید میں نہیں تھا۔ مرد نے ہاتھ بڑھا کر اُسے جھاڑی کے پیچھے گھسیٹ لیا وہ بنا کسی مزاحمت کے گھسٹتی چلی گئی جیسے اندر سے خود بھی یہی چاہتی ہو یونہی جھوٹ موٹ کی ناراض ہو۔ جھاڑی کی تاریکی نے اُنھیں ڈھانپ رکھا تھا لیکن ہیولے واضح تھے۔ مخروطی بناوٹ والی جھلمل مشعلیں نمایاں تھیں۔ مغرب کے بعد والا ملگجا اندھے دریا کے لال پانیوں میں گھل رہا تھا درختوں اور گھنی جھاڑیوں میں شب بسری کے لیے لمبا لیٹ گیا تھا اور باقی ماندہ میری تاریک رگوں میں اُتر گیا تھا۔''

تبھی جیل کی مسجد سے عصر کی اذان گونجنے لگی وہ وہیں خاموش ہو گیا۔ درود شریف کے وِرد میں اُس کے لب ہل رہے تھے۔ مشقتی قیدی اپنی بیرکوں میں لوٹ رہے تھے۔ بندوق بردار سپاہیوں نے اُنھیں گھیر رکھا تھا۔ بیڑیوں کی جھنکار میں وضو والی ٹونٹیوں پر بھیڑ جمع تھی اور سزائے موت کا یہ قیدی امامت کے لیے کھڑا ہوا تھا۔ عنایا کے حلق میں چیخ سی گدرائی ''یا خدا استغفراللہ۔''

جب وہ لوٹا تو عجب آسودہ اور ہلکا پھلکا تھا جیسے دُنیا والی آلائشوں کو کسی رُوحانی چشمے سے دھو آیا ہو۔ اُس نے بنا کچھ اور کہے سلسلۂ کلام وہیں سے جوڑا جہاں سے چھوڑا تھا۔

''اُس کا شوہر چھ فٹ کا کسرتی بدن والا انتہائی مضبوط نوجوان تھا اگر اُسے میرے اِرادے کا علم ہو جاتا تو وہ مجھے چٹکی میں بھر کر مسل ڈالتا اُن سنہری پنڈلیوں کی بھاپ میں بھسم ہونے سے پہلے مجھے اُس پہاڑ سے ٹکرانا تھا۔ مدرسے میں ہر معاملے میں ہمیں رب سے رجوع کرنا سکھایا گیا تھا۔ خدا کی مدد مانگنے میں کام کی نوعیت سے سروکار نہ تھا۔ اب بھی میں عشاء کی نماز کے بعد اپنے پروردگار کے سامنے سربسجود دُعائیں کرنے لگا کہ میرے بازوؤں میں اتنی طاقت دے دے یا خالق یا مالک کہ''

جماعت کے بعد قیدی مسجد کے وسیع صحن میں نوافل کی ادائیگی میں مصروف تھے، جن کی نگرانی بندوق بردار سپاہی کر رہے تھے۔ جب وہ رکوع وسجود میں جاتے تو بیڑیوں کی جھنکار جیل کی بلند فصیلوں پر تنی خاردار تاروں میں جھنجھناتی جن میں برقی رو دوڑ رہی تھی لیکن پرندے جن کے آر پار آزادانہ آ جا رہے تھے۔

سلسلۂ کلام توڑ کر اُس نے چاروں قل پڑھے اور قمیص کا گریبان انگوٹھے اور شہادت کی اُنگلی سے ہٹا کر اندر تین بار پھونکا، عنایا نے سوچا شاید یہ پھونک اس رات بھی خود پر پڑھ کر ماری ہوگی اس نے پھونک مارنے کے بعد اُس نے پھر سلسلۂ کلام جوڑا۔

''کچھ دیر اُن کی کھسر پھسر میرے وجود سے چھٹتی آگ پر تیل کے قطروں کی طرح تڑمڑ برستی رہی، پھر وہ دونوں یکبارگی سو گئے۔ شاید لمبا پینڈا کر کے آئے تھے اور تھکے ہوئے تھے، اُن کی بے خبر نیند اور تھکن کے احساس نے میرے اندر ایک نڈر بے باک مرد کو بیدار کر دیا۔ اگلے ہی لمحے اُس چھ فٹے کڑیل جوان کی موٹی مضبوط گردن میرے کمزور ہاتھوں میں تھی۔ میں مسلسل آیت الکرسی پڑھ رہا تھا کہ کہیں میری گرفت ڈھیلی نہ پڑ جائے اگر وہ اُٹھ کھڑا ہوتا تو پھر مجھے انگوٹھے اور شہادت کی اُنگلی کے بیچ مسل کر پھینک دیتا۔ میں مروڑے چڑھاتا گیا۔ چڑھاتا گیا۔ آخر کھک کی آواز سے منکا ٹوٹ گیا اور گردن اُس سمت لڑھک گئی جہاں وہ بے خبر سو رہی تھی۔۔۔

عنایا کی نظر مدرسے کے اس طالبِ علم کے ہاتھوں پر تھی جنھیں وہ اپنی گفتگو کی وضاحت کے لیے مسلسل استعمال کر رہا تھا۔ اتنا بڑا جرم کرنے والے ہاتھ عام سے انسانوں جیسے ہی ہوتے ہیں کیا؟ قاتل کے ہاتھ دُور سے پہچانے جانے چاہئیں۔ اچھے اور بُرے ہر دو انسانوں کی شباہت کا ایک جیسا ہونا فطرت کی ناانصافی نہیں ہے کیا؟ پرندوں کے پرے درختوں کے جھنڈوں میں اپنا آج کا آخری گیت گا رہے تھے اور وہ کہہ رہا تھا۔

''جب میں نے سیاہ دھوتی میں چھپی اُن پنڈلیوں کو چھوا تاریکی نے اُن کی روشنی تو جذب کر لی تھی لیکن اُن کی مخروطی گھڑت میں سے شرارے اب بھی پھوٹتے تھے، جیسے کرنٹ چھوڑتی ٹیوب لائٹوں کو چھو لیا ہو۔ وہ جاگ گئی تھی حالات کو سمجھنے میں اُسے دو منٹ لگے تب تک ان پنڈلیوں سے چھٹتا یہ کرنٹ میرے پورے وجود کو بھسم کر چکا تھا میرے سر کو وہ چڑھ گئی تھی جو ٹھنڈی ہوئے بنا نہیں اُترتی۔''

باہر پہرے پر الرٹ کھڑے بندوق بردار سپاہی ایک دوسرے کو آنکھ مار کر مسکرائے۔

''اوئے تُو میم صاحب سے بات کر رہا ہے بیرک میں بند قیدیوں کو اپنا کارنامہ نہیں سنا رہا۔ پھڑیں سوچ سمجھ کر مار۔''

پھر وہ دونوں بندوق کے بٹ پر اُنگلیاں بجا کر ہلکے سُروں میں عشقیہ ٹپے گنگنانے لگے۔ وہ رُکا نہیں جیسے اب اُسے سب کچھ اُگل ڈالنے کی چڑھ گئی تھی۔

وہ کھڑی ہوئی اتنی سُرعت سے کہ لیٹنے اور کھڑے ہونے کے درمیان بیٹھنے کا پل آیا ہی نہ تھا۔ نعوذ باللہ، استغفراللہ۔۔۔ اتنی نازک عورت اس قدر خونخوار اور طاقت ور بھی ہو سکتی ہے۔ اُس کے پہلے دھکے سے میں کانٹے دار جھاڑیوں میں گرا جنھوں نے میرے ہاتھ بازو خراش دیئے۔۔۔ وہ اپنے شوہر کو جھنجھوڑنے اور آوازیں دینے لگی۔ میں جھاڑیوں میں سے چیخا۔

''یہ اب قیامت تک نہیں اُٹھے گا۔ ان شاءاللہ۔ اسے میں نے اللہ کا نام لے کر مار دیا ہے صرف تمہیں اپنانے کے لیے، اگر شور بھی کرو گی تو ان شاءاللہ یہاں سننے والا کوئی نہیں آئے گا۔''

پہرے دار سپاہی نے گھڑکا۔

''اوئے مصالحے کم لگا سیدھا سیدھا اپنا جرم اقبال میم صاحب تیری رپورٹ بنانے آئی ہیں، تیرے جرم کے لون مرچ کی نہیں۔۔۔ گرم مصالحہ کم چھڑک، تیری ہسٹری شیٹ میں لکھا ہے، بڑا ہیرو بن رہا ہے۔'' عنایا نے اِشارہ دیا

بولتے رہو۔

اُس نے اپنی لال بوٹی آنکھیں بے دردی سے رگڑیں۔

''اب وہ زخمی شیرنی میرے مقابلے پر تھی میں اکڑوں اکڑوں اُٹھا اور اُسے دبوچ لیا کہ اچانک بچے نے رونا شروع کر دیا۔ اُس کی چیخیں رات کے سناٹے میں پتن کو پاٹتی ہوئی کھیتوں میں سوئے کسانوں کو جگانے لگی تھیں۔ دریا کے اُس پار سے کسی کی کوک بھی سنائی دی جو اُس وقت بجائی جاتی ہے جب لوگوں کو خطرے سے آگاہ کرتے ہوئے مدد کے لیے پکارا جاتا ہے۔ جوابی اطلاعی کُوکیں بھی بڑھنے لگی تھیں۔ بچے کو چپ کروانا میری مجبوری بن چکا تھا۔ اُس کی گردن تو بس ریشم کے دھاگے جیسی۔ انگوٹھے کے دباؤ سے ہی ٹوٹ گئی۔۔۔

''توبہ استغفراللہ استغفراللہ''

''شرعی داڑھی اور اسلامی ٹوپی والا یہ نوجوان جو کچھ اقبالِ جرم کر رہا تھا وہ اُس کی شخصیت سے بالکل میل نہ کھاتا تھا۔ کردار اور تاثر میں اتنا بُعد بھی ہوتا ہے کیا؟۔۔۔''یا خدا انسان کتنا بڑا دھوکا ہے۔''

عنایا بے اِرادہ چیخ پڑی۔

''تم انسان کیسے ہو سکتے ہو تم وحشی درندے ہو۔۔۔''

''میڈم جی! تھا تو میں انسان ہی لیکن ایک پل کے ناگہانی حملے میں ہونی کی زد میں آ کر میرے انسان والے قالب میں کوئی اور داخل کر دیا گیا تھا۔ ممکن ہے کہ وہ پہلے ہی سے وہاں موجود ہو لیکن غفلت کی نیند سویا پڑا ہو حالات نے اُسے بیدار کر دیا ہو۔۔۔''

شام کی چائے پینے کے لیے قیدی لائنیں بنا رہے تھے، توانا، جوان، کڑیل، بے پناہ توانائیوں سے بھرپور، درندے جیسے چڑیا گھر کے پنجروں میں بند ہوں۔۔۔''لیکن چڑیا گھر کے درندے تو معصوم سرشت ہیں۔

''اوئے بکواس جلدی ختم کر چائے کا ٹیم نہ گزار تو نہ پی ہمیں تو پینی ہے۔ کل پھانسی چڑھ گیا تو سارا کھایا پیا ضائع جائے گا نا۔'' سپاہیوں کے جھڑکنے سے وہ پھر رواں ہو گیا۔

''اب وہ زخمی شیرنی از حد خطرناک ہو چکی تھی۔ اُس کے ہاتھ میں اپنے شوہر کی تیز دھار والی کلہاڑی تھی۔ میں نے اُس کی بہت منت سماجت کی کہ دو قتل کی قیمت بہت ہوتی ہے۔۔۔لیکن وہ نہ مانی۔ میں نے اُسے بتایا کہ دو قتل کی اصل وجہ وہ خود ہے۔ میں نے اُس کے سامنے ہاتھ جوڑے کہ میری محنت اکارت نہ کرے۔۔۔لیکن پتہ ہے اُس نے کیا جواب دیا۔''

''اوئے قاری تیری قرأت کا وقت گزر رہا ہے جلدی سمیٹ اسے کیوں پُرسکون کو وحشی بنا رہا ہے۔'' کسی قیدی نے باہر سے ہانک لگائی۔ سپاہیوں نے جوابی مغلظات بکے اور گھٹی گھٹی ہنسی ہنسے۔

''اوئے پہاڑی بکرے جلدی نمٹا اپنے کارناموں کو میم صاحب کو بھی دیر ہو رہی ہے۔''

کسی قیدی نے سپاہیوں کو چائے کے کپ پکڑا دیئے تھے اور وہ سُرک سُرک کر پی رہے تھے جیسے سانپ شوکاریں مارتا ہے اور اُس کے جملوں کی لذت پر تبصرہ کرتے ہوئے ہنس رہے تھے جیسے گدگدی ہو رہی ہو۔

''سر جی! بس آخری واردات رہ گئی ہے۔ سنانے والی، سپاہی نے آنکھ ماری۔ آج اس کے لٹکنے کی کوئی خبر تو نہیں آئی۔''

منہ چڑھے قیدی مسجد سے نکلتے ہوئے جملے اُچھال رہے تھے۔ اوئے نہیں عیش کرنے دے آج کی زندگی اسے مبارک کل کی خبر نہیں۔

''بس کیا بتاؤں میم جی۔ اُس نے خود مجھے یہ راہ سجھائی جیسے قابیل کو کوّے نے سجھائی تھی کہنے لگی۔

''جیتے جی تو تم مجھے ہاتھ نہیں لگا سکتے ہاں میری لاش کو پلید کر سکتے ہو۔''

''وہ سچ کہتی تھی۔ وہ اُس وقت تک مجھ پر وار کرتی رہی جب تک قریبی بستیوں سے لوگ اُس کی مدد کو پہنچ نہ جاتے۔ میں اُس کے وار تو روک سکتا تھا لیکن اُس پر قابو نہ پا سکتا تھا۔ اُس نے کلہاڑی سے میرے سر کا نشانہ لینے کے لیے دونوں بازو فضا میں لہرائے تو میں نے اُچھل کر اُس کی گردن دبوچ لی۔ مروڑے چڑھاتے ہوئے میں نے اُس کی بہت منت کی۔۔۔توبہ توبہ استغفراللہ۔ وہ عورت تھی کہ حسین ناگن اُس کی گردن میرے ہاتھوں میں جکڑی تھی۔ اُس کی سانسیں ٹوٹ رہی تھیں، وہ مر رہی تھی پھر بھی میری رانوں پر کلہاڑی کے مسلسل وار کر رہی تھی۔۔۔لیکن اُس کا ہر وار خطا جا رہا تھا کیونکہ گردن مروڑنے کا اب مجھے تجربہ ہو چکا تھا۔۔۔توبہ توبہ استغفراللہ کتنا مجبور تھا میں۔۔۔اُسی کو مار رہا تھا جس کے لیے دو قتل۔۔۔میں نے آخری بار منت کی میں تمہیں مارنا نہیں چاہتا۔۔۔اگر تم۔۔۔اُس نے آخری قوت لگا کر میری شرعی داڑھی پر تھوک دیا۔ اس کے ساتھ ہی اُس کی گردن لڑھک گئی۔''

عنایا کے اندر بھی اُس کے منہ پر تھوکنے کی شدید خواہش اُبھری لیکن اس نے اس تھوک کو حلق میں اُتار لیا۔ قیدی پر کہانی ختم کرنے والی تھکن طاری ہو رہی تھی وہ اپنی ٹنڈ کو بے تحاشا خراشنے لگا۔

''اب وہ میرے سامنے بے بس پڑی تھی۔۔۔مر کر بھی وہ اتنی ہی خوبصورت تھی جتنی زندہ۔۔۔اُس کا جسم بھی گرم تھا وہ بھی تر و تازہ تھی۔ اُس کے بدن کا پورا شیش محل سامنے کھلا پڑا تھا جس ایوان کی چاہوں سیر کروں۔۔۔کوئی مزاحمت کوئی روک ٹوک نہ تھی۔ میں نے عمر میں پہلی بار کسی عورت کو چھوا تھا وہ بھی مردہ۔۔۔وہ مر کر بھی۔۔۔''

''بس کرو۔''

عنایا کے اندر نفرت اور غصے نے زلزلہ پیدا کر دیا۔

''میڈم جی! چڑھی اُترنے کا دورانیہ اتنا مختصر ہوتا ہے کیا جس چڑھی نے پچھلی شام سے مجھے دبوچ رکھا تھا۔۔۔بس اتنا سا۔۔۔بس اتنا کچھ۔ کل پرسوں جب میں اپنے پروردگار سے ملاقات کروں گا تو پوچھوں گا ضرور کہ ہونی کے واسطے میرا انتخاب ہی کیوں کیا گیا۔''

''چھاپے پہ چھاپا''

شمع خالد
(راولپنڈی)

ٹی وی پر خبر چل رہی تھی کہ ایک سیاست دان کے گھر میں چھاپے کے دوران کئی کلو سونا، نوٹ، ڈالرز، ہیرے جواہرات دکھائے جا رہے تھے۔ اس سے پہلے کراچی کے ایک سیاستدان اور کوئٹہ کے ایک بڑے آفیسر کے گھر سے اتنے نوٹوں سے بھرے بیگ یوں نکل رہے تھے جیسے ہمارے گھروں سے کچرا نکلتا ہے۔ میرے ساتھ میرا چھوٹا بیٹا بھی خبر دیکھ کر گانا گانے لگا تم کتنے چھاپے مارو گے ہر گھر سے سونا نکلے گا۔ میرے کام کرنے والی ماسی صفائی کرتے ہوئے کہنے لگی یہ ٹی وی والے جھوٹی خبریں دکھا کر ہم غریبوں کا مذاق اڑاتے ہیں۔ کل میرا نکا کہہ رہا تھا میں بھی بڑا ہو کر اتنا سونا جمع کروں گا۔

مجھے جھرجھری آئی اور میں نے دل میں سوچا یہ تو حکومت کے نمائندوں کو سوچنا چاہیے کہ یہ دکھا کر وہ محروم لوگوں کی خواہشوں کو بیدار کر دیتے ہیں۔ ماسی سادگی سے پوچھ رہی تھی میں نے ایک فلم دیکھی تھی جہاں پولیس دیواروں، چھتوں جہاں پر ہاتھ مارتی ہے وہاں سے سونے کے سکے برسنے لگتے ہیں۔ باجی ایسے سونے کا کیا فائدہ جسے دیواریں نگل جائیں۔ میرے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہیں تھا۔ میں بھی یہ سوال ذہن میں رکھے تیاری کرنے لگی۔ مجھے سیلاب کی کوریج کے لیے جہلم جانا تھا۔ اس بار زبردست زلزلہ آیا تھا۔

جب میں موقعہ واردات پر پہنچی تو آرمی کی کشتیاں سیف بیلٹ کے ساتھ سیلاب میں گھرے لوگوں کو نکال رہے تھے۔ ہم نے کچھ تصاویر بنائیں اور ایک آرمی آفیسر جس کا نام چھاتی پر لکھا تھا سے پوچھا تو اُس نے مائیک پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ بی بی میرا نام نہ پکاریں میں ڈیوٹی پر ہوں۔ آپ یہ کہہ دیں ایک آرمی جوان نے ہمیں بتایا یعنی میرا رینک بھی نہ پکاریئے گا۔

ہم نے اُن کے نام کو ڈیلیٹ کرتے ہوئے سوال دوبارہ دہرایا تو وہ کہنے لگے۔ سیلاب آنے سے پہلے مسجد کے لاؤڈ اسپیکر سے اعلان کروایا جاتا ہے کہ لوگ محفوظ مقام پر چلے جائیں لیکن لوگ اپنا سامان اور ڈھور ڈنگر چھوڑنے کو تیار ہی نہیں۔ اب بھی چھتوں پر بیٹھے لوگ پہلے اپنا سامان کشتی میں پھینکتے ہیں پھر خود آتے ہیں۔ اس لیے ہمیں لوگوں کو بچانے میں مسائل آ رہے ہیں۔ لوگ اپنی ذات سے زیادہ اپنی قیمتی اشیاء سے کیوں اتنا پیار کرتے ہیں۔

وہاں سے رپورٹنگ مکمل کر کے ریلوے اسٹیشن پر بیٹھے متاثرین سے انٹرویو کیا۔ وہ لوگ نہ صرف خود بچ گئے تھے بلکہ اپنی قیمتی اشیاء بچا کر جہلم ریلوے اسٹیشن پر بیٹھے تھے۔

جب گاڑی میں بیٹھی تو یہ سوال مجھے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر رہا تھا۔ میں نے اس سوال کے جواب کو نفسیات کی کتابوں میں تلاش کے لیے نفسیات کی کتابوں، گوگل اور وکی پیڈیا دیکھنے لگی کہ انسانوں کو دولت، سونا، چاندی زیورات جمع کرنے کا کب اور کیسے شوق ہوا۔ گوگل نے اُن لوگوں کی لسٹ دکھا دی جو صرف مخصوص اشیاء جمع کرتے ہیں مثلاً سکے، ٹکٹ، پرانی نایاب کتابیں، تصاویر، بت اور کبھی کبھی بہت ہی عام چیزیں مثلاً کیپ، شوز وغیرہ۔ لیکن میں تو اُن لوگوں کو کھوجنا چاہتی تھی جو دولت کے ڈھیر جمع کر کے سانپ کی طرح اُس کی حفاظت کرتے ہیں۔ تقسیم سے پہلے امیروں نے مٹی کی ہانڈیوں میں اپنا سونا زمین میں دفن کر دیا۔ لیکن سوال پھر بھی ذہن سے چپک کر رہ گیا۔۔۔ آخر کیوں۔۔۔ سٹین فورڈ گریجویٹ آف بزنس کی اُستاد Itmar Simson نے ان لوگوں کے بارے جو دولت جمع کرتے ہیں اُن کے رویہ کو جذباتیت کے ساتھ جوڑتے ہوئے کہا جذباتی خلفشار کے مریض ہوتے ہیں۔ وہ یہ چیزیں جمع کرتے ہیں یہ رویہ ۱۹ ویں صدی میں بہت عام ہو گیا جسے Cabinet Curiosties کا نام دیا اور اُن لوگوں کے نام لکھے جنہوں نے گھر میں کہیں زمین دوز اور کہیں چھت یا دیوار کے قریب کمرہ بنا کر چیزیں ترتیب سے رکھنے کا رواج دیا۔ اپریل بین سن April Beason اس رویہ کو پرانی زہریلی شراب سے تشبیہ دی۔ وہ کہتی ہیں کہ غیر ضروری اشیاء اکٹھا کرنا شخصیت کے اندر کی کمزوری کو طاقت دینے کے لیے کیا جاتا ہے۔ باقی نفسیات دانوں نے اس کے ڈانڈے بچپن کی محرومی، غربت یا امیر لوگوں کے قریب رہتے ہوئے جوانی میں اپنی محرومی کو خوشی میں بدلنے کے لیے جمع کرتے ہیں۔ اگر ایسا ہے تو سرِ احرام مصر میں تابوت کے پاس خزانہ اور قیمتی پتھر رکھے جاتے تھے۔ قارون کے خزانے کی چابیاں کئی اونٹوں پر رکھی جاتی تھیں۔ چلیں اگر مان لیں کہ بادشاہ ہو یا فرعون ان لوگوں نے دولت دوسروں پر دہشت کے لیے جمع کرتے ہوں گے۔ پھر یہ چھاپے میں اربوں روپے جمع کرنے والے لوگ کون ہیں۔ کس سیارے میں رہنے والے ہیں۔

میں سوچ کے سمندر میں ڈوبی ہوئی تھی کہ میرے ایڈیٹر کا فون آ گیا۔ مجھے غریب بستی میں جانے کا کہا۔ میں گاڑی بھگاتے ہوئے موقع پر پہنچ گئی۔ شکر ہے آگ بجھانے کی گاڑیاں پہنچ گئیں۔ مجھے ایک دم ماسی رمضانی کا خیال آیا۔ میں ہر جمعرات کو رمضانی کو ابو کے نام کی نیاز کا کھانا دینے آئی تھی۔ وہاں پہنچی تو عجیب تماشا دیکھا۔ رمضانی کو آگ بجھانے والے عملے نے پکڑ رکھا تھا۔ میں نے قریب جا کر ماسی رمضانی کو گلے سے لگایا۔ آگ بجھانے والے لڑکے کی توجہ میری طرف ہوئی کہ رمضانی ہاتھ چھڑا کر جھونپڑی کے جلتے حصے میں پہنچی۔۔۔ وہاں سے ایک پوٹلی سینے سے لگائے باہر نکلی۔ آگ نے اُس کے نچلے دھڑ کو جلانا شروع کر دیا۔ فوراً اُسے پانی ڈال کر بھگویا گیا اور اسٹریچر پر ڈال دیا۔ اسٹریچر کے ساتھ آئی نرس نے رمضانی کو دیکھا اور کہنے لگی نچلا دھڑ جل چکا ہے۔ تپش گردوں تک پہنچی ہے۔ وہیں اسٹریچر پر اُسے ڈرپ لگایا جانے لگا۔ رمضانی کی

آنکھیں مجھ سے ملیں۔ درد کی لہروں نے گھیر رکھا تھا مگر اپنے خزانے کو سینے سے لگائے اُس نے دم دے دیا۔ جسم کی اذیت کے باوجود اُس کی آنکھوں میں جو سکون جو طمانیت تھی میں اُس چمک کو آج تک نہ بھلا سکی۔ جلنے کی تکلیف موت کی اذیت اُس لذت کے آگے ہیچ تھی۔

Jerry Bentam, Jhon Still Mill معاشیات کے علم کے دو نامور فلاسفر اس رویہ کو یوٹیلٹی فکشن کہتے ہیں۔ اور اس تھیوری کو سرشاری ذہنی آسودگی کا نام دیا۔ یہ تھیوری اس مرض کو جاننے کے لیے تھی کہ لوگ آخر دولت کیوں جمع کرتے ہیں۔

یہ ریسرچ کرتے ہوئے میں لان میں آ بیٹھی۔ چھوٹی سی جگہ کو میں نے گوشہ عافیت کا نام دیا تھا اور میرا مالی نواز میرا مزاج شناس تھا کہ جس نرسری میں کوئی نایاب پودا ملتا لے آتا۔ وہاں بیٹھے میں نے سوچا اسے معیشت کی نفسیات میں یوٹیلٹی فکشن کے کون سے رویہ کا نام دیا جائے گا۔ اس طرح تو یہ شخص کچھ نہ کچھ کبھی نہ کبھی جمع کرنے لگتا ہے۔ لان پہ نظر ڈالی تو گھاس کچھ بڑھی ہوئی تھی اور پودوں کے پتے کچھ کچھ پیلے پڑ رہے تھے۔ یہ دیکھ کر میرا دل بیٹھنے لگا۔ زور زور سے نواز مالی کو آوازیں دیں تو رشید ڈرائیور بھاگا آیا اور کہنے لگا۔ نواز چاچا کو بہت سخت تاپ ہے کئی بار کہہ چکا ہوں چلو ڈاکٹر سے دوا لے آتے ہیں مگر وہ کسی کی سنتا ہی نہیں۔ میں نے ڈانٹ کر کہا تو آپ کو مجھے بتانا چاہیے تھا ناں۔۔۔ اور میں اُٹھ کر اُس کے کمرے میں گئی۔ دس سال سے نواز میرے گھر کا حصہ بن چکا تھا۔ سارا دن کیاریوں اور باغ میں درختوں کے ساتھ لگا رہتا۔ اُس کے ہاتھ میں اتنی برکت تھی کہ ایک پودے کے چار پودے بنا لیتا تھا۔ وہ بڑے فخر سے کہتا نواز کے ہاتھ جو گملا لگتا ہے سال میں ایک سے چار بن جاتے ہیں۔ اب تو گملے رکھنے کی جگہ نہیں۔ اُس نے کبھی نہ فالتو پیسوں کا تقاضا کیا نہ ہی کبھی چھٹی لے کر گیا۔ صرف چند سال پہلے گاؤں گیا تھا اپنی زمین کو فروخت کرنے۔ اُس نے کبھی اپنے گاؤں اپنے بیوی بچوں کا ذکر نہ کیا بس وہ پودوں کو ہی اپنا بچہ کہا کرتا۔

اُس کی بیماری کا سُن کر میں سرونٹ کوارٹر پہنچی تو میری چیخ نکل گئی۔ نواز کی جگہ ایک ڈھانچہ بستر پر پڑا تھا۔ میں نے ایک دو مہینے مصروفیت کی وجہ سے اسے دیکھا نہیں اور وہ ایک ڈھانچہ بن گیا تھا۔ ڈرائیور کو بلوایا اور اُسے نواز کو ہسپتال لے جانے کے لیے کہا۔ نواز نے ہمیشہ کی طرح جانے سے انکار کر دیا۔ پھر میرے بار بار کے اصرار پر نواز نے کہا آپ وعدہ کریں میرے کمرے میں کسی کو نہیں آنے دیں گی۔ کمرے کی چابی اپنے پاس رکھیں گی۔ میں نے اُس سے وعدہ لے لیا۔

بمشکل اُسے گود میں اُٹھا کر ڈرائیور ساتھ لے کر گیا۔ مالی نواز نے اپنی چابی میرے ہاتھ میں تھما دی۔ ہسپتال میں اُس کا بہترین علاج ہو رہا تھا لیکن اب بیماری آخری اسٹیج پر تھی۔ جگر، گردے کام چھوڑ چکے تھے۔ پھولوں پھلوں سبزہ کا عاشق اب خود زمین میں دفن ہو رہا تھا۔

باقی نوکروں سے پوچھا اُس کے گاؤں کے بارے میں کوئی جانتا ہے تو سب نے ایک زبان ہو کر کہا ''جی نہیں'' بس وہ کہتا تھا بہت دور پہاڑوں کے اُس پار سوات سے آگے کا وہ رہنے والا ہے۔ کسی بہن بھائی اُس کے بچوں کا اتا پتا سب خاموش رہے۔ میں نے اپنے آپ کو کوستے ہوئے سوچا ایک شخص دس سال تک میرے زیر کفالت رہا اور میں یہ بھی نہیں جانتی وہ کون تھا کہاں سے آیا تھا۔

لاش کو بے حرمتی سے بچانے کے لیے میں نے اپنے شوہر اور محلّہ والوں کی مدد سے قریبی قبرستان میں دفن کروا دیا۔ پہلے سوچا ملازمین سے اُس کا کمرہ صاف کروا دوں۔ پھر اُس سے کیا وعدہ یاد آ گیا۔ اور یہ بھی سوچا کہ اُس کا اتا پتا شاید مل جائے۔ یہ خیال آتے ہی ملازم کو ساتھ لے کر اُس کے کمرے میں گئی۔ بستر کو اُٹھایا تو گدے کے نیچے ایک بوری پڑی تھی۔ نواز نے یہ کاغذ بھلا کیوں جمع کر رکھے ہیں۔ یہ سوچتے ہوئے بوری کھولی۔ بوری میں نوٹ بھرے تھے۔ ساتھ ہی ایک کاغذ پڑا تھا جو مکان فروخت کرنے کی رسید تھی۔

میں نے نوٹوں کی بوری کو اٹھوا کر ڈرائیور کو کچھ پیسے دینے کے بعد نواز کے گاؤں بھجوا دیا۔ ہفتے بعد وہ واپس آیا۔ تو بتایا کہ نواز ایک دفعہ گاؤں آیا تھا۔ بیوی نے ایک مرد کو گھر میں رکھ لیا تھا بیٹا اُسی دن گھر سے بھاگ گیا تھا۔ نواز نے بیوی کو گھر سے نکالا اُسے طلاق دی اور مکان بیچ کر واپس آ گیا۔ ڈرائیور واپس آتے ہوئے مسجد کی دیوار اور ایک پرچون کی دکان پر نواز کی موت کی خبر اور اپنا فون نمبر لکھ کر آ گیا۔

اس واقعہ کو گزرے تین مہینے ہو گئے۔ میں پریشان تھی کہ نواز کی بوری سے نکلے پانچ لاکھ روپے کا کیا کروں۔ بار بار خیال آتا اُس کو جو کھانا ہم دیتے وہ کھا لیتا تھا۔ کپڑے بھی عید تہوار پر نئے اور عام طور پر صاحب کے پرانے کپڑے جوتے دیا کرتی تھی۔ کیا کبھی اُس کا کسی چیز کے کھانے کو جی نہیں کیا ہوگا۔ کبھی اچھے کپڑے کیوں نہ بنوائے۔ وہ بوری میں نوٹ رکھ کر کونسی سرخوشی پا رہا تھا یہ خود کو اذیت دینے والی لذت تھی جو اُسے نوٹ پر سونے سے ملتی ہوگی۔

ایک دن اچانک ڈرائیور نے بتایا نواز کا بیٹا آیا ہے۔ میں نے شکر ادا کیا کہ آج میرے دل و دماغ سے بوجھ اتر گیا۔ سرونٹ کمرے میں اُس کو بٹھایا جب وہ چائے وغیرہ پی چکا تو میں اُسے ملنے کے لیے گئی۔ لڑکا بالکل اپنے باپ جیسا تھا۔ میں نے جب اُسے پانچ لاکھ کا بتایا تو وہ ایک دم کھڑا ہو گیا۔ پھر گھبرا کر بیٹھ گیا۔ میں تو آپ سے نوکری مانگنے آیا ہوں۔ میں ان پیسوں کا کیا کروں گا۔

کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد وہ بولا:

''آپ مجھے ان پیسوں کا چیک بنوا دیں۔ میں اپنے گاؤں میں مسجد کے ساتھ مدرسہ کو پکا کروا دوں گا اور چھت میں پنکھے اور ہیٹر لگا دوں گا اس کا ثواب میرے ابا کو جائے گا اور مجھے آپ ابا کی جگہ رکھ لیں۔ میں ہر مہینے آدھی تنخواہ دادی کو بھجوا دوں گا۔''

اور میں سوچنے لگی دونوں باپ بیٹا یوٹیلٹی فکشن کے دو الگ الگ پلڑوں میں بیٹھے نظر آئے۔

صندل کی خوشبو

رخسانہ صولت سلیمی
(اسلام آباد)

میں پتھریلی چٹانوں پر چڑھتے چڑھتے تھک گئی تھی سوچا ذرادم لے لوں تو آگے چلوں میرے پاؤں میں جابجا آبلے بھی پڑ چکے تھے پہاڑوں میں رہنا اور پھران سے دوستی نہ کرنا کیسا لگے گا۔ مجھے پہاڑ بہت برے لگتے ہیں کیوں؟ ایک بار میں اسے کہہ بیٹھی یہ تو تمہارا مسکن ہے۔ تمہیں رزق دیتے ہیں ساری دنیا کے لوگ ان پہاڑوں کی گود کو ترستے ہیں اور تم ہو کہ۔

''خیر..... یہ تمہارا اپنا مسئلہ ہے نفرت کی کوئی وجہ تو ہونی چاہیے؟

''میں نے کہا! تم دیکھ نہیں رہے۔ ہمارے گھر تباہ ہو رہے ہیں ان پہاڑوں کے عقب میں بسنے والے ہمیں جینے نہیں دیتے۔ وہ ہم سے ہمارا ٹھکانہ چھین لینا چاہتے ہیں کیوں؟ ان کے اپنے پاس بھی پہاڑ ہیں دریا ہیں۔ خوبصورت وادیاں ہیں جن میں ہمارے پیارے آباد ہیں۔ مگر یہ لوگ ان کو جینے نہیں دیتے۔ کالے بھتنے جیسے مارواڑی!

میں جلی بھنی یہ سب کہتی رہی شاہ زور یہ سب سنتا رہا۔ تم کو پتہ ہے کہ وہ سامنے جو نظر آرہا ہے ہمارا ہی علاقہ ہے۔ جو بدطینت انگریزوں کی کارفرمائی کے سبب ہمارے ملک کا حصہ نہیں بن سکا خیر ستر برس ہو گئے ہمارے ملک کو آباد ہوئے۔ مگر لکیر کے اس پار بسنے والے آزادی کی جنگ لڑ رہے ہیں ہزاروں شہیدوں کے خون نے جنت نظیر وادی کی مانگ میں سندور بھر دیا۔ خوبصورت ڈل جھیل میں تیرتے بجرے سجے بنے کسی دلہن کی طرح ہزاروں لڑکیوں کی ڈولیاں ان بجروں میں سجیں۔ مجھے یہ یاد آیا وہ بھی تو اسی وادی سے آیا تھا اس کی بہن کی ڈولی اٹھنا تھی اس نے مجھے بھی بلایا تھا میں اس دیس کیسے جاتی۔ وہ کہتا تھا ایک دن وہ دیس بھی ایسا ہی ہوگا جس کے درمیان بسنے والا دریائے پونچھ کا پانی ساری نفرتوں اور رکاوٹوں کو اپنے ساتھ بہا کر لے جائے گا۔ یہ لکیر مٹ جائے گی جسے دنیا ڈیونڈر لائن کہتے ہیں۔ یہ کیسا قانون ہے۔ یہ کیسا سماج ہے اپنی مرضی سے جینے والے اپنے لیے آزاد ملک کا انتخاب نہیں کر سکتے مجھے یاد آیا میرے بابا جی پچھلے برس جموں کشمیر گئے تھے۔ دوستی بس کے ذریعے ان کا ذریعہ معاش میوہ جات اور ہنڈی کرافٹس اور گرم کپڑوں کی تجارت تھی وہ آرام سے سرحد پار آتے جاتے تھے ان کا آدھا خاندان اسلام آباد میں بستا تھا۔ یہ پاکستان کا کیپٹل نہیں مقبوضہ علاقے میں بھی ایک شہر کا نام اسلام آباد ہے شائد قدرت نے اس خطے کے نصیب میں بھی یہی لکھا ہے کل وہ ایک آزاد ریاست ہوگی جہاں زعفران کے پھول کھلتے ہیں جس کی جھیلوں میں صندل کی مسحور کن خوشبو رچی ہے پیار اور محبت کے پھولوں سے گندھی یہ حسین وادی میرا مسکن بننے جا رہی تھی۔ مجھے دلہن بنا کر لے جانے والا اس وادی کا ایک خوبصورت اور ذہین نوجوان تھا وہ شاعر بھی تھا اور دلنواز بھی تھا وہ مجاہد بھی تھا اور جی دار بھی تھا۔ مجھے یاد نہیں وہ کب اور کیسے میری زندگی میں آیا ہاں یہ ضرور پتہ ہے کہ جب وہ پہلی بار مجھے ملا تو ایک گائیڈ کے روپ میں تھا میں ایک مجاہدین کے کیمپ میں گئی تھی سوشل ورک میری زندگی کا ایک ایسا پہلو ہے جسے لوگ جانتے بھی ہیں اور نہیں بھی۔ میں اپنا کام خاموشی سے کرتی ہوں میرے ساتھ میرے جیسے بہت سے لڑکے لڑکیاں ہیں جو صرف کام کرنا چاہتے ہیں۔ انہیں نام ونمود کی خواہش نہیں۔ یوں ہم گروپ کی شکل میں چلتے ہیں اور آگے جا کر ان پہاڑوں کی بھول بھلیوں میں ٹکڑیوں میں بٹ جاتے ہیں اپنے اپنے کیمپ کی جانب کسی کو فسٹ ایڈ دینی ہے کسی کو کپڑے جوتے اور بستر دینے ہیں کہیں خوراک دودھ اور راشن پہنچانا ہے۔

ہمارا کام مجاہدین کے ساتھ بازو سے بازو اور پاؤں سے پاؤں ملا کر چلنا ہے مگر اپنے اپنے راستے پر مجھے یاد آرہا ہے چند ماہ پہلے مجھے ان پتھریلی چٹانوں میں ایک زخمی لڑکی پڑی ملی تھی شائد اسے دریا کی لہروں نے مردہ سمجھ کر اگل دیا۔ مجھے اس کے دریدہ جسم سے ان پانیوں کی مہک آرہی تھی جنہوں نے اپنی گود میں اسے دبوچ لیا تھا صندل کی خوشبو اس کے بالوں سے لپٹی ہوئی تھی مگر اس کی چھاتیاں ادھڑی ہوئی تھیں اس کی ٹانگوں اور بازو پر دانتوں کے کاٹنے کے نشان تھے۔ بھیڑیوں نے اسے چیر پھاڑ کر دریا میں پھینک دیا تھا شائد اس طرح ان کا پاپ چھپ جائے گا۔ مگر شاید اسے ابھی اپنی شناخت بتانی تھی اس کی سانس چل رہی تھی حیرت سے ہم اپنی جگہ سن ہو گئے۔ اتنے برف پانیوں میں بہتی یہ زندہ لاش۔ کہیں ہمارا دھوکہ تو نہیں۔ مگر قدرت اپنے معجزے دکھانا چاہتی ہے وہ جب تک نہ چاہے کوئی مر نہیں سکتا وہ کھلی آنکھوں سے اپنی قدرت کا نظارہ کراتی ہے میرے ساتھیوں نے اسے اٹھایا کمبل میں لپیٹا اور اپنے مرکز میں لے گئے اس کی دلدوز داستان سننے کی ہمیں ضرورت نہیں تھی۔ یہ اس جنت نظیر میں دراندازبھیڑیوں کی وہ خون آشام تصویر تھی وہاں لڑکیوں کا کنوارپن چھینا جا رہا ہے سیکس زدہ بیمار ذہنوں کے مدراسی مرہٹے ہندو بنیے اپنے نفس کے غلام جن کی رال ٹپکاتی لمبی لمبی زبانیں معصوم کشمیریوں کے خون سے آلودہ تھیں انہیں کیا پتہ آزادی کے متوالے ہر قربانی دیتے ہیں ہندو انہیں غلام بنا کر نہیں رکھ سکتا انتہاء پسند پنڈتوں کا کشمیری بیٹیوں سے اپنے حجلے آباد کرنے کا خواب بہت مہنگا پڑے گا میں دل میں سوچتی رہی وہ حسین نازک دوشیزہ ہندو بھیڑیوں کے ہاتھوں زخمی ہو کر کیسے زندہ رہی مجھے تو اس کا جواب مل چکا تھا میرا دوست مجھے اس خوبصورت وادی میں لے جانا چاہتا تھا میں بضد تھی پہلے یہ نحوست کی لکیر مٹاؤ میں نہیں چاہتی کہ میرا ایک قدم ادھر ہو اور دوسرا قدم غلامی کی زنجیروں میں پھنس جائے۔ ہم دونوں مل کر اسی مقصد کے لیے لڑ رہے ہیں ہماری جنگ تو جاری ہے تم دیکھنا کشمیری مسلمانوں کے خون سے وہ تاریخ لکھی جاری ہے جسے رہتی دنیا تک آزادی کے متوالے اپنے لیے

باقی صفحہ ۹۷ پر ملاحظہ کیجیے

مٹھی میں جگنو

فرح کامران
(نیویارک)

صبح سے گھر میں ایک ہنگامہ مچا ہوا تھا۔ ماں دونوں ہاتھوں سے کبھی اپنا سینہ اور کبھی سر پیٹ پیٹ کر کہہ رہی تھی " کیا اسی دن کے لئے میں نے تجھے پیدا کیا تھا کہ بڑی ہو کر تو میرا منہ کالا کرے، تو نے میری پرورش کا یہ صلہ دیا کم بخت، ہائے میں یہ دن دیکھنے سے پہلے مر کیوں نہ گئی۔" باپ کبھی ماں پر دھاڑتا " یہ تیرے ہی بے جا لاڈ پیار کا نتیجہ ہے، بہت سر چڑھا رکھا تھا اس کو" تو کبھی غصے سے اس کی طرف لپکتا، " ارے کچھ تو خیال کر لیتی، تُو تو سید زادی تھی، تجھے اپنے حسب نسب کا بھی خیال نہ آیا۔" بھائی غصہ سے پاؤں پٹکتے ہوئے آیا اور بولا، " اگر آئندہ تو نے گھر سے باہر قدم نکالا تو تیری ٹانگیں توڑ دوں گا۔" اور زور سے اخبار اس کے منہ پر دے مارا۔ ہلکے پھلکے کاغذ پر سیاہ بے وزن حروف کی سختی کسی زوردار طمانچے سے کم نہ تھی۔ اخبار اس کے منہ پر ہمیشہ کے لئے ایک نشان چھوڑ کر سامنے پڑا تھا۔

سارہ کچھ دیر اخبار پر نظریں جمائے رہی پھر اخبار اٹھایا اور خاموشی سے اپنے کمرے میں چلی گئی۔ دروازہ بند کر کے وہ بے سدھ ہو کر اپنے بستر پر لیٹ گئی۔ شاید رونا چاہ رہی تھی لیکن آنسو باہر آنے کو تیار نہ تھے۔

سارہ زیدی، امجد حسین زیدی کے گھر میں پانچواں اضافہ تھی۔ اس سے بڑی تین بہنیں تھیں اور سب سے بڑا بھائی۔ اس کے ماں باپ کو ایک اور بیٹے کی شدید خواہش تھی کیونکہ ان کا خیال تھا کہ بھائی کے لئے بھائی ضروری ہے اور باپ کے لئے بھی کم از کم دو بازو تو ہونے چاہئے۔ لڑکی تو ایک بھی نہ ہو تو اچھا ہے۔ صفیہ بیگم اسی خواہش میں تین بیٹیوں کو جنم دے چکی تھیں۔ اور سارہ کی دفعہ تو منتوں مرادوں اور ٹونے ٹوٹکے میں کوئی کسر نہ چھوڑی تھی، لیکن پھر وہی بیٹی۔

سارہ کی حیثیت گھر میں ایک بے ضرورت اضافہ کی تھی۔ ماں دوسرا بیٹا نہ ہونے کا غصہ اسی پر اتارتی، ہر وقت کی جھڑکیاں اس کا مقدر تھیں۔ دوسری بہنوں اور سارہ کی عمر میں خاصا فرق تھا اس لئے ان سے کبھی ذہنی مطابقت نہ ہو سکی۔ وہ تو بھلا ہو خالہ جمیلہ کا جنھوں نے اپنا دست شفقت سارہ کے سر پر رکھا ہوا تھا۔ اللہ نے اولاد کی نعمت سے محروم رکھا تھا اس لئے ساری ممتا سارہ پر ہی نچھاور ہوتی۔ قریب ہی رہتی تھیں۔ شام کو روز اسے اپنے گھر لے جاتیں، بالوں میں تیل ڈال کر کنگھی کرتیں، اس کے لئے کپڑے سیتیں۔ اس کی پسند کے کھانے پکا کر کھلاتیں۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ جیسے وہ سارہ کو گود لے چکی ہوں۔ وہ اکثر اس کی ماں کو سمجھاتیں کہ بیٹیاں اللہ کی رحمت ہوتی ہیں، ان سے اس قدر خائف نہ رہا کر۔ صفیہ بیگم چڑ کر جواب دیتی، ' تمھاری چار چار بیٹیاں ہوتیں تو پھر میں تم سے پوچھتی۔"

سارہ کبھی گڑیوں سے نہیں کھیلی۔ محلے کی لڑکیاں اپنی گڑیوں کی شادی پر اس کو بلاتیں تو وہ چلی جاتی لیکن دل میں سوچتی کہ یہ بھی کوئی کھیل ہوا بھلا، گڑیا خریدو اس سے کھیلو اور جب اس کی عادت ہو جائے تو خوب بنا سنوار کر اس کو دے دو جس کے پاس گڈا ہے۔ وہ دیکھتی کہ جن لڑکیوں کے پاس گڈے ہوتے تھے وہ بہت خوش ہوتی تھیں، ان کے چہرے پر ایک فتح کا احساس ہوتا تھا اور جن کے پاس گڑیاں وہ بیچاری اداس اور افسردہ نظر آتی تھیں۔ پھر فوراً ہی اس کو اپنی ماں کا چہرہ یاد آ جاتا جو اس سے ہر وقت بیزار رہتی تھی لیکن بھائی کو دیکھتے ہی کھل اٹھتی تھیں۔ اس کو بڑی الجھن ہوتی تھی اس گڑیا گڈے کے کھیل سے۔

باغ میں جب اس کی سہلیاں تتلیوں کے پیچھے بھاگتی اور ان کو پکڑ کر خوش ہوتیں یا درخت کی شاخ سے لٹکے جھولے پر جھولتے ہوئے بات بے بات قہقہے لگاتیں تو وہ کسی کونے میں بیٹھ کر قریبی سڑک پر فراٹے بھرتی گاڑیوں کو دیکھتی، آسمان پر پرواز کرتے پرندوں کو دیکھتی رہتی۔ گرمیوں کی راتوں میں جب دوسری لڑکیاں جگنو اپنے مٹھی میں بند کر کے ایک دوسرے کو دکھاتیں تو سارہ انگلیوں کے درمیان سے باہر نکلتی ہوئی روشنی پر نظر جمائے رہتی۔ وہ دیکھتی کہ مٹھی چاہے کتنی ہی زور سے بند کی جائے لیکن ہر تھوڑی دیر بعد جگنو کی روشنی مٹھی سے باہر نکلتی۔ کہنے کو وہ بھرے گھر میں رہتی تھی۔ آس پڑوس میں سہلیاں بھی تھیں لیکن ان سب کے درمیان وہ اپنے آپ کو اکیلا محسوس کرتی تھی۔ بس ایک خالہ جمیلہ تھیں جن سے وہ کچھ باتیں کر لیتی اور وہ بھی اس کے اوٹ پٹانگ سوالات کے حتی المقدور جوابات دیتی رہتیں۔

سکول میں سارہ کا شمار اچھی طالبات میں ہوتا تھا۔ پڑھنے لکھنے میں اس کو بہت مزہ آتا تھا۔ کلاس میں ہمیشہ اچھے نمبر لیتی لیکن وہ محسوس کرتی کہ ماں باپ اس کے بھائی کی کامیابی پر تو خوش ہوتے، لیکن اس کی کامیابی کو کوئی حیثیت نہ دیتے۔ وہ چاہے کتنے ہی اچھے نمبر لے آئے اس کو کبھی نہیں سراہا جاتا۔ زندگی میں کچھ مختلف کرنے اور ماں باپ کا دل جیتنے کی خواہش اس کو پریشان کرتی رہتی۔

وقت گزرنے کا کچھ پتا ہی نہیں چلا۔ بچپن سے جوانی تک کے سفر میں دیر ہی نہیں لگی۔ میٹرک کا امتحان اس نے اچھے نمبروں سے پاس کیا۔ لیکن وہ گھر میں پھر بھی کسی کو خوش نہیں کر سکی۔ بلکہ بھائی سے تو جیسے اس کی کامیابی برداشت ہی نہیں ہو رہی تھی۔ وہ بڑی مشکلوں سے ایف اے پاس کر پایا تھا۔ دو بڑی بہنوں کی میٹرک کے فوراً بعد شادی ہو گئی تھی، ایک بہن نے میٹرک کے بعد پڑھائی کو خیر آباد کہہ دیا تھا اور اب گھر میں بیٹھ کر شادی کے خواب دیکھ رہی تھی اور ماں اس کی شادی کی عمر نکل جانے کے خوف میں ہلکان ہو رہی تھی۔

سارہ نے آگے پڑھنے کی خواہش ظاہر کی تو گھر میں ہنگامہ کھڑا ہو گیا۔ " ہمارے خاندان میں آج تک کوئی لڑکی کالج نہیں گئی خبردار جو ایسا سوچا

بھی" باپ نے فیصلہ کن الفاظ میں کہا۔ گھر والوں کا خیال تھا کہ جو لڑکیاں کالج جاتی ہیں وہ خراب ہو جاتی ہیں۔ گھر سے کالج خاصے فاصلے پر تھا جس کے لئے بس لینی ضروری تھی۔ اور کالج بس بھی ان کے محلے میں نہیں آتی تھی۔ " اب کیا تم مردوں کے ساتھ بس میں سفر کرو گی۔۔۔ ایسا نہیں ہوسکتا، ہم اپنی عزت خاک میں نہیں ملا سکتے"۔ بھائی نے اپنے باپ کا ساتھ دیتے ہوئے کہا۔ ماں کا بھی یہ ہی خیال تھا کہ کالج جانے سے بہتر ہے کہ وہ اب گھر گرہستی سیکھے۔ آگے کی زندگی میں یہ ہی کام آتی ہے۔

کالج میں داخلے کا وقت گزرا جا رہا تھا۔ رہ رہ کر سارہ کا دل بیٹھا جا رہا تھا۔ کوئی اس کی بات سننے کو تیار نہ تھا۔ لے دے کے ایک خالہ جمیلہ ہی تھیں جو اس کی بات سمجھ سکتی تھیں۔ بس وہ ان کی گود میں سر رکھ کر خوب روتی رہتی اور زور دیتی کہ وہ اس کے ماں باپ سے بات کریں۔ خالہ جمیلہ پہلے تو گھبرائیں پھر اس سے وعدہ لیا کہ وہ اپنے بہن بہنوئی سے ضرور بات کریں گی۔ بحث مباحثے کے بعد آخر کار خالہ جمیلہ اپنی بات منوانے میں کامیاب ہو گئیں۔ صفیہ بیگم نے اپنی بہن جمیلہ سے وعدہ لیا کہ کچھ غلط نہیں ہونا چاہئے اور اگر ہوا تو اس کی ذمہ دار وہ ہوں گی۔ خالہ جمیلہ نے یہ بات سارہ کو اچھی طرح سمجھا دی تھی کہ دیکھ کوئی اونچ نیچ نہیں ہونی چاہئے ورنہ آگے میں تیری مدد نہیں کر سکوں گی۔ صاف لگ رہا تھا کہ وہ بھی اندر سے ڈر رہی ہیں۔ "ارے میری اچھی سی پیاری سی خالہ کچھ نہیں ہو گا۔۔۔ آپ دیکھئے گا کہ میری وجہ سے ایک دن آپ کا سر فخر سے بلند ہوگا۔۔۔ اور وہ دن بھی ضرور آئے گا جب اماں، ابا اور بھائی بھی مجھ سے خوش ہوں گے"۔

سارہ کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔ خالہ جمیلہ کے ساتھ جا کر وہ اپنے یونیفارم کے لئے کپڑے لے کر آئی، خالہ جمیلہ نے بڑے شوق سے سارا کا یونیفارم سیا، انھوں نے ہی کتابیں لے کر دی اور آخر کار کالج کا پہلا دن آ پہنچا۔ اس کا بہت دل چاہ رہا تھا کہ خالہ جمیلہ کی طرح اس کے گھر والے اس کے کالج جانے پر خوش ہوں لیکن ان کے چہرے کی مسلسل ناگواری نے اس کو اداس کر دیا۔ سارہ سفید یونیفارم پہن کے، ہاتھوں میں کالج کی کتابیں لے کر کالج کے لئے نکلی تو تازہ ہوا نے اسے نہال کر دیا/ اس کا استقبال کیا۔ اس نے مسکراتے ہوئے بلند پرواز کرتے ہوئے پرندوں کو دیکھا اور تیز تیز قدموں سے کالج کی طرف روانہ ہوگئی۔

شروع شروع میں تو کچھ دن اس کا بھائی اس کو کالج چھوڑنے جاتا اور سختی سے تلقین کرتا کہ کہ جب تک وہ لینے نہ وہ کالج سے باہر قدم نہ نکالے۔ لیکن پھر روز کی یہ ذمہ داری اس کو کھلنے لگی۔ بھائی کو ویسے بھی صبح اٹھنا زہر لگتا تھا۔ اس نے ایک دن تنگ آ کر ماں باپ سے صاف انکار کر دیا سارہ اب اکیلے ہی کالج جانے لگی۔ آتے جاتے لڑکے اس پر آوازیں کستے، اس کا پیچھا کرتے، کچھ نے تو باقاعدہ یہ ذمہ داری اٹھالی۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ لڑکے اس دن کے منتظر تھے کہ کب اس کا بھائی اس کو کالج چھوڑنے جانا ترک کرے اور کب وہ اس کی پہرہ داری کا کام سنبھالیں۔ لیکن سارہ اپنے آپ کو بڑے سنبھال کر چلتی رہی۔ سر پر چادر اوڑھے، نظریں نیچی کر کے۔ لڑکوں کی نظروں اور آوازوں سے بچتے بچاتے وہ اپنے کالج کے سفر کو بہت تیزی سے جاری رکھے ہوئے تھی۔ کالج میں اس کو اپنے جوہر دکھانے کا خوب موقع ملا۔ پڑھائی میں تو وہ اچھی تھی ہی اس کے علاوہ غیر نصابی سرگرمیوں میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیتی، چاہے تقریری مقابلہ ہو یا ڈرامہ، بزم ادب کی کوئی محفل ہو یا کھیل کا میدان، ہر جگہ اس کی موجودگی ضروری سمجھی جانے لگی۔ آئے دن کسی نہ کسی مقابلے میں وہ ٹرافی جیتتی، لیکن وہ جیتی ہوئی ٹرافیاں اپنے گھر والوں کو دکھاتی بھی نہیں۔ وہ ان کے چہروں پر ناگواری کے تاثرات دیکھ کر اپنی خوشی کو خراب کرنا نہیں چاہتی تھی۔ ہاں البتہ خالہ جمیلہ بہت خوش ہوتیں۔ اس کا ماتھا شفقت سے چوم کر اس کو مزید کامیابی کی دعائیں دیتیں۔ خالہ جمیلہ سارہ کو سمجھتی تھی۔ وہ اکثر اس کے حوصلے بڑھانے کے لئے ایک لڑکی کی مثال دیتیں جو ان کے محلے میں رہتی تھی۔ وہ بتاتی کہ وہ کس قدر ذہین لڑکی تھی، اور اس کو آگے بڑھنے کے لئے گھر والوں اور دنیا کے کتنے سخت رویوں کو سہنا پڑا۔ لیکن اس نے بہت ترقی کی، دنیا مین اپنا نام بنایا۔ سارہ ایک لمحہ کے لئے سوچتی کہ آج کے زمانے میں اس کے گھر والے اس کی قابلیت کو قبول نہیں کر رہے تو اس زمانے میں کیا کرتے ہوں گے۔ شاید خالہ جمیلہ کسی خیالی دوست کے بارے میں بات کرتی تھیں۔ کبھی ایسا محسوس ہوتا کہ وہ لڑکی وہ خود تھی جو بہت کچھ کرنا چاہتی تھی لیکن کر نہیں پائی اور اب سارہ کے روپ میں اپنے آپ کو دیکھ رہی تھی اور اپنی کوئی دبی ہوئی خواہش کو پورا کرنا چاہتی تھی۔ سارہ نے غیر شعوری طور پر خالہ جمیلہ کے خیالی دوست کو اپنا آئیڈیل تصور کر لیا تھا۔ وہ بھی اس لڑکی کی طرح بننا چاہتی تھی۔

دیکھتے ہی دیکھتے کالج کا آخری سال آ گیا۔ سارہ یہ سوچ کر اداس ہو جاتی کہ جلد ہی کالج کے ساتھ ساتھ اس کی آزادی بھی ختم ہونے والی تھی۔ گھر کے فرسودہ ماحول میں اس کا دم گھٹتا تھا اور کالج کی وجہ سے جو وقت اپنی مرضی سے گزار لیتی تھی اب وہ میسر نہیں ہوگا۔ اس کے دل میں یونیورسٹی جانے کی خواہش بار بار سر اٹھا رہی تھی، اور وہ مسلسل کوشش کر رہی تھی کہ یہ بات اس کے دل سے نکل جائے۔ وہ جانتی تھی کہ یہ ممکن ہی نہیں، نہ ہی اس کے گھر والے اس کو اجازت دیں گے اور نہ ہی وہ خرچہ اٹھانے کے قابل ہیں۔ خالہ جمیلہ پر پہلے ہی بہت بوجھ پڑ چکا ہے۔ لیکن پھر بھی وہ اپنے دل کو سمجھا نہیں پا رہی تھی۔ وہ بس سٹاپ پر کھڑی ہوتی تو اکثر وہاں سے یونیورسٹی کی بس گزرتی۔ وہ بڑی حسرت سے بس کو دیکھتی اور اس وقت تک دیکھتی رہتی جب تک وہ نظروں سے اوجھل نہ ہو جاتی۔ وہ جانتی تھی کہ جو کچھ اب تک اسے مل گیا وہ بہت ہے۔ گھر والے اس کی شادی اس کے ماموں کے بیٹے سے کرنا چاہتے تھے، وہ بھی اس کے بھائی کی طرح ایف اے سے آگے نہیں پڑھ سکا تھا اور ڈھنگ کا کام بھی نہیں کرتا تھا۔ سارا یہ سوچ کر پریشان ہو جاتی کہ مزاج اور تعلیم کے فرق کے ساتھ زندگی بھر کا ساتھ نبھانا کتنا دشوار ہوگا لیکن

کسی کو اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔عورت کی اپنی زندگی تھوڑی ہوتی ہے۔اس کا فرض تو بس گھر کے دوسرے افراد خاص طور سے شوہر کے سکون اور آرام کا خیال رکھنا ہوتا تا کہ وہ بہتر زندگی گزار سکے۔وہ یہ سوچ کر اپنے آپ کو تسلی دے لیتی کہ نہ جانے کتنی باصلاحیت اور باشعور پڑھی لکھی لڑکیاں ہوں گی جنھوں نے شوہر کی خوشی کی خاطر اپنی پوری زندگی بے سکونی میں گزار ہوگی۔جیسے جیسے سال گزرتا جارہا تھا اس کا دل بیٹھا جارہا تھا۔

کالج کا سال اختتام پر تھا۔سالانہ سپورٹس ڈے میں اس نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔سپورٹس ڈے کے آخری دن ایک شخص نے اچانک آ کر اس کا راستہ روک لیا۔ " سنئے آپ تو بہت باصلاحیت ہیں، یقین نہیں آتا کہ آپ جیسی نازک لڑکی سپورٹس میں اتنی اچھی ہوسکتی ہے۔"۔اس اجنبی نے کہا۔"ہو سکے تو کبھی چائے پیجئے میرے ساتھ "۔اس نے مزید بات آگے بڑھائی۔

سارہ کو بہت غصہ آیا،اس نے حیرت سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے دل میں کہا،کس قدر بدتمیز انسان ہے یہ۔اور پھر اپنی دوستوں کے پاس چلی گئی۔

کچھ روز بعد کالج کی پرنسپل مسز آغا نے سارہ کو آفس میں بلایا،اس نے دیکھا کہ مسز آغا کی سامنے والی کرسی پر وہی شخص بیٹھا تھا جس نے سپورٹس والے دن اس کا راستہ روکا تھا۔مسز آغا سارا کو دیکھتے ہی بولیں۔

ہاں سارہ کیسی ہو،ہم ابھی تمھاری ہی بات کررہے تھے،بیٹھو۔

جی؟ وہ ذرا گھبرا گئی کیوں کہ اس سے پہلے کبھی ایسا ہوا نہیں کہ مسز آغا نے اسے آفس میں بیٹھنے کے لئے کہا ہو۔

ہاں ہاں،بیٹھو بھئی۔

سارہ ہچکچاتے ہوئے اس شخص کی ساتھ والی کرسی پر بیٹھ گئی۔

سارہ ان سے ملو، یہ میرے سب سے چھوٹے بھائی ہیں، توفیق ہمدانی۔توفیق بلڈرز کا نام تو سنا ہوگا،یہ اس کے مالک ہیں۔

جی اچھا۔سارا بولی۔

تم یقیناً" سوچ رہی ہوں گی کہ تمھیں یہاں کیوں بلایا ہے۔اصل میں بات یہ ہے کہ توفیق اور ان کے ساتھی ہر سال ایک اچھے طالب علم یا طالبہ کا انتخاب کرتے ہیں، اس کو اپنے آفس میں جاب بھی دیتے ہیں اور یونیورسٹی کا خرچہ بھی اٹھاتے ہیں۔یہ سپورٹس ڈے پر تمھاری صلاحیت سے بہت متاثر ہوئے اور پھر میں نے بھی انھیں تمھاری بے پناہ صلاحیت اور تعلیمی قابلیت بتائی۔ہمارے خیال میں تم اس پوسٹ کے لئے سب سے زیادہ مناسب ہو۔

یو۔۔۔نی۔۔۔ورسٹی، اسکی زبان لڑکھڑا رہی تھی، دل زور زور سے دھڑک رہا تھا، نگاہوں کے سامنے یونیورسٹی کی بس آ گئی جس میں وہ اپنے آپ کو بیٹھا دیکھ رہی تھی۔

مسز آغا دوبارہ بولیں۔ہاں بھئی اتنی قابل لڑکی ہو، یونیورسٹی جانا تمھارا حق ہے۔

جی بہتر۔۔۔سارہ نے اپنی حالت پر قابو پاتے ہوئے آہستہ سے جواب دیا۔

توفیق،تم کچھ کہنا چاہو گے،مسز آغا پھر بولیں۔

آپا بس میں یہ بتانا چاہوں گا کہ شروع میں ان کی تنخواہ پچیس ہزار ماہانہ ہوگی پھر ان کی قابلیت کے حساب سے ان کی تنخواہ میں اضافہ ہوتا رہے گا۔ توفیق ہمدانی نے سارہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

سارہ خاموش رہی۔دل ہی دل میں وہ اپنے آپ کو برا بھلا کہہ رہی تھی۔کتنے اچھے انسان ہیں توفیق صاحب، وہ خوامخواہ ان کو اتنا برا سمجھ رہی تھی۔

چلو ٹھیک ہے پھر۔اپنے گھر والوں کو جلدی سے یہ خوشخبری سنا دو۔ اگلے ماہ امتحان ہیں،تم چاہو تو امتحان کے فوراً" بعد جاب شروع کرسکتی ہو۔

گھر والے۔۔۔اس کا خواب محل دھڑام سے گر گیا۔

نوکری اور یونیورسٹی کے نام پر گھر میں پھر وہی ہنگامہ شروع ہوگیا۔ خالہ جمیلہ کی پھر سے مداخلت۔پچیس ہزار کم رقم نہیں تھی۔مفلسی کی تاریک باؤلی میں یہ ایک روشنی کی کرن تھی۔خود امجد حسین زیدی بھی اتنی رقم نہیں کماتے تھے۔ بھائی کبھی کام کرتا اور کبھی چھوڑ دیتا۔طبعیت کے لاابالی پن کی وجہ سے وہ کہیں ٹک کر کام نہیں کرتا تھا۔اماں کی طبیعت خراب رہتی تھی اور پیسے کی تنگی کی وجہ سے گھر میں ہر وقت کچ کچ رہتی تھی۔سارہ کی کمائی گھر کے حالات بدل سکتی تھی۔ورنہ اس کی پڑھائی سے کسی کو غرض نہ تھی۔اس کی توقع کے برعکس اس کو اجازت مل گئی۔

سارہ نے امتحان سے فارغ ہوتے ہی توفیق بلڈرز میں کام کرنا شروع کردیا۔یہ اس کے لئے بالکل مختلف دنیا تھی۔یہ پہلا موقع تھا کہ وہ مردوں کے ساتھ کام کررہی تھی۔آفس میں مردوں کی تعداد کافی تھی۔شروع شروع میں تو باس سمیت ہر مرد نے اس کے قریب آنے کی کوشش کی، کوئی چائے کی آفر کرتا تو کوئی واپسی پر گھر پہنچانے پر راضی کرنے کی کوشش کرتا۔لیکن پھر آہستہ آہستہ سب اس کے مزاج سے واقف ہوگئے۔اس نے اپنے رویئے سے بہت جلد سب کو اپنی عزت کرنا سکھا دی لیکن اس کا باس توفیق ہمدانی کسی نہ کسی بہانے بار بار سارہ کو آفس بلاتا۔اس کو سامنے بٹھا کر بلا مقصد فائلوں کو الٹتا پلٹتا رہتا اور ہر تھوڑی دیر بعد اس پر نظریں گاڑ دیتا۔وہ اس صورت حال سے کچھ پریشان رہنے لگی تھی۔

گھر والے بظاہر یہ ہی ظاہر کرتے کہ وہ اس کی نوکری سے خوش نہیں ہیں،لیکن روزانہ کسی نہ کسی مصیبت کا رونا رو کر اس سے پیسوں کا تقاضہ کیا کرتے۔ بھائی جو ہر وقت اس پر آنکھیں نکالتا رہتا تھا،آئے دن کوئی نہ کوئی فرمائش لئے کھڑا ہوتا۔سارہ کی کمائی سے گھر کے حالات بدلنے شروع ہوگئے تھے۔

آفس میں وہ اپنے کام میں مگن رہتی۔وقت سے آفس جاتی،دل لگا کر کام کرتی اور ہر ایک سے عزت اور احترام سے پیش آتی۔جلد ہی اس نے اپنے آپ کو منوا لیا۔آفس میں سب ہی اس کی قابلیت کے قائل ہوگئے تھے،لیکن وہ اپنے باس کے رویے سے بہت پریشان رہتی۔بار بار آفس میں بلانا، للچائی نظروں

سے دیکھنا، بات کرتے کرتے قریب آجانا۔اس سے برداشت نہیں ہو پاتا۔اب تو آفس کے دوسرے لوگ بھی محسوس کرنے لگے تھے۔لیکن یونیورسٹی جانے کی خواہش اتنی شدید تھی کہ وہ باس کا رویہ سہنے پر مجبور ہو جاتی۔

ایک دن توفیق ہمدانی نے سارہ کو آفس میں بلا کر کہا، میں تمھارے کام سے بہت خوش ہوں اور تمھاری تنخواہ میں اضافہ کر رہا ہوں، تمھیں اب سالانہ بونس بھی ملے گا۔اور ہاں تمھاری یونیورسٹی بھی شروع ہونے والی ہے۔داخلہ بھجوا دیا۔

جی بس آج کل اسی پر کام کر رہی ہوں، سارہ نے جواب دیا۔

گڈ، توفیق ہمدانی نے خوشی ظاہر کرتے ہوئے کہا۔ میری کوئی ضرورت ہو تو بتانا۔جس یونیورسٹی میں چاہو داخلہ لے لو۔

جی، بہتر، سارہ نے مختصر جواب دیا۔

کچھ دیر خاموشی کے بعد توفیق ہمدانی نے کہا، تو ایسا ہے کہ اب تم میری پرسنل سیکریٹری کے طور پر کام کرو گی۔میری ساری میٹنگز تم schedule کرو گی۔بلکہ ہر میٹنگ میں میرے ساتھ رہا کرو گی۔

توفیق ہمدانی مسلسل اس پر نظرے جمائے ہوا تھا اور سارا کو بہت گھبراہٹ ہو رہی تھی۔

اور ہاں، تھوڑا سا اپنے لباس پر توجہ دو۔آفس میں پروفیشنل طریقے سے dress up ہونے سے اچھا اثر پڑتا ہے۔۔کل ذرا بہتر حلیہ میں آنا۔ایک بہت بڑے بزنس مین سے میٹنگ ہے، شاید تمھیں دیر تک رکنا پڑے۔

جی، بہتر، سارا کا خون خشک ہو رہا تھا

اس دن وہ آفس سے واپسی پر سیدھی خالہ جمیلہ کے گھر گئی۔ان کے ساتھ کھانا کھایا اور پھر ان کی گود میں سر رکھ کر لیٹ گئی۔ بار بار اپنے باس کی گفتگو اس کو یاد آ رہی تھی۔دل بہت گھبرا رہا تھا۔مرد کے ارادوں میں ذرا سا بھی فتور آئے تو عورت فوراً" بھانپ لیتی ہے۔وہ چاہ رہی تھی کہ خالہ جمیلہ سے اس بات کا ذکر کرے لیکن اس کی ہمت نہیں پڑ رہی تھی۔وہ رات ٹھیک سے سو نہ پائی۔" کل ذرا بہتر حلیہ میں آنا" سارہ کے ذہن میں پوری رات یہ جملہ کلبلاتا رہا۔صبح آفس جانے کا بالکل دل نہیں چاہ رہا تھا لیکن باس نے کہا تھا کہ میٹنگ بہت ضروری ہے۔اس نے اپنے آپ سے کہا کہ ضروری تو نہیں جو وہ سوچ رہی ہے ویسا ہی ہو۔وہ جیسے تیسے تیار ہو کر آفس پہنچی۔ابھی اپنا کمپیوٹر کھولا ہی تھا کہ چپراسی نے آ کر کہا، باس آپ کو بلا رہے ہیں۔

کیسی ہو سارہ۔میں نے تمھیں یہ بتانے کے لئے بلایا ہے کہ میٹنگ کوئی پانچ بجے تک ہو گی۔اور یہ میٹنگ بہت اہم ہے۔تم میرے ساتھ رہو گی تمام وقت۔

پانچ بجے تو چھٹی کا وقت ہوتا ہے، اس وقت تک تو سارا اسٹاف چلا جاتا ہے، اس خیال سے سارہ کا دل ہولنے لگا۔

جی اچھا۔سارا مختصر جواب دے کر کمرے سے باہر نکل آئی۔

پانچ بجے سے کچھ دیر قبل توفیق ہمدانی نے سارہ کو اپنے کمرے میں بلا لیا۔

ہاں تو تیار ہو نا آج کی میٹنگ کے لئے؟؟ اور میں نے تمھیں کہا تھا کہ اپنا حلیہ درست کر کے آنا۔یہ اتنا بڑی سی چادر لپیٹ لیتی ہو، تمھاری ساری خوبصورتی ماند پڑتی ہے اس سے۔توفیق ہمدانی بات کرتے ہوئے اس کے بالکل قریب آ گیا۔

سارہ گھبرا کر پیچھے ہٹ گئی۔

ارے ابھی تک گھبراتی ہو مجھ سے، اور کب تک گھبراتی رہو گی۔اب تک تو تمھیں مجھے جان جانا چاہئے تھا۔توفیق ہمدانی اس کے پھر قریب آ گیا۔

کرسٹل کے چمکتے گلاس کے مشروب کی سرخی اس کی آنکھوں میں اتر آئی تھی، چند لمحوں کی دیر اس کے لئے عمر بھر کی سزا بن سکتی تھی۔توفیق پھر اس کی طرف بڑھا لیکن وہ پھرتی سے کمرے سے باہر نکلی، ٹیبل سے اپنا پرس اٹھایا اور آفس سے باہر نکل آئی۔دروازے پر اس نے چوکیدار کو چابی تھمائی اور کہا کہ باس کو بتا دینا کہ میں کل سے آفس نہیں آوں گی۔اس کے ہاتھ پاوں کانپ رہے تھے۔وہ بس سٹاپ پر آدھے گھنٹے کھڑی رہی، بس تھی کہ آنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔اس کو ایسا لگ رہا تھا کہ ابھی کہیں سے توفیق ہمدانی آ جائے گا اور اس کو اغوا کر لے گا۔جسے تیسے وہ گھر پہنچی۔اپنے کمرے کا دروازہ بند کر کے خوب روئی۔اس کو اندازہ نہیں تھا کہ یونیوسٹی جانے کے خواب کے لئے اس کو یہ کچھ سہنا پڑ گا۔روتے روتے وہ نجانے کب نیند کی آغوش میں چلی گئی۔

صبح اس کی آنکھ اس ہنگامے سے کھلی. اس کی نظر بار بار سامنے رکھے اخبار کی طرف جا رہی تھی۔

" توفیق بلڈرز کے مالک توفیق ہمدانی نے سارہ زیدی کو ملازمت سے برطرف کر دیا ہے"

" سارا زیدی اپنی ترقی کے لئے ان کو اور دیگر افسران کو مرعوب کرنے کے لئے اوچھے ہتکنڈے استعمال کر رہی تھی، جس سے کمپنی کی ساکھ بری طرح متاثر ہو رہی تھی"

سارہ کو ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ اخبار کی سرخی جس سیاہی سے لکھی تھی وہ اخبار سے نکل کر اس کے بے داغ چہرے پر کالک مل رہی ہے۔سارہ ابھی آفس میں اپنے باس کے رویے کو سہہ نہیں پا رہی تھی کہ اب اس نئی صورت حال نے اس کو بالکل نڈھال کر دیا۔وہ جس تیزی سے بلندی کا سفر طے کر رہی تھی اتنی ہی تیزی سے گر گئی۔بلندی سے کھائی میں گرنے سے اس کا شیرازہ ایسا بکھرا کہ اس کا سارا وجود ریزہ ریزہ ہو گیا اور اس کو ایسا لگا کہ اب وہ اپنے آپ کو کبھی سمیٹ نہیں پائے گی۔یوں محسوس ہو رہا تھا کہ وہ ایک دم سے بالکل ختم ہو گئی ہے۔اس میں اب کوئی صلاحیت یا قابلیت باقی نہیں رہی ہے۔آگے بڑھنے یا یونیورسٹی

جانے کا شوق باقی نہیں رہا۔ دو دن میں ہی اس کی حالت غیر ہوگئی، وہ بیمار دکھائی دینے لگی۔ اس کو کئی بار خالہ جمیلہ کا خیال آیا کہ شاید وہ اس پر یقین کر لیں۔ لیکن وہ ہمت نہیں کر سکی اور نہ ہی خالہ جمیلہ اس سے ملنے آئیں۔ کیا سب ملازم پیشہ لڑکیوں کو یہی کچھ سہنا پڑتا ہے؟ وہ مزید الجھ گئی۔

دو دن اسی بے یقینی میں گزر گئے، وہ اندھی سرنگ سے باہر نکلنے کا راستہ تلاش کرتی رہی۔۔ تیسری صبح روشنی کی ایک کرن سارہ کے چہرے پر پڑی۔ اس نے بیزاری سے اپنے ہاتھوں سے اسے روکنے کی کوشش کی لیکن بہت کوشش کے باوجود بھی وہ اس کو روک نہیں پائی اور اس کو آنکھیں کھولنی پڑیں۔ اس نے اٹھ کر کھڑکی سے پردے ہٹائے۔ اس نے محسوس کیا کہ کس قدر اجالا ہے اس کے ہر طرف۔ اس نے کھڑکی سے باہر جھانکا، ہر طرف کتنی چہل پہل تھی، کتنی رونق تھی۔ سارہ نے منہ پر ٹھنڈے پانی کی چھینٹے مارے اور پھر کچھ دیر آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر اپنے آپ کو دیکھتی رہی، گہرے سانس لئے اور کمرے سے باہر آ گئی۔ گھر والوں کی حقارت آمیز نظروں کی پرواہ کئے بغیر وہ باورچی خانے میں گئی، اپنے لئے ناشتہ بنایا اور ٹیبل پر بیٹھ گئی۔ ماں نے بڑبڑانہ شروع کیا تو وہ کان میں ہیڈ فون لگا کر کچھ تلاش کرنے لگی۔ ناشتے کے بعد کمرے میں آ کر اپنے باس توفیق ہمدانی کا نمبر ملایا۔

سر میں۔۔۔

آہا سارہ زیدی۔۔۔ مجھے پتا تھا تم ضرور کال کرو گی۔ توفیق ہمدانی نے سارا کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

کیسی ہو، تمھاری کمی محسوس ہو رہی تھی۔

سر۔۔۔سر، وہ میں آپ سے یہ کہنا چاہتی تھی کہ اس دن جو کچھ ہوا۔۔۔

چلو جو ہوا سو ہوا، اب بھول جاؤ۔

نہیں سر، میں بہت شرمندہ ہوں۔ میں اپنے رویئے پر شرمندہ ہوں۔

ہو جاتا ہے، ہو جاتا ہے ایسا۔ غلط فہمیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ غلطیاں انسان سے ہی ہوتی ہیں نا۔

سر مجھے یہاں سے نکال لیں سر۔ کچھ کریں سر کچھ کریں۔ میں یونیورسٹی جانا چاہتی ہوں، زندگی میں کچھ کرنا چاہتی ہوں۔ اس ماحول میں میرا دم گھٹ جائے گا سر۔

ہمم۔۔ میں جانتا ہوں کہ تم بہت قابل ہو اور اسی لئے تو میں چاہتا تھا کہ تم اپنی تعلیم جاری رکھو۔

سر پلیز سر۔۔۔

چلو کچھ کرتا ہوں۔

شکریہ سر۔ بہت شکریہ۔

اسی شام توفیق ہمدانی نئے ماڈل کی مرسڈیز میں، کالا سوٹ پہنے، اپنے دو اسسٹنٹ کے ساتھ تحفے تحائف لے کر اس کے گھر آ گیا۔ سارہ توقع نہیں کر رہی تھی کہ توفیق ہمدانی اتنی جلدی قدم اٹھا لے گا۔ اس کے گھر والے تو بالکل بوکھلا گئے۔

توفیق ہمدانی نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے سارہ کے والد کو مخاطب کیا، آپ امجد حسین زیدی ہیں، سارہ کے والد۔ سارہ سے آپ کی بہت تعریف سنی ہے۔ پھر اس کی ماں سے مخاطب ہو کر کہا، آپ نے بہت اچھی تربیت کی ہے اپنی بیٹی کی۔ سارہ کے گھر والے ایک دوسرے کا منہ دیکھ رہے تھے۔

آپ لوگ حیران ہو رہے ہوں گے کہ میں یہاں کیوں آیا ہوں۔ اور شاید غصہ بھی آ رہا ہو۔ اصل میں میں آپ سب خاص طور سے سارہ سے معافی مانگنے آیا ہوں۔ جو کچھ آپ لوگوں نے اخبار میں پڑھا وہ سب غلط تھا۔ ہمارا ایک سیلز مینیجر تھا، یہ سب اس کا کیا دھرا ہے۔ اس سے سارہ کی بڑھتی ہوئی کامیابی برداشت نہ ہوئی۔ اس نے یہ گری ہوئی حرکت کی ہے۔ میں نے اس کو اگلے دن ہی نوکری سے نکال دیا۔ میں جانتا ہوں اس بات سے آپ سب کو بہت تکلیف پہنچی ہوگی، اسی لئے میں نے فیصلہ کیا کہ معافی مانگنے میں خود آپ کے پاس آوں۔

پھر اس نے امجد حسین زیدی کو ایک لفافہ دیتے ہوئے کہا۔ آپ پلیز اس کو کوئی احسان نہیں سمجھئے گا۔ جتنا عرصہ سارہ نے کام کیا، یہ اس کا بونس بنتا ہے۔ سارہ کی وجہ سے کمپنی کو بہت فائدہ ہوا۔ پھر اس نے تحائف کے دو بیگ سارہ کی ماں کو دیتے ہوئے کہا، "ماں جی یہ آپ کے لئے"۔ بھائی کی نظریں کبھی لفافے کی طرف جاتیں اور کبھی تحائف کی طرف۔

مجھے یقین ہے کہ آپ لوگوں نے مجھے معاف کر دیا ہوگا۔ پھر سارہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا، سارہ تم کل سے کام پر واپس آ جاؤ۔ امید ہے آپ لوگوں کو کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ اور اب تو سارہ کی ترقی بھی ہونے والی ہے۔ سارہ کے ماں باپ نے خاموشی سے سر جھکا لیا۔

اگلے دن سارہ نے اپنا پسندیدہ سوٹ پہنا، کچھ ہلکا بناؤ سنگھار کیا۔ اور ماں باپ کو خدا حافظ کہے بغیر آفس؟ چلی گئی۔ آفس میں داخل ہونے سے قبل سارہ نے سر سے چادر اتاری، دوپٹہ گلے میں ڈالا، اور اپنی میز پر آ کر بیٹھ گئی۔ آفس میں سب اس کے نئے روپ پر حیران تھے، اور اس کو عجیب نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ توفیق ہمدانی کے چہرے پہ فاتحانہ مسکراہٹ اور آنکھوں میں ہوس کا نشہ چھلک رہا تھا۔

تھوڑی دیر بعد توفیق ہمدانی نے اس کو کال کر کے کہا، شام کی چائے میرے ساتھ پینی ہے۔ پانچ بجے تک کمرے میں آ جانا۔

جی سر، بہتر، سارا کے لہجے میں اعتماد تھا۔

ابھی پانچ بجنے میں آدھا گھنٹہ تھا۔ سارہ نے چپراسی سے کہا، صاحب کے لئے دو چائے لاؤ۔ "دو چائے؟؟" چپراسی نے حیران ہو کر کہا۔

ہاں، دو چائے، جو میں کہہ رہی ہوں وہ کرو

چپراسی چائے لے کر توفیق ہمدانی کے کمرے کی جانب بڑھا تو سارہ نے اسے ٹوکا۔

سنو، ٹھہرو، اور چائے لے کر توفیق ہمدانی کی کمرے میں چلی گئی۔

ارے واہ، یہ تو بڑا اچھا سرپرائز ہے۔ مجھے بلانا ہی نہیں پڑا۔ توفیق فوراً" کرسی سے کھڑا ہو گیا۔

سر کتنی چینی لیں گے، سارہ نے پوچھا۔

جتنی مرضی ڈال دو۔ یہ کہتے ہوئے توفیق ہمدانی کمرے کے کونے میں پڑے صوفے پر بیٹھ کر غور سے سارہ کو دیکھنے لگا۔

ہلکی فیروزی قمیض پر گلابی پھول، گلے میں پڑا ہوا گلابی دوپٹہ، کانوں میں جگمگاتے بندے، کمر تک لمبے کالے بال۔ کھلتا ہوا رنگ۔ لمبی گردن، گردن کا خم۔ اور اس پر اس کا نازک بدن۔ سارہ ہمیشہ بڑی سی چادر میں لپٹی رہتی، آج سارا کا یہ روپ توفیق ہمدانی پر سحر طاری کر رہا تھا۔ اس کی سانسیں تیز ہونے لگی۔

بہت حسین لگ رہی ہو، توفیق کہے بغیر نہ رہ سکا۔

شکریہ سر، سارہ نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ توفیق مسلسل اس پر نظریں گاڑے ہوئے تھا۔

سارا چائے لے کر اس کی طرف بڑھی۔ چائے لیتے ہوئے توفیق ہمدانی نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اسی لمحے اسے لگا کہ زناٹے سے کوئی چیز اس کے گال پر لگی اور گرم گرم چائے نے اس کی سفید اجلی قمیض کو داغدار کر دیا تھا۔

سارہ کا نازک ہاتھ اتنا مضبوط کیسے ہو سکتا ہے؟؟ ہو سکتا ہے۔ یہ کمزور سی عورت ضرورت پڑنے پر مضبوط بھی ہو سکتی ہے اور ایسے میں اس کے ہاتھ سے جو چوٹ مرد کو لگتی ہے اس کی تکلیف ان تمام چوٹوں سے زیادہ گہری ہوتی ہے جو وہ ساری زندگی عورت کے جسم، دل اور دماغ پر لگاتا ہے۔

توفیق حیرانی سے سارہ کو دیکھ رہا تھا۔ سارہ نے چیخ کر کہا، جاؤ اخبار والوں کو کہو کہ وہ خبر لگائیں کہ امجد حسین زیدی کی بیٹی سارا زیدی نے توفیق بلڈرز کے مالک توفیق ہمدانی کے منہ پر تھپڑ مارا ہے۔

یہ کہہ کر وہ باہر نکلی۔ آفس کا سارا سٹاف اپنی کرسیوں سے کھڑا ہوا تھا۔ سارہ نے اپنی چیزیں لی اور توفیق بلڈرز کی اونچی عمارت سے باہر آ گئی۔ اس کو اپنے پیچھے قدموں کی چاپ سنائی دی لیکن اسے پیچھے مڑ کر دیکھنا گوارہ نہ تھا۔ سارہ کے چہرے پر ہمیشہ بزرگوں کی سی سنجیدگی طاری رہی لیکن آج اس پر اپنی عمر کی شوخی چھلک رہی تھی۔

سارہ نے راستے سے برگر لیا۔ گھر پہنچی تو گلے میں دوپٹہ دیکھ کر ماں نے واویلا شروع کر دیا، " کیا گل کھلا کے آئی ہے۔۔۔ "بس کرو اماں۔ سارہ نے ماں کی بات کاٹتے ہوئے کہا اور اپنے کمرے میں چلی گئی۔ آرام سے کھانا کھایا اور پھر ایسی گہری نیند سوئی کہ کچھ ہوش نہیں رہا۔

دفتر سے گھر تک ہر قدم اس کے لئے اپنی ذات کی دریافت کا سفر تھا۔ وہ بہت پرسکون، ہلکی پھلکی ہو گئی تھی۔

صبح اس کے کان میں ماں کی آواز آئی۔ سارہ بہت دیر ہو گئی ہے، ناشتہ ٹھنڈا ہو رہا ہے۔ سارا نے پٹ سے آنکھیں کھولیں۔ اس کو اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ اتنے میں دوبارہ اس کی ماں کی آواز آئی۔ سارہ گیارہ بج رہے ہیں بیٹا۔ سارا نے ایک دم سے کمبل پھینکا، اور ننگے پاؤں بھاگ کر کمرے سے باہر آئی. سب گھر والوں کے ساتھ خالہ جمیلہ بھی میز پر اس کی منتظر تھے۔ اس کی نظر میز پر رکھے اخبار پر پڑی۔

"توفیق بلڈرز کے مالک توفیق ہمدانی گرفتار"

"سارہ زیدی کے جرات مندانہ اقدام کے بعد آفس کی تمام خواتین نے توفیق ہمدانی کے خلاف گواہی دے دی"

سارہ کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی، اس نے نظر اٹھا کر اپنے گھر والوں کی طرف دیکھا۔ ایک عرصے سے ان کے چہرے کی ناگواری جو کچھ روز قبل حقارت میں بدل گئی، اب ان پر پشیمانی اور فخر کی ملی جلی کیفیت چھلک رہی تھی اور سارہ کے سالوں سے بیقرار دل کو قرار آ رہا تھا۔

ماں نے گرم گرم چائے کی پیالی سارہ کی طرف بڑھائی اور خالہ جمیلہ نے بے اختیا ہو کر اس کو گلے لگا کر فخر سے کہا، " ہمیں تو پہلے ہی یقین تھا کہ ہمارے ہاتھ میں جگنو تھا جگنو"۔ سارہ کو سمجھ نہیں آیا آج یہ خبر سیاہ کی جگہ سنہرے الفاظ میں کیوں لکھی ہے۔

Sialkot

is by far the richest city of Pakistan.

1. Sialkot:	2,962,016
2. Karachi:	1,218,000
3. Lahore:	612,000
4. Islamabad:	459,886
5. Faisalabad:	228,342
6. Gujranwala:	138,150
7. Multan:	91,950
8. Hyderabad:	79,632
9. Skardu:	76,562
10. Quetta:	61,400

(McKinsey Global Institute)

کارپوریٹ سیکٹر

گلزار جاوید

(راولپنڈی)

شمسی صاحب کا جواب ہمارے سر پر بجلی گرانے کے لیے کافی تھا۔ کسی قسم کا ردِعمل ظاہر کرنے سے پہلے ذہن میں خیال آیا کہ کاؤنٹر پر لگی بھیڑ میں کسی اور صاحب سے مخاطب ہوں گے مگر جب اُن کا روئے سخن اپنی جانب دیکھا تو اُن کے سوال کا کوئی جواب دینا تو دُور کی بات اُس کی بابت اپنے ردِعمل کو ظاہر نہ کرنا ہی بڑی کامیابی تھی۔ شمسی صاحب سے متعلق تفصیل آپ کے لیے دلچسپی کے ساتھ حیرت کا باعث بھی ہوسکتی ہے۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ آپ ہم سے بہتر معاشرے کے نباض ہوں اور اُن کے سوال میں چھپی حقیقت سے آگاہی بھی رکھتے ہوں۔ مگر ہم شمسی صاحب کو زیرِ بحث لانے سے پیشتر اپنے حوالے سے آپ کو باخبر کردیں تو گفتگو آگے بڑھانے میں آسانی رہے گی۔

اوّل ایم۔اے وہ بھی انگریزی کے مضمون میں بجائے خود بڑی کامیابی سمجھی جاتی ہے اور نوجوانی کے دور میں تو یہ کامیابی نہیں بلکہ کارنامہ سمجھا جاتا تھا جس کی دھوم ہفتوں، مہینوں پاس پڑوس، احباب اور رشتہ داروں میں اکثر رہا کرتی۔ حسبِ استطاعت مٹھائی، ضیافت، ہار، پھول اور تحفے تحائف کا سلسلہ بھی دنوں تک جاری رہتا۔

جس معاشرے سے ہم تعلق رکھتے ہیں وہاں طرح طرح کی محرومی کے باعث روزمرہ کی چھوٹی چھوٹی کامیابیاں اور کارنامے آپس میں بانٹ کر خوشی حاصل کرنے کا ذریعہ بنا لیتے ہیں۔ ہمارے لیے مگر چند دن کی خوشی عارضی ثابت ہوئی۔ بڑوں، بزرگوں کی ہدایت پر روز صبح ڈگری ہاتھ میں لے کر طرح طرح کے دفاتر، فیکٹریوں اور ملوں کے چکر کاٹنے کے باوجود کامیابی دُور دُور تک دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ ایسے میں ہمارے استاد پروفیسر حشمت حسین ہماری مدد کو آگے آئے۔

ایک روز دن بھر کی تلاش و بسیار کے بعد دھول میں اَٹے جوتے اور ماتھے پر بکھرے بے ترتیب بال کے ساتھ، ہاتھ میں ڈگری تھامے بوجھل قدموں سے ہم گھر کی طرف رواں تھے کہ راستے میں پروفیسر صاحب سے ملاقات ہوگئی۔ پروفیسر حشمت صاحب ہر روز شام کو گھر کا سودا سلف لینے خود جاتے اُس روز بھی سبزی، پھل اور گوشت کے تھیلے اُنہوں نے ہاتھوں میں تھامے ہوئے تھے۔ علیک سلیک کے بعد ہمارے چہرے کی جانب منہ کرکے بولے:

''یہ کیا حالت بنا رکھی ہے؟''

''یہ تو روز کا معمول ہے سر''

''کس خوشی میں؟''

''سر جاب کی تلاش میں روز گھر سے نکلتا ہوں اور روز ناکامی کی صورت لے کر لوٹ آتا ہوں''

پروفیسر صاحب نے تاسف اور حیرانی کا اظہار کرتے ہوئے:

''ابھی تک کچھ نہیں بنا؟''

''جی سر۔ ابھی تک صورت حال جوں کی توں ہے''

پروفیسر صاحب نے ہونٹوں پر دو انگلیاں رکھتے ہوئے لمبی ہُوں کے بعد کہا:

''شام میں کسی دن گھر آؤ تفصیل سے گفتگو ہوگی''

ہمارا بس چلتا تو ہم پروفیسر صاحب کی انگلی تھام کر اُسی وقت اُن کے ہمراہ ہو لیتے مگر عزتِ نفس کا خیال کرتے ہوئے ''جی بہتر'' کہہ کر اُن سے اجازت لی اور اُمید کی کرن لیے گھر کی جانب روانہ ہوگئے۔ پروفیسر صاحب کی تسلی میں خدا معلوم کیا تاثیر تھی جس سے اہلِ خانہ بالخصوص والدہ صاحبہ نے خوشی سے ہمارا استقبال کرتے ہوئے کہا:

''اللہ نے سُن لی''

والدہ صاحبہ کے جذبات کا احترام کرتے ہوئے فوری جواب دینے کے بجائے ہم دالان میں پڑی چارپائی پر بیٹھ کر جوتے کے تسمے کھولنے لگے۔ والدہ صاحبہ ہمارے قریب آ کر چارپائی پر بیٹھ کر ہمارا سر سہلاتے ہوئے پھر گویا ہوئیں:

''میری بات کا جواب نہیں دیا تم نے''

والدہ صاحبہ کو فوری جواب دینے کے بجائے ہم چارپائی سے اُٹھ کر اُن کے سامنے گھٹنوں کے بل بیٹھ گئے اور کوہنیوں کو گھٹنوں پر ٹکاتے ہوئے دونوں ہاتھوں میں والدہ صاحبہ کا چہرہ بھر کر کہا:

''امی جی! تھوڑا انتظار کیجیے۔ اُمید کی کرن نظر آئی تو ہے۔ پروفیسر حشمت صاحب سے ملاقات ہوئی تھی انہوں نے گھر بلایا ہے۔ بڑے معقول اور عملی آدمی ہیں یقیناً کچھ سوچ کر ہی بلایا ہوگا۔''

ایک دن کا وقفہ دے کر ہم بعد نماز مغرب پروفیسر صاحب کے گھر پہنچ گئے۔ حسبِ سابق پروفیسر صاحب خود ہی دروازہ کھولنے آئے اور ہمیں دیکھ کر ہمیشہ کی مانند:

''آہا۔۔۔ صباحت میاں آئے ہیں۔ آیئے آیئے۔۔۔''

اُس وقت تک سفید پوش طبقے میں ڈرائنگ روم کی اصطلاح ایجاد نہ ہوئی تھی۔ ہر چھوٹے بڑے گھر میں اپنی حیثیت کے مطابق بیٹھک یا مہمان خانہ ہوا کرتا جس میں چند کرسیوں کے علاوہ ایک آرام کرسی اور بینت سے بُنا ہوا صوفہ رکھا ہوتا جس پر ہاتھ سے کڑھائی شدہ غلاف والے کُشن، حقہ، اگالدان یا ایش ٹرے بھی نظر آتے۔ حشمت صاحب حقہ نہیں پیتے تھے البتہ سگریٹ کے حوالے

''چہارسُو''

سے چین سموکر مشہور تھے۔ جس کا ثبوت میز پر رکھی ایش ٹرے میں بڑی تعداد میں بجھے ہوئے سگریٹ دے رہے تھے۔ آرام کرسی پر بیٹھنے سے پہلے حشمت صاحب نے صوفے کی جانب ہمیں بیٹھنے کا اشارہ کیا اور ساتھ والی میز پر پڑے کاغذات ہماری طرف بڑھائے جنہیں ہم نے سعادت مندی سے آگے بڑھ کر تھام لیا۔ قبل اس کے کہ ہم کاغذات کی بابت سوال کریں حشمت صاحب گویا ہوئے:

''دیکھئے، دیکھئے غور سے دیکھئے ۔ میں اتنے میں چائے پکڑ لیتا ہوں۔''

''سر چائے کی کیا ضرورت ہے؟''

''آپ کو نہ ہو میں تو روز اس وقت چائے پیتا ہوں۔ آپ نے آ کر چائے کا لطف دوبالا کر دیا''

چائے کا پہلا گھونٹ بھرنے کے بعد حشمت صاحب نے میز پر پڑی ڈبی سے سگریٹ نکال کر سلگاتے ہوئے کہا:

''کچھ سمجھ آیا؟''

''جی سر۔ مختلف یونیورسٹیز کے پتے اور فون نمبرز ہیں۔''

''تو پھر کیا ارادہ ہے؟''

''میں سمجھا نہیں سر۔''

''میاں! بات یہ ہے کہ میں نے امریکہ میں مقیم اپنے احباب سے دُور افتادہ اسٹیٹ کی اُن یونیورسٹیوں کے پتے معلوم کیے ہیں جہاں اساتذہ کی اسامیاں خالی ہیں۔'' میز سے دوسرا کاغذ اٹھاتے ہوئے'' اور یہ لیجیے آپ کی سہولت کے لیے میں نے ڈرافٹ تیار کر دیا ہے ۔ کم وبیش چھ یونیورسٹیز کو درخواست بھیج ڈالیے۔ مجھے قوی اُمید ہے، کسی نہ کسی یونیورسٹی سے جواب ضرور آئے گا اور مثبت آئے گا۔''

غالباً سڑسٹھواں روز ہوگا درخواست بھیجے ہوئے کہ دروازے پر پوسٹ مین کی آواز کانوں میں پڑی تو عجلت میں دروازے کی طرف لپکے۔ والد صاحب کے نام چچا جان کا لاہور سے خط اور ایک لفافہ جس پر بھیجنے والے کا نام نہیں تھا دیکھنے کے بعد غیر ملکی ڈاک کا لفافہ نظر آیا تو دل کی دھڑکن بے ربط ہوگئی۔ یہ امریکہ کی وجود میں آنے والی پچاسویں ریاست ''ہوائی'' کی پہلی یونیورسٹی کی جانب سے جواب تھا جس میں تجربے کا ذکر نہ ہونے پر تشویش کے ساتھ ہمارے گولڈ میڈلسٹ ہونے کو سراہا گیا تھا۔ ایک بار، دوبار، بار بار یونیورسٹی کے جواب کو پڑھنے کے باوجود یہ سمجھ نہیں آتا تھا کہ یونیورسٹی ہم سے چاہتی کیا ہے؟

یہ مسئلہ پروفیسر حشمت صاحب ہی حل کر سکتے تھے۔ لہٰذا شام کو امریکہ سے آنے والا خط لے کر ہم پروفیسر حشمت صاحب کی طرف روانہ ہو گئے۔ ہمیشہ کی طرح آج بھی دروازہ پروفیسر صاحب نے کھولا اور مخصوص ''آہا'' کے ساتھ ہمارا استقبال کرتے ہوئے ہاتھ تھام کر مہمان خانے کی جانب لے گئے۔ ہمارے ہاتھ میں خط دیکھ کر پروفیسر صاحب نے آرام کرسی میں بیٹھتے ہوئے کہا:

''یقیناً خوش خبری لے کر آئیں ہیں''

زبان سے کوئی جواب دینے کے بجائے ہم نے لفافہ پروفیسر صاحب کی طرف بڑھا دیا۔ پروفیسر صاحب نے مخصوص انداز میں کُنکناتے ہوئے لفافے کے اندر کا رقعہ نکالا اور بڑی توجہ سے سر ہلا کر پڑھتے رہے۔ کچھ دیر بعد دائیں ہاتھ کو مٹھی بنا کر ٹھوڑی پر رکھ کر سوچا اور پھر ہماری طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے:

''مبارک ہو صباحت میاں۔ اللہ نے آپ کی سُن لی۔ خواہش تو میری یہ تھی کہ کسی ترقی یافتہ اسٹیٹ سے آپ کو بلاوا آئے مگر یہ بھی اچھا ہے۔ نئی جگہ ہے، نئے لوگ ہیں، نیا سیٹ اَپ ہے جس میں سیکھنے کے زیادہ مواقع ہوں گے۔ البتہ یونیورسٹی نے اسپانسر مانگ کر تھوڑی الجھن پیدا کر دی ہے، گھبرایئے نہیں اللہ تعالیٰ اس کا حل بھی پیدا کرے گا آپ تیاری شروع کریں۔''

''کس قسم کی تیاری سر؟''

''میاں! کپڑے ،لتّے، ضرورت کی دیگر اشیاء ویزا، پاسپورٹ، ٹکٹ وغیرہ جہاں تک سوال اسپانسر شپ کا ہے میں نیویارک میں مقیم اپنے دوست مشتاق سے بات کرتا ہوں۔ مجھے اُمید ہے، وہ مایوس نہیں کرے گا۔''

ایک طرف نوکری وہ بھی امریکہ جیسے بڑے ملک میں ملنے کی خوشی، دوسری طرف اخراجات کی پریشانی نے ملی جلی کیفیت سے دوچار کر دیا۔ والد صاحب اور والدہ صاحبہ نے ہماری ڈھارس بندھاتے ہوئے کہا:

''ہمارے ہوتے تمہیں فکر کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ تم اخراجات کا تخمینہ بتاؤ میں دفتر والوں سے ایڈوانس کی بات کرتا ہوں''

''جی۔'' والد صاحب کی بات سے ہمیں کافی ڈھارس ملی مگر ہم اس بات سے بے خبر نہ تھے کہ ہماری پڑھائی کے لیے والد صاحب دفتر سے کئی بار ایڈوانس لے چکے ہیں جو ماہانہ اقساط کی شکل میں والد صاحب کی تنخواہ سے کٹ رہا ہے۔ پہلے قرض کی ادائیگی کے بغیر اگلا قرض ملنا مشکل نظر آتا تھا۔

ایک طرف ہم ویزہ، پاسپورٹ اور خریداری کی بھاگ دوڑ میں لگے ہوئے تھے، دوسری طرف والدین عزیزوں اور رشتے داروں کے دروں پر سوالی بن کر ذلّت اٹھا رہے تھے کیونکہ دفتر والوں نے والد صاحب کو مزید ایڈوانس دینے سے انکار کر دیا تھا۔ لگ بھگ ہفتہ دس دن کی بھاگ دوڑ کے بعد ہمارے ارادوں پر اوس پڑ چکی تھی۔ ویزہ، پاسپورٹ کے معاملات تو والدہ نے کانوں کی بالیاں بیچ کر حل کر دیے تھے ٹکٹ کا مسئلہ جوں کا توں اپنی جگہ موجود تھا۔ حالات سے ہار مانتے ہوئے ہم نے اعلان کر دیا کہ امریکہ جانے کے بجائے ہم وطن میں رہ کر ملازمت تلاش کرنے کی کوشش کریں گے۔ ہمارا فیصلہ سُن کر خاموش طبع والد صاحب کو ایک طرح سے چُپ لگ گئی۔ والدہ صاحبہ کا زیادہ وقت جائے نماز پر گزرنے لگا۔ کئی بار جی میں آئی کہ والدہ صاحبہ یا والد صاحب سے کہوں کہ ایک

بارعتیق دولہا بھائی سے بات کرلی جائے مگر پچھلے سات سالوں میں اُن کے روّیے پر نظر دوڑائی تو ہمارے ارادے جھاگ کی مانند بیٹھ گئے۔ امریکہ جانے کا پروگرام ایک طرح سے ملتوی کر کے پھر سے ملازمت کی تلاش میں مصروف ہو گئے۔

کئی روز کی بھاگ دوڑ کے بعد گھر لوٹے تو والدہ صاحبہ نے زبان سے کچھ کہے بِنا ایک کاغذ ہماری طرف بڑھا دیا۔ جب ہم نے اُن سے کاغذ کی بابت پوچھا تو انہوں نے صرف اتنا کہا:

''خود ہی دیکھ لو''

پروفیسر حشمت صاحب کا خط تھا جس میں انہوں نے فوری طور پر ملاقات کے لیے طلب کیا تھا۔ ہم بھی دھڑکتے دل کے ساتھ والدہ صاحبہ سے کچھ کہے سنے بِنا الٹے پیروں پروفیسر صاحب کے گھر کی جانب روانہ ہو گئے۔ حسبِ سابق دروازے پر نمودار تو پروفیسر صاحب ہی ہوئے مگر خلافِ توقع اُن کا موڈ اور مزاج برہم نظر آیا۔

''عجیب آدمی ہیں آپ۔ نہ اطلاع نہ میل ملاقات، نہ خیر خیریت۔ کبھی اس طرح بھی ہوا کرتا ہے۔ آپ کو معلوم ہے کئی دنوں سے روز رات کو مشتاق مجھے فون کر کے دریافت کرتا ہے کہ صباحت امریکہ کے لیے کب روانہ ہو رہے ہیں؟ پتہ ہے کیوں؟ جواب میں ہم نے کچھ کہنے کے بجائے سر کی جنبش سے نفی میں سر ہلا دیا۔ بھئی اُس نے اپنا اسپانسر لیٹر یونیورسٹی بھیج دیا ہے۔ کیا دیر ہے آپ کے جانے میں؟ کب فلائٹ ہے آپ کی؟''

''سر۔۔۔! کیا عرض کروں۔''

''یہ مِن مِن کیا کر رہے ہو میاں، جو کہنا ہے صاف صاف لفظوں میں کہو''

''سر۔۔۔ میں امریکہ نہیں جا رہا۔''

''امریکہ نہیں جا رہا۔۔۔ کیوں نہیں جا رہے؟''

''سر۔۔۔ وہ۔۔۔ میرا مطلب ہے۔۔۔ ٹکٹ۔۔۔''

''اب کہہ بھی چکو۔۔۔''

''سر ٹکٹ کے پیسوں کا انتظام نہیں ہو سکا''

''اُف میرے خدا۔۔۔ ایسی بات تھی تو آپ کو مجھے بتلانا چاہیے تھا۔''

''جی سر''

''اندر آیئے''

پروفیسر صاحب نے ہمیں مہمان خانے میں بٹھایا اور کچھ کہے سُنے بغیر گھر کے اندر چلے گئے۔ واپسی پر پروفیسر صاحب کے ایک ہاتھ میں چیک بک اور دوسرے ہاتھ میں قلم تھا۔ قدرے ناگواری سے میز کے ساتھ لگی کرسی پر بیٹھ کر ٹیبل لیمپ روشن کیا اور ہماری طرف منہ کر کے بولے:

''جی بتلایئے۔۔۔ کتنے میں آئے گا ٹکٹ؟''

ایک منٹ بعد ہماری بتلائی رقم کا چیک کاٹ کر پروفیسر صاحب ہماری طرف بڑھاتے ہوئے گویا ہوئے:

''مجھے ہمیشہ اس بات کا افسوس رہے گا کہ آپ نے مجھے اس قدر غیر جانا۔ اب جایئے فوراً ٹکٹ لیجیے اور واپسی پر وقت اور تاریخ سے مجھے مطلع کرتے جایئے۔''

ابھی ہم دروازے کی طرف دو قدم ہی بڑھے ہوں گے کہ پروفیسر صاحب نے پیچھے سے آواز لگائی:

''یہ قرضِ حسنہ ہے۔ جب آپ اپنے پیروں پر کھڑے ہو جائیں تو لوٹا دیجیے گا۔''

اس وقت تک ڈاک روڈ میں جیٹ ہوائی جہاز کا RUNWAY نہیں بنا تھا لہٰذا ہمیں ماری پور پاکستانی ایئر فورس کے اڈے سے روانہ ہونا پڑا تھا۔ ٹوکیو سے ہمارا جہاز ہنولولو شام کے وقت پہنچا۔ جب ہم جہاز کی سیڑھیاں اترنے لگے تو سب سے پہلے یونیورسٹی کے ڈائریکٹر نے ہاتھ ملاتے ہوئے اپنا تعارف کرایا ''ڈاکٹر روجر فلپ'' اور پھر باری باری اسٹاف کے لوگوں کا تعارف کراتے ہوئے سفر کی بابت دریافت کرنے لگے۔ رن وے سے کچھ دُور جا کر ڈاکٹر روجر فلپ کے ہمراہ آئے لوگ ایک گاڑی اور ہم روجر فلپ کے ساتھ دوسری گاڑی کی پچھلی سیٹوں پر بیٹھ گئے جسے ڈرائیور چلا رہا تھا۔

ڈاکٹر روجر فلپ کے دفتر میں چائے بسکٹ سے تواضع کے بعد انہوں نے مشتاق صاحب کا لیٹر نکال کر ہمارے سامنے رکھتے ہوئے ایک ہاتھ سے قلم اور دوسرے ہاتھ سے جگہ کی نشاندہی کر کے دستخط کرنے کو کہا۔ اُس کے بعد خود ہی گویا ہوئے ''یہ ایک طرح سے گارنٹر بھی ہیں اور یونائیٹڈ اسٹیٹ میں آپ کے گارجین بھی۔ اس کے بعد یونیورسٹی کی بابت معلومات دی گئیں اور یہ جواز بھی بتلایا گیا کہ ہمارا چناؤ کس سبب کیا گیا۔

یونیورسٹی کی فیکلٹی میں بیرونِ ملک سے ہمارے علاوہ ایک صاحب ملٹن بینڈ آسٹریا سے تعلق رکھتے تھے جن کا مضمون غالباً فزکس تھا۔ پہلے اور دوسرے روز تو ہم دونوں ایک دوسرے کے رفیق بنے رہے۔ وہ ہمارے ملک کے جغرافیہ، تہذیب، تمدن کے بارے خاصی معلومات رکھتے تھے جبکہ ہم اُن کے ملک آسٹریا کی بابت ایک طرح سے گونگے بہرے تھے۔ ان دو دنوں میں انہوں نے ہمیں آسٹریا کی زبان، ادب اور تاریخ کے بارے خاصا باخبر کر دیا تھا۔

تیسرے روز سے طلباء کی آمد شروع ہو گئی جو ہوائی کے علاوہ ہندوستانی، جاپانی، فلپینو، برمی، انڈونیشیا، ملیشیا، تھائی لینڈ، جزائر مشرق الہند وغیرہ کے طالب علم شامل تھے۔ اب یونیورسٹی میں خوب رونق اور چہل پہل تھی۔ یہ سب ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے تھے جو عملی زندگی کا آغاز مشترکہ خوابوں اور مشترکہ عزم کے ساتھ کر رہے تھے۔ جب ہم اُن سے انگریزی میں بات کرتے تو سامنے والے کے تلفظ پر ہنسی ضبط کرنا مشکل ہو جاتا۔ اس سے بھی زیادہ مضحکہ خیز صورت حال ڈائننگ ہال میں دکھائی دیتی۔ ہر کوئی اپنے ملک اور اپنی پسند کا کھانا طلب

کرتا۔ ہر کسی کے کھانے کی مقدار اور طریقہ بھی الگ تھا۔ کوئی چبانے پر زور دیتا، کوئی کھینچنے پر، کسی کو کھانے کے ساتھ بیئر کی طلب ہوتی، کسی کو شیمپین کی اور کوئی شراب کے نام پر کانوں کو ہاتھ لگا کر توبہ کرتا۔ الغرض چند ہفتوں میں ہم اپنے طلبا کی پسند ناپسند، خوبیوں اور خامیوں سے آگاہ ہو چکے تھے۔

بیرونِ ملک کے تجربات کے ساتھ مختلف ملک، قوم اور تہذیب و تمدن سے آگاہی کے بعد دل و دماغ میں نئے خیالات اور خاکے ابھرنے لگے۔ بچپن میں پڑھی کہانیاں، حاتم طائی کے قصے، توبۃ النصوح، فسانۂ آزاد اور پریم چند کی ابتدائی کہانیاں رنگ برنگی کہانیوں میں شامل ہو کر ذہن میں ایک طرح کی ہلچل پیدا کرنے لگیں۔

ایک رات کھانے کی میز پر ہم نے ملٹن بینڈ سے خود پر گزرنے والی کیفیات کا ذکر کیا تو ملٹن نے خوشی کا اظہار کرتے ہوئے ہدایت کی کہ ہم ذہن میں بننے والے خیالات کے نوٹس لینا شروع کر دیں۔ سو ہم نے ڈائری کی شکل میں روزمرہ کے تجربات کو رقم کرنا شروع کر دیا۔ کچھ ہی عرصے میں ڈائری کے معقول صفحات کالے پیلے کرنے کے بعد جب ہم اُن کی ورق گردانی کرتے تو دل و دماغ میں خاص طرح کی خوشی پھوٹنے کا احساس ہوتا۔ اس احساس کا جب ہم نے ملٹن سے ذکر کیا تو وہ خوشی سے اچھلتے ہوئے بولا:

''یقیناً تمہارے اندر تخلیقی صوتے پھوٹ رہے ہیں۔ اگر میرا اندازہ درست ہے تو سمجھ لو تم بہت جلد ادیب بننے والے ہو۔'' ہمارے استفسار پر ملٹن نے اپنا بیان جاری رکھتے ہوئے کہا ''ایک طریقہ تو یادداشت کا ہو سکتا ہے۔ دوسرا سفرنامہ اور تیسرا طریقہ ہے ناول لکھنے کا۔ اب تم خود کو ٹٹولو اور اس موضوع پر ڈھیر ساری کتابیں پڑھ ڈالو بہت جلد تمہارے باطن سے اشارہ مل جائے گا کہ تمہیں کس فارم میں طبع آزمائی کرنی چاہیے۔''

ملٹن کی ہدایت کے مطابق ہمیں یونیورسٹی کی لائبریری سے انگریزی زبان میں جس قدر بھی نثری ادب دستیاب ہوا اُسے ہم نے حتی المقدور پڑھ ڈالا۔ ایک دن ملٹن کی پیشن گوئی کے مطابق ہمارے دل اور دماغ نے یکسو ہو کر ارادہ باندھا کہ ہم مشاہدات و تاثرات پر مشتمل کتاب تحریر کریں گے۔ جس ترتیب سے واقعات رقم کیے تھے اُسی ترتیب سے قلم اور زبان کو سنبھال کر ہم نے ارادوں کو عملی شکل دینا شروع کر دی۔ ہمارے اندازے کے مطابق جب ایک باب مکمل ہو جاتا تو ہم اُس کا خلاصہ ملٹن کو سناتے۔ جسے وہ بہت دلچسپی سے سن کر داد کی شکل میں ہمارا حوصلہ بڑھاتا۔ یوں ہمارا ادبی سفر ملٹن کی حوصلہ افزائی کے سہارے آگے ہی آگے بڑھنے لگا۔ نیا سال چڑھنے سے پہلے صفحات کی تعداد اور فائل کی موٹائی بتلا رہی تھی کہ یہ صفحات ایک کتاب کا مواد فراہم کر رہے ہیں جس کا ذکر ہم نے ملٹن سے کیا تو اُس نے ہمیں فوراً پبلشر سے مشورہ کرنے کا کہا۔ مسئلہ امریکہ میں اردو کے پبلشر کی عدم دستیابی تھا جس کی بابت ملٹن کی رہنمائی بہت کام آئی۔ سال مکمل ہونے کے بعد چھٹیوں میں وطن آنے کے پروگرام میں کتاب کی طباعت کا ارادہ بھی باندھ لیا۔

وطن واپسی پر کچھ دن گھر میں مصروفیت اور پروفیسر حشمت صاحب کے علاوہ دیگر دوستوں کے ساتھ دعوتوں اور ملاقاتوں میں گزر گئے۔ اُس کے بعد ہمیں کتاب کی اشاعت کا خیال آیا تو ہم نے مسودہ پروفیسر حشمت صاحب کو دیتے ہوئے اُن کی راہنمائی چاہی۔ پروفیسر صاحب نے چند یوم بعد مسودے پر سرسری نظر ڈال کر ملٹن کی طرح ہمارا حوصلہ بڑھاتے ہوئے کتاب شائع کرنے کا مشورہ دیا۔

کئی عزیزوں، دوستوں اور احباب کے ساتھ مختلف پبلشرز کے پاس چکر کاٹنے کے بعد شامی صاحب سے معاملات طے پا گئے۔ مسئلہ شامی صاحب کے مالی مطالبے کا تھا جس پر ہم نے توجہ دلائی، شامی صاحب اپنے ادارے کی ریپوٹیشن بڑے نیٹ ورک اور اعلیٰ کوالٹی کا حوالہ دیتے ہوئے کسی قسم کی رعایت پر آمادہ نہ تھے۔ کیفیت کچھ اس طرح کی ہو گئی:

ایماں مجھے روکے ہے جو کھینچے ہے مجھے کفر
کعبہ مرے پیچھے ہے کلیسا مرے آگے

ایک طرف پانچ سو کتابوں کی بھاری رقم اور دوسری طرف ادیب بننے کی خواہش مقابلے پر تھی۔ بالآخر معاوضے پر خواہش غالب آئی اور طے یہ پایا کہ شامی صاحب پانچ سو کتابیں شائع کر کے دو صد کتابیں ہمیں دیں گے اور بقیہ تین سو کتب میں سے نصف ملک کی لائبریریوں اور علمی و ادبی اداروں میں ہمارے صرفے پر رجسٹرڈ ڈاک سے ارسال فرمائیں گے اور جتنی تعداد میں کتابیں فروخت ہو سکیں اُس کی نصف رقم ہمیں ادا کر کے ہمارا بوجھ بٹائیں گے۔

وعدے کے باوجود شامی صاحب بروقت کتاب شائع نہ کر سکے اور ہمیں اس اُمید کے ساتھ امریکہ لوٹنا پڑا کہ شامی صاحب کتاب شائع ہوتے ہی کچھ جلدیں ہمیں ارسال فرما دیں گے اور باقی کتب کی نسبت ہماری ہدایت کی روشنی میں عمل کریں گے۔ دن گزرتے گئے شامی صاحب سے رابطے بڑھتے گئے مگر کتاب شائع نہ ہو سکی۔ معاونین میں کسی کے ہاں موت، کسی کے ہاں بیماری، کسی کے ہاں ولادت کا عذر، بجلی کی عدم فراہمی، چھپائی مشین کی خرابی، ملک کا امن و امان غرض جس قدر تیر اُن کے ترکش میں تھے سب چلانے کے بعد قریب چھ ماہ بعد کتاب چھپی اور جب ہم تک پہنچی تو ہمارا رنگ فق ہو گیا۔ بلند بانگ دعووں کے حامل اشاعتی ادارے نے تیسرے درجے کی کتاب چھاپ کر نہ صرف ہمارے جذبات کو ٹھیس پہنچائی بلکہ ہمیں اس قابل بھی نہ چھوڑا کہ ہم دیارِ غیر میں اپنی پہلی کتاب کی خوشی میں غیر ملکی دوستوں کو شریک کر سکتے۔ جسم میں رہا سہا خون اُس کاغذ کے چھیتڑے نے نچوڑ ڈالا جس پر ڈاک کی مد میں خرچ کی گئی رقم کے اخراجات درج تھے۔

خدا معلوم کتاب کی خوشی منانے کے بجائے اخراجات کے صدمے سے باہر آنے میں اور کتنے دن لیتے کہ ایک ای میل نے ہوا کے ٹھنڈے جھونکے

کی مانند ہمارے احساسات کو خوشگوار کر دیا۔ یہ کوئی قاصد صاحب تھے جنہوں نے ہماری کتاب دیکھ کر پُر جوش انداز میں مبارک دیتے ہوئے قلمی برادری میں خوش آمدید کہا تھا اور ہمیں مستقبل کا بڑا ادیب تک کہہ ڈالا تھا۔ ای میل کے جواب میں قاصد صاحب کا شکریہ ادا کرتے ہوئے ڈھکے چھپے الفاظ میں ناواجب اخراجات اور غیر معیاری چھپائی کا ذکر کیا تو قاصد صاحب نے دلی افسوس کا اظہار کرتے ہوئے اس طرح کے بہت سے قصّے سنا کر ہماری حوصلہ افزائی جاری رکھی۔ ہر ای میل کے جواب میں ادب، ادیب اور پبلشر کا کوئی نیا قصہ درج ہوتا مگر تان ہماری ذہانت اور کرشماتی قلم پر ٹوٹتی۔ جس کے نتیجہ میں ترقی یافتہ اور ترقی پذیر معاشروں کے تصادم پر مشتمل ناول کی بنیاد پڑ گئی۔

اس بار طریقہ کار مختلف تھا۔ ملٹن کے بجائے قاصد صاحب ہمارے رفیق اور مشیر کے درجے پر فائز ہو چکے تھے۔ جب بھی ہم کوئی باب تحریر کر کے قاصد صاحب کو ای میل کرتے تو قاصد صاحب فوری طور پر پروف کی غلطیاں درست کر کے اُس باب کو کتابی شکل میں ڈھال کر ڈھیر ساری تعریف کے ساتھ جوابی میل کر دیتے۔ جس کا نتیجہ کم وقت میں ضخیم ناول کی صورت میں برآمد ہوا۔ ابھی ہماری چھٹیوں میں وقت باقی تھا سو ہم نے قاصد صاحب سے ناول کی طباعت کے بارے ذکر کیا، انہوں نے فوری طور پر اُس کا ذمہ لے لیا۔ جب ہم نے تخمینہ کے بابت دریافت کیا تو قاصد صاحب نے ہمیں قطعی طور پر اس جانب بے فکر رہنے کی تاکید کی۔ دوسرے دن ای میل میں ہم نے قاصد صاحب سے ابتدائی طور پر رقم دریافت کی تو قاصد صاحب خاصے برہم ہو گئے اور اپنی ای میل میں کچھ اس طرح کے الفاظ درج کیے ''کیا میں اتنا گیا گزرا ہوں کہ آپ جیسے بلند قامت اہلِ قلم دوست کے لیے اپنی جیب سے چند روپے بھی صرف نہیں کر سکتا۔ یقین مانیے آپ کی اس بات سے میں خود اپنی نظروں سے گر گیا ہوں''

قاصد صاحب کی ای میل نے دیارِ غیر میں ہمارے لیے وٹامنز کا کام کیا۔ ہم ہر روز شام کو کمپیوٹر کھولنے کے بعد پہلے اُن کی ای میل پڑھتے اور سوچتے کہ قاصد صاحب کی شکل میں اللہ تعالیٰ نے ہمیں ایک مخلص دوست فراہم کر دیا ہے۔ ساتھ ہی یہ احساس بھی ہوتا کہ بھئی ایک دوست اس قدر ذمہ دار ہے کہ اپنے صرفے پر ہماری کتاب چھاپنے پر آمادہ ہے تو ہمیں بھی اپنی ذمہ داری نبھانی چاہیے۔ چنانچہ جتنی رقم کتاب کی مد میں شامی صاحب کو ادا کی گئی تھی اس سے نصف کا چیک یہ سوچ کر ہم نے قاصد صاحب کو ارسال کر دیا کہ یہاں تو مسئلہ ہی ذاتی ہے۔ یہ رقم کتاب کے لیے کافی ہونی چاہیے۔ خلافِ توقع چیک ملنے پر قاصد صاحب نے کسی قسم کے گِلے یا ناراضگی کے بجائے صرف اتنا تحریر کیا اس تکلف کی کیا ضرورت تھی۔

قصّہ مختصر سال پورا ہوا۔ چھٹیاں ملیں اور ہم وطن کے لیے روانہ ہو گئے۔ اس بار پہلے کی نسبت خوشی دو چند تھی شاید اس کا سبب ناول کی اشاعت ہو۔ حسبِ سابق چند روز اہلِ خانہ اور احباب کے ساتھ گزارنے کے بعد جب ہم قاصد صاحب سے ملنے گئے تو ہمارے اندازوں کے برعکس قاصد صاحب نوعمر، خوش شکل اور خوش لباس نوجوان تھے۔ چائے پانی کی بابت قاصد صاحب نے گرم جوشی سے دریافت کیا۔ ہمارے انکار پر کرسی پیش کرتے ہوئے حال احوال دریافت کرنے لگے۔ گفتگو کا سلسلہ طویل ہوا تو ہم نے اُن کی توجہ کتاب کی جانب دلائی۔ جواب میں قاصد صاحب نے ہوں ہاں کے سوائے کچھ نہ کہا، ہم نے وقت کی قلت کی جانب اُن کی توجہ دلائی تو قاصد صاحب گویا ہوئے۔ ارے صاحب یہ وقت بھی عجب چیز ہے ساحر لدھیانوی مدت پہلے کہہ گئے ہیں:

''کون جانے کس گھڑی وقت کا بدلے مزاج''

قاصد صاحب کے جواب پر ہمیں تشویش لاحق ہوئی تو بے ساختہ ہمارے منہ سے لفظ ''خیریت'' ادا ہو گیا۔

''ارے صاحب کیا بتلائیں، کتاب تو کب کی چھپ چکی ہے۔ میرے ساتھ حادثہ نہ ہوتا تو میں اپنی جیب سے ادائیگی کر کے کتاب اُٹھالاتا۔''

قاصد صاحب کے منہ سے لفظ ''حادثہ'' سن کر پریشانی فطری بات تھی۔

''کیسا حادثہ؟''

''کیا بتلائیں صاحب ہمارے شہر میں یہ روزمرہ کا معمول ہے۔''

''میں سمجھا نہیں''

''اُس روز دفتر سے گھر آ رہا تھا کہ گول چوک کے اشارے پر میری کنپٹی پر نقاب پوش نے پستول رکھی اور نئی نکور کار چھین کر لے گیا۔''

''میرے خدا! بہت بُرا ہوا، نہیں ہونا چاہیے تھا۔ آدمی کر بھی کیا سکتا ہے سوائے دعا کے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو سلامت رکھا میرے لیے یہی بڑی بات ہے۔'' میرا جملہ مکمل ہونے کے بعد قاصد صاحب چلنے کے لیے کھڑے ہو گئے اور ہم پرانے ماڈل کی موٹر سائیکل پر قاصد صاحب کے ہمراہ علمی کتاب گھر پہنچ گئے۔ قاصد صاحب نے پروپرائٹر صاحب سے ہمارا تعارف کرایا تو کھڑے ہو کر انہوں نے ہمارے ساتھ معانقہ کیا اور بلا دریافت کیے لڑکے کو آواز دے کر چائے لانے کا اشارہ کیا۔ رسمی گفتگو، ماحول اور موسم کے تبادلے کے بعد ہم مدّعے پر آئے تو باریش پروپرائٹر صاحب نے ''جی ہاں، جی ہاں'' کہہ کر بیل بجائی اور آنے والے کو میز سے کاغذ اُٹھا کر کچھ لکھا اور پیچھے کی جانب اشارہ کر کے تھما دیا۔ چائے کا دور جاری تھا دکان کی پچھلی کی طرف سے دو لڑکے برآمد ہوئے۔ دونوں نے ہاتھوں میں کتابوں کے بنڈل اٹھائے ہوئے تھے۔ پروپرائٹر صاحب کے اشارے پر لڑکے نے ایک بنڈل کھول کر دو کتابیں نکال کر ایک ہماری اور ایک قاصد صاحب کی طرف بڑھائی تو قاصد صاحب نے ہاتھ کے اشارے سے ''دیکھی ہے، میں نے دیکھی ہے'' کہتے ہوئے منع کر دیا۔ سرِ ورق سے لے کر پسِ ورق تک کتاب دیکھنے کے بعد کوئی خاص خوشی نہ ہوئی۔ وجہ کتاب کا معیار، دوسری کتاب سے قطعی مختلف نہ تھا۔ جب ہم نے قاصد صاحب کی توجہ اس جانب دلائی تو قاصد صاحب نے جذبات سے عاری لہجے میں کہا:

''میرے خیال میں تو بہت مناسب ہے''

قبل اس کے کہ ہم کوئی رائے دیں پروپرائٹر صاحب نے دخل در معقولات کا مظاہرہ کر دیا۔

''کمال ہے صاحب! ہم نے خون پسینہ ایک کر دیا اور آپ مناسب کہہ رہے ہیں، بہترین کہیے صاحب، بہترین''

پروپرائٹر صاحب کے تبصرے کے بعد ہمارے لیے کچھ کہنا بے سود تھا۔ چنانچہ ہم نے بقیہ ادائیگی کی بابت دریافت کیا تو پروپرائٹر صاحب نے ہماری توقع اور جیب کے برخلاف بھاری بھرکم بل ہماری جانب سَرکا دیا۔ میز پر رکھے ڈبے سے ٹشو پیپر نکال کر پسینہ صاف کرتے ہوئے لمبا سانس لے کر خود کو نارمل کیا اور پروپرائٹر صاحب کو مخاطب کرتے ہوئے عرض کیا:

''ایڈوانس رقم منہا کر دیجیے''

پروپرائٹر صاحب نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ قاصد صاحب گویا ہوئے:

''وہ آپ کا اور میرا حساب ہے ۔۔۔ اُس کا میں دَین دار ہوں ۔۔۔ سو فیصد دین دار ۔۔۔ وہ کیا ہے ۔۔۔ دراصل ۔۔۔ بات یہ ہے کہ گاڑیوں کی اچانک قیمت بڑھ گئی تھی مجبوراً وہ رقم مجھے استعمال کرنا پڑی۔ آپ بے فکر رہیے۔ زندگی میں حرام کھایا ہے نا کھانے کا ارادہ ہے ۔۔۔ جس قدر جلد ممکن ہوگا میں آپ کی رقم لوٹا دوں گا۔''

عقل مند کہہ گئے ہیں ''تجربات سے نہ سیکھنے والا ہمیشہ دُکھی رہتا ہے۔'' بات کسی حد تک درست بھی ہے۔ ایک نہیں ہم تو دو، دو تجربات سے گزر چکے تھے اور ہر دو تجربات تکلیف دہ ہونے کے ساتھ جیب پر خاصے بھاری رہے تھے۔ اصولی طور پر ہمیں کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے ادب اور ادیب کے راگ سے توبہ کر لینی چاہیے تھی مگر صاحب یہ بھی بزرگ ہی کہہ گئے ہیں:

''چھٹتی نہیں ہے یہ کافر منہ سے لگی ہوئی'' یہ ایسی ضرب المثل ہے جس سے ہر صاحبِ نظر اور صاحبِ ذوق کو کہیں نہ کہیں کبھی نہ کبھی ضرور واسطہ پڑتا ہے۔ دو تلخ تجربات کے باوجود ہمارا بھی وہی حال ہوا جو اس محاورے میں بیان کیا گیا ہے ''چور چوری سے جائے ہیرا پھیری سے نہ جائے'' سو جناب تیسرے پھیرے میں ہم اپنی آٹو بائیوگرافی لکھ کر ساتھ لے آئے۔ ہمارے عزیز نیم ادیب اور نیم حکیم مشرف مرزا نے ہمیں سمجھایا ''کیوں ناحق منافع خور پبلشرز کے چکر میں پڑے ہوئے ہو؟ میرے دوست فیضی صاحب نے بڑے بڑے لوگوں کو شہرت کے آسمان پر پہنچا دیا ہے۔''

''وہ کیسے؟''

''میاں پنج ستارہ ہوٹل میں معاشرے کے اہم طبقوں سے سو سوا سو بندوں کی ضیافت کا اہتمام کرو، چند لوگوں سے مضامین پڑھواؤ، میڈیا پر خبریں چلواؤ اور کتاب کی رونمائی کرو پھر دیکھو لوگ باگ کتاب کے لیے تمہارے دروازے نہ توڑیں تو میرا نام بدل کے رکھ دینا۔''

''بات تو دل کو لگتی ہے مگر یہ سب کچھ کرے گا کون؟''

''یہ آپ کا دردِ سر نہیں، ہم کس مرض کی دوا ہیں؟''

مشرف مرزا اور فیضی صاحب کی راہنمائی میں سیدھے پریس چلے گئے اور جتنی رقم میں پہلی دو کتابیں چھپی تھیں اُس سے نصف رقم میں اس سے زیادہ ضخیم کتاب اتنی ہی تعداد میں چھپنے کا آرڈر دے دیا۔ جس روز کتاب دی گئی تھی آمدہ ہفتے اُسی روز کتاب چھاپ کر پرنٹر صاحب نے حسبِ وعدہ ہمارے گھر بھجوا دی۔ وقت کم مقابلہ سخت والی کیفیت درپیش تھی۔ زبان سے لفظ پانچ سو ادا کرنا آسان ہے مگر پانچ سو کتابوں کو پیک کرنا اور ڈاک خانہ جا کر سپردِ ڈاک کرنا دشوار طلب کام ہے۔

قریبی احباب کو بھیجی گئی دس دس کتابوں کے تین پھیرے لگانے کے بعد ہماری ہمت جواب دے گئی۔ اس کا حل مشرف مرزا نے ہمیں یہ بتلایا کہ ہم کچھ کتابیں دوستوں کے سپرد کر جائیں، کچھ اہلِ خانہ کے اور کچھ ساتھ لے جائیں۔ مشرف مرزا کی بتلائی ہوئی ترکیب دل کو لگی اور ہم نے ایک سے زائد دوستوں کے ذمہ یہ کارِ خیر ڈاک کی پیشگی ادائیگی کے ساتھ لگا کر سُکھ کا سانس لیا۔ اہلِ خانہ نے بھی تعاون کی حامی بھر لی۔ اس طرح ہماری واپسی بخیر خوبی انجام پائی۔

ترقی یافتہ ممالک میں بسنے کا ایک نقصان یہ ہے کہ آدمی وہاں کی مثبت قدروں کا عادی ہو جاتا ہے اور جب اپنوں سے مختلف تجربات کا سامنا ہوتا ہے تو دوہری اذیت انسان کے لیے زیادہ تکلیف دہ ہوتی ہے۔ ترقی یافتہ معاشروں میں اوّل کسی کے پاس دوسرے کی ذمہ داری اٹھانے کا وقت نہیں ہے کسی سبب کوئی شخص ذمہ داری نبھانے کا وعدہ کرتا ہے تو جان لیجیے کہ اُس نے آپ کو اسٹامپ پیپر لکھ کر دے دیا۔ جبکہ ترقی پذیر معاشروں بالخصوص ہمارے وطن میں حال یہ ہے ''وہ وعدہ ہی کیا جو وفا ہو گیا''

تین بار کے ناکام تجربات کے بعد چوتھی مرتبہ ہم مختلف ممالک اور زبانوں کی شاہکار کہانیوں کا ترجمہ کر کے لوٹے۔ اس بار ہم نے تخلیقی کام کرنے کے ساتھ ترتیب اور تنظیم پر زیادہ توجہ صرف کی اور کتاب کی طباعت سے لے کر تقسیم اور ترسیل کا ایسا فل پروف پروگرام بنا کر لائے کہ کوئی کتنا ہی چالاک اور چنٹ کیوں نہ ہو ہمارے منصوبے کو کامیابی سے نہیں روک سکتا۔

اس بار ہم نے شہر کے سب سے بڑے اشاعتی ادارے سے منہ مانگے تخمینے پر پانچ صد کتابیں چھپوائیں اور منصوبہ یہ بنایا کہ پوری ادائیگی کرنے کے بعد صرف اتنی کتابیں اٹھائیں گے جتنی ہمیں وطنِ عزیز اور امریکہ میں ذاتی دوستوں میں تقسیم کرنے کے لیے درکار ہوں گی۔ باقی کی کتابیں پبلشنگ ادارے کو یہ کہہ کر تحفے میں دے دیں گے کہ میاں بیچتے رہو اور کھاتے رہو۔

☆

مشرق اور مغرب کی تمام اقدار بروئے کار لاتے ہوئے آہستگی سے

کھنکار کر گلہ صاف کرنے کے بعد کوٹ کی اندرونی جیب سے ٹشو پیپر نکال کر داہنے کے دونوں سرے خشک کیے جو گھبراہٹ کے پیشِ نظر جھاگ نما سیال مادے سے گیلے ہو چکے تھے۔ پھر قدرے بلند آواز میں شائستگی کے ساتھ شمسی صاحب کو مخاطب کر کے کہا:

''میں سمجھا نہیں''

''حضور! میں ادائیگی کی بابت دریافت کر رہا ہوں''

''جی جی، میں آپ کی بات سمجھ رہا ہوں۔ آپ بھی میری بات سمجھنے کی کوشش کیجیے۔ ادائیگی کرنے کے بعد ہی میں نے آپ سے کتاب طلب کی ہے۔''

''اگر آپ تمام کتب طلب کرتے تو میرا آپ سے کسی قسم کی بات کرنا بنتا ہی نہیں، آپ اپنے گھر خوش میں اپنے گھر خوش۔ آپ نے کتاب فروخت کرنے کی بات کی ہے''

''جی جی۔۔۔جی!''

''کریں گے۔۔۔ضرور کریں گے۔۔۔بیٹھے کس لیے ہیں۔۔۔ اس کے لیے آپ کو ہر ماہ باقاعدگی سے ادائیگی کرنی ہو گی۔۔۔کتنی کتاب بکتی ہے۔۔۔ کب بکتی ہے۔۔۔ کتنے میں بکتی ہے۔۔۔ وہ معاملات آپ جانیں۔۔۔! یہ کارپوریٹ سیکٹر کا دور ہے حضور۔۔۔جس طرح سُپر اسٹورز اور مالز میں نیشنل اور ملٹی نیشنل کمپنیاں۔۔۔اپنی پروڈکٹس کے ڈسپلے کے لیے اسپیس کرایے پر لیتی ہیں۔۔۔ اسی طرح آپ اپنی کتاب کی جتنی اسپیس میں ڈسپلے چاہتے ہیں۔۔۔اُتنا کرایہ آپ کو ادا کرنا ہوگا۔۔۔! فرمایئے۔۔۔کیا ارادہ ہے؟''

''کس بارے میں۔۔۔؟''

''ظاہر ہے۔۔۔کتاب کے بارے میں!''

''کتاب۔۔۔وہ تو ٹھیک ہے۔۔۔مگر۔۔۔مصنفِ وقت کی آواز بھی سن لیجیے۔۔۔!''

''آؤ غالب، آؤ داغ
مل کر گائیں دیپک راگ

اردو کا ہم مان بڑھائیں
جھوٹے سچے خواب سجائیں
دُور کریں سب آزار

آؤ غالب، آؤ داغ
مل کر گائیں دیپک راگ

جیت کا مل کر جشن منائیں
کر کر تلّہ بوٹی کھائیں
کر دیں سب کچھ تاراج

آؤ غالب، آؤ داغ
مل کر گائیں دیپک راگ

آنکھوں کو نہ کام میں لائیں
کانوں سے بھی نہ سُن پائیں
دھڑکن دل کی ہے ناشاد

آؤ غالب، آؤ داغ
مل کر گائیں دیپک راگ

ڈگری پہ ہم ڈگری لائیں
ڈھنگ سے کچھ بھی نہ پڑھ پائیں
بنتے پھر بھی ہیں بقراط

آؤ غالب، آؤ داغ
مل کر گائیں دیپک راگ

دھن دولت ہے دین ہمارا
دھن سے رشتہ پکّا ٹھہرا
دھن اپنی ہے میراث

آؤ غالب ، آؤ داغ
مل کر گائیں ۔۔۔ !!!''

''اساتذہ''

جرمنی میں سب سے زیادہ تنخواہ اساتذہ کو دی جاتی ہے؟ جب وہاں کے ڈاکٹروں، انجینئروں اور ججوں نے اپنی تنخواہ میں اضافہ کر کے اساتذہ کے برابر کرنے کے کا مطالبہ کیا تو وہاں کی چانسلر ''انجلینا مارکول'' نے جواب دیا:

"آپ ان کے برابر کیسے ہو سکتے ہیں جو آپ کو بناتے ہیں؟"

ساتھ ہی انھوں نے جرمنی کی نوجوان نسل کو یہ پیغام دیا کہ آپ معلم بننے کے بارے میں تب ہی سوچیں جب آپ اس پیشے کے قابل ہو جائیں؟ اس لیے کہ:

"A teacher is not a common man and a common man can't be a teacher."

''بروزِ حشر''

پنڈت ہری چند اختر

(●)

ملے گی شیخ کو جنت، ہمیں دوزخ عطا ہو گا
بس اتنی بات ہے، جس کے لیے محشر بپا ہو گا؟؟

رہے دو دو فرشتے ساتھ، اب انصاف کیا ہو گا؟؟
کسی نے کچھ لکھا ہو گا، کسی نے کچھ لکھا ہو گا

بروز حشر حاکم قادر مطلق خدا ہو گا
فرشتوں کے لکھے، اور شیخ کی باتوں سے کیا ہو گا؟؟

تیری دنیا میں، صبر و شکر سے ہم نے بسر کر لی
تیری دنیا سے بڑھ کر بھی تیرے دوزخ میں کیا ہو گا؟؟

سکون مستقل دلِ بے تمنا شیخ کی صُحبت
یہ جنت ہے تو، اس جنت سے دوزخ کیا برا ہو گا؟؟

میرے اشعار پر خاموش ہے، جز بز نہیں ہوتا
یہ واعظ، واعظوں میں کچھ حقیقت آشنا ہو گا

بھروسہ کس قدر ہے تجھ کو، اخترؔ اس کی رحمت پر
اگر وہ شیخ صاحب کا، خدا نکلا تو کیا ہو گا؟؟

○

غالب عرفان

(کراچی)

میرا وجود مجھ سے بھی محروم ہو گیا
میں کیا ہوں مجھ کو جیسے ہی معلوم ہو گیا

تشکیل دے رہا تھا میں اک نغمگی کا رُوپ
آہنگ اپنی ذات کا منظوم ہو گیا

طے کر کے سارے فاصلے پہنچا جو اُس کے پاس
مل کر میں اس سے وقت کا محکوم ہو گیا

اک بحرِ بیکراں کے تموّج سے اس کا نام
ساحل کی اک چٹان پہ مرقوم ہو گیا

تشنہ لبی کے ساتھ جِیا اجنبی حیات
جو شخص اس کے نام سے موسوم ہو گیا

عرفانؔ جس کی چھاؤں کا حاصل ہوا مجھے
وہ سائبانِ فکر کا مفہوم ہو گیا

○

حسن عسکری کاظمی
(لاہور)

عظمتِ حرف کی توقیر میری خاک میں ہے
ریزۂ خواب مرے دیدۂ نمناک میں ہے

کیا خبر تھی کہ ہدف مجھ کو بنائے گا فلک
گردشِ وقت بھی ہر لحظہ مری تاک میں ہے

دلِ وحشی پہ قیامت نہ گزر جائے کہیں
طنز کا وار بھی اب خندۂ بیباک میں ہے

کھو دیا اس نے مجھے، کھویا نہ میں نے اس کو
آج بھی کتنی طلب اس کی دلِ پاک میں ہے

میں اسے بھولنا چاہوں تو بھلاؤں کیسے
حسرتِ دید مرے سینۂ صد چاک میں ہے

اک بھونچال سا آیا ہے زمیں پر جیسے
ڈر یہ ہے فتنہ کوئی پردۂ افلاک میں ہے

میری پہچان حسنؔ عرضِ ہنر سے ہو گی
افقِ تازہ مرے حلقۂ ادراک میں ہے

○

رؤف خیر
(حیدرآباد، دکن)

خیمے کے گل چراغ اگر ہو کے رہ گئے
کچھ لوگ جو ادھر تھے اُدھر ہو کے رہ گئے

پہلے بھی اک مثال تھے اب بھی ہیں وہ مثال
شیر و شکر تھے تیر و سپر ہو کے رہ گئے

جن کی حقیقتاً ابھی ٹھیری نہیں نظر
ایسے بھی لوگ اہلِ نظر ہو کے رہ گئے

خوش آمدید کہتا ہے کوچہ وہ آج بھی
ہم ہی اسیر شام و سحر ہو کے رہ گئے

ہوتے تھے خوش وہ دیکھ کے خبروں میں اپنا نام
پھر یوں ہوا خود ایک خبر ہو کے رہ گئے

وہ دن بھی تھے کہ رونقِ محفل ہمیں تو تھے
افسوس آج بارِ نظر ہو کے رہ گئے

اچھوں کے حق میں خیر سراپا ہیں خیرؔ ہم
اشرار ہی کے واسطے شر ہو کے رہ گئے

○

آصف ثاقب

(بوئی، ہزارہ)

وطن آنسو بھرا کشمیر میرا
ہے گویا کربلا کشمیر میرا

مری راتوں میں چمکی یاد اُس کی
ہوا اشکِ دعا کشمیر میرا

لکھوں زخموں بھری تاریخ اس کی
سبق سب سے جدا کشمیر میرا

مرے جذبات کی تحریر ہے یہ
یہی دلبر ہوا کشمیر میرا

ہے اس میں میرے غم کی عکس بندی
بنا ہے آئینہ کشمیر میرا

میں اس کو پڑھ رہا تھا جان و دل سے
کلامِ میر تھا کشمیر میرا

رواں رہتا ہے میرے خونِ دل میں
وفا کا سلسلہ کشمیر میرا

مرے لفظوں نے ثاقب گنگنایا
سراسر شعر سا کشمیر میرا

وطن کشمیریوں ہی کا ہے ثاقبؔ
ہے ارضِ پاک سا کشمیر میرا

○

ہارون الرشید

(بالاکوٹ)

اپنے بچوں کے بغیر ایک کھنڈر لگتا ہے
کتنا افسردہ مجھے آج یہ گھر لگتا ہے

روز شب نیند میں چلتے ہوئے کٹ جاتی ہے
رات بھر کتنی ہی دیواروں سے سر لگتا ہے

اس کے احساس سے ہی جسم خنک رہتا ہے
مجھ کو وہ شخص تو چھتنار شجر لگتا ہے

دور سے آتی ہیں آوازیں سدا رونے کی
وہ جو پربت سے مجھے کوئی نگر لگتا ہے

سارا دن ایک دریچے سے لگا رہتا ہوں
یہ مجھے اس کی محبت کا اثر لگتا ہے

○

اشرف جاوید

(لاہور)

معجزہ ہوتا نہیں ہے ، اگر ایسا ہو جائے
عین ممکن ہے کہ قاتل ہی مسیحا ہو جائے!

عشق والوں کو میسّر ہے سہولت کیا کیا!
دشت میں پاؤں دھریں، دشت ہی دریا ہو جائے

آج بازار میں لے آئی ضرورت کوئی
ڈرتا ہوں بھاؤ کہیں اور نہ اونچا ہو جائے

کیا معاون ہوئی جاتی ہے امارت اُس کو
جھوٹا ہو کر بھی عدالت میں نہ سچا ہو جائے

کوئی بھی ویسا نہیں، جیسا نظر آتا ہے
اور اگر جیسا نظر آتا ہے، ویسا ہو جائے!

بانٹتا رہتا ہے زنبیل میں رکھّے وعدے
یہ ضروری تو نہیں کوئی بھی پورا ہو جائے

اُسے جانا تھا، سو، رخصت ہوا سب کے ہوتے
اُسے مطلب نہیں اُس سے کوئی آدھا ہو جائے

میرا پوچھو ، تو اُسے، جس نے محبت کی ہو!
یا اُسے پوچھو، جو رستے میں اکیلا ہو جائے

مال، املاک نہ منصب کا طلب گار فقیر!
اتنا ہو جائے کہ عزت سے گزارا ہو جائے

○

واصف حسین واصف

(نیویارک)

یہ رات ہے، ڈھلنے میں ذرا دیر لگے گی
سورج کو نکلنے میں ذرا دیر لگے گی

تازہ ہے ابھی زخم، ذرا تھوڑا توقف
باتوں سے بہلنے میں ذرا دیر لگے گی

مانگی ہے بڑے شوق سے قربت، کہ اسے بھی
اب بات بدلنے میں ذرا دیر لگے گی

چٹّان گھلی تو ہے مری ایڑیاں لے کر
چشمے کو ابلنے میں ذرا دیر لگے گی

کوشش تو یہی ہے کہ تکلف سے گزر جائیں
خوابوں کو بدلنے میں ذرا دیر لگے گی

اس کی تو خبر ہے کہ ہرے پیڑ کی شاخیں
گیلی ہیں، تو جلنے میں ذرا دیر لگے گی

راس آئے گی پودوں کو نئے شہر کی مٹّی
اور پھولنے پھلنے میں ذرا دیر لگے گی

مانگے سے نہیں ملتے کہیں دھوپ کے ٹکڑے
سو برف پگھلنے میں ذرا دیر لگے گی

پھر ایک نئے زخم کی توقیر بڑھائی
پھر دل کو سنبھلنے میں ذرا دیر لگے گی

○

عظیم بخت
(بھکّر)

شاعری مجھ سے سنو مت بے ایمانوں پر مری
انگلیاں اُٹھ جائیں گی سب ''مہربانوں'' پر مری

ایک محنت کش ہوں میں سب سے بڑا جس کا مقام
دیکھ لو۔۔۔! جا کر ہند مندی زمانوں پر مری

پھر بڑی مشکل سے چلتا ہے جہانِ کاروبار
محنتیں بے مول ہوں جب کارخانوں پر مری

ظلم ہوتا دیکھ کر میں بولتا ہوں۔۔۔ چیخ کر
کیا یہی سبقت نہیں ہے حکمرانوں پر مری

میں لکھا کرتا ہوں اکثر ایسے لوگوں کے خلاف
جو چڑھا سکتے ہیں میت چار شانوں پر مری

کاش میرے بس میں ہوتی سانس کی ڈوری عظیم
تم اُڑانیں دیکھتے پھر۔۔۔ آسمانوں پر مری

○

عارف شفیق
(کراچی)

بکھرا نہیں ہوں دیکھ بکھرنے کے بعد بھی
حد میں رہا ہوں حد سے گزرنے کے بعد بھی

نقشِ قدم پہ ان کے چلا ہوں تمام عمر
جو لوگ زندہ رہتے ہیں مرنے کے بعد بھی

غفلت کی گہری نیند جو سویا ہوا ہے شہر
گزری نہیں ہے رات گزرنے کے بعد بھی

کیوں اپنے دشمنوں کو بھی پہچانتے نہیں
چہرے سے ہر نقاب اترنے کے بعد بھی

کیا بات تھی کیوں مجھ سے بھلایا نہیں گیا
اک شخص میرے دل سے اترنے کے بعد بھی

چھوٹی سی اک خطا پہ میں سنگسار ہو گیا
وہ پارسا تھا ہر گنہہ کرنے کے بعد بھی

زخموں سے چُور ہے مرے احساس کا بدن
بھرتے نہیں ہیں زخم یہ بھرنے کے بعد بھی

کب پوری ہو سکی ہیں بھلا دل کی خواہشیں
خالی رہا ہے جام یہ بھرنے کے بعد بھی

دشمن مری اڑان سے ڈرتے ہیں کس قدر
عارف مرے پروں کو کترنے کے بعد بھی

○

زہریلا انسان

(ناول)

تابش خانزادہ (یوایس اے)

قسط.....۲۳

اکرام نے انہیں دیکھتے ہی کہا، ان پر دل کا دورہ پڑا ہوا ہے۔ تم فوراً میرے کمرے میں جاؤ۔ جہاں میرا سوٹ کیس کھلا پڑا ہے اس میں ایک کالے چمڑے کا بیگ رکھا ہے۔ تم وہ بیگ اٹھالاؤ۔ میں بھاگ کر ان کے کمرے سے بیگ اٹھالایا۔ انہوں نے بیگ کھول کر اس میں سے کچھ بوتلوں سے دوائیں نکال کر ایک سرنج میں ڈالیں اور بابا کی شریانوں میں ٹیکا لگا دیا۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے گھڑی دیکھنی شروع کر دی۔ ایک منٹ سے کم کے وقفے میں بابا کی حالت سنبھلی تو اکرام نے مجھے کہا، اگر ان پر اگلے پانچ منٹ میں دوسرا دورہ نہیں پڑا تو ان کی حالت خطرے سے باہر ہوگی۔ وہ پانچ منٹ ہم پر پانچ صدیوں سے بھاری ہو گئے۔ انہوں نے اس عرصے میں ایک نظر بابا پر اور دوسری نظر گھڑی پر رکھی۔ پانچ منٹ بعد بابا کچھ اور سنبھلے تو اکرام نے سکون کا سانس لیتے ہوئے کہا، اب ان کے لیے اگلے پانچ گھنٹے خطرناک ہیں۔ اگر اس دوران ان پر دوسرا دورہ نہ پڑا تو یہ خطرے سے باہر ہوں گے۔ اس لیے مجھے یہاں رہنا ہوگا۔ میں نے کہا، میں بھی آپ کے ساتھ ہی رہوں گا۔ میں نے نیتو کو جا کر سونے کے لیے کہا لیکن اس نے ہمارے ساتھ رہنے کی خواہش ظاہر کی تو اکرام نے کہا، ابھی آپ لوگ جا کر آرام کریں۔ چند گھنٹوں بعد آپ مہاراج کی دیکھ بھال کریں اور ہم آرام کریں گے۔ نیتو کو یہ بات پسند آئی اس لیے وہ چلی گئی۔

بابا کی حالت بہتر ہونے لگی تھی لیکن ان کی آنکھیں ابھی تک بند تھیں کہ دھرمیندر بابا کے خاندانی ڈاکٹر کے ساتھ کمرے میں داخل ہوا۔ دھرمیندر نے شاید اسی دوران ڈاکٹر کو فون کر کے بلایا تھا۔ دونوں ڈاکٹروں نے ایک دوسرے سے ڈاکٹری زبان میں تبادلۂ خیال کیا اور بابا کا ڈاکٹر انکل اکرام کا شکریہ ادا کرتے ہوئے مطمئن ہو کر چلا گیا اور جاتے جاتے صبح آنے کا وعدہ گیا۔ ہم دونوں بابا کے کمرے میں پڑے ہوئے صوفے پر نیم دراز ہو گئے لیکن کسی نے کوئی بات نہیں کی۔ تقریباً دو تین گھنٹوں میں بابا نے ہلکی سی کراہ کے ساتھ آنکھیں کھولیں تو ہم دونوں چونک کر ان کے بستر کی جانب دوڑے۔ بابا پانی مانگ رہے تھے۔ میں نے پانی دینا چاہا لیکن انکل نے مجھے منع کرتے ہوئے ان کو اپنے کالے بیگ میں رکھی ہوئی ایک بوتل سے پانی جیسا سیال نکال کر پینے کو دیا۔ بابا اسے پی کر کچھ دیر بعد پھر سو گئے۔ صبح کے پانچ بجے جینا اور نیتو نے کمرے میں داخل ہو کر ہمیں اپنے اپنے کمرے میں جا کر سونے کا کہا۔ اکرام نے پانچ گھنٹے کا خطرہ ٹل گیا ہے۔ اب اگر مہاراج کو پانچ دن تک دل کا دورہ نہیں ہوگا تو خطرہ اور کم ہو جائے گا۔ پھر انکل نے وہی دوا جو انہوں بابا کو پانی کی بجائے دی تھی جینا کو دیتے ہوئے کہا اگر مہاراج کو پیاس لگے تو پانی کی بجائے یہ دوا انہیں پلائیں۔ اور اگر ایسی ویسی بات ہو مجھے بلا تکلف جگا دیں۔ بابا کے پاس نیتو اور جینا کو چھوڑ کر ہم اپنے کمروں میں پہنچے تو پَو پھٹ رہی تھی۔

میری آنکھ دوپہر کے بارہ بجے کے قریب کھلی۔ جلدی جلدی تیار ہو کر بابا کے کمرے میں دوڑا تو سب لوگ وہیں تھے۔ اب ان میں لانی اور وکرم کا اضافہ ہو چکا تھا۔ بابا اپنے بستر پر گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے بیٹھے تھے۔ میں نے پاس جا کر ان کا حال پوچھا تو وہ دھیمی آواز میں اکرام کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہنے لگے۔ مجھے اس پٹھان نے کل رات ایک نیا جیون دیا ہے۔ انکل بولے، زندگی دینا تو خدا کے ہاتھ ہے مہاراج، میں بھلا کیا شے ہوں۔ پھر میں نے جا کر وکرم اور لانی کو نمستے کیا تو انہوں نے بتایا کہ وہ لوگ ابھی ایک گھنٹہ پہلے پہنچے تھے۔ بابا اگرچہ ہشاش بشاش تھے اس کے باوجود ان کی آواز سے کمزوری صاف عیاں تھی۔ پھر بابا نے حاضرین کو مخاطب کرتے ہوئے کہا، میرا صیام آ گیا ہے اب میں اس کی موجودگی میں آپ تمام لوگوں سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ آج بابا نے مجھے پہلی بار صیام کہہ کر بلایا تھا۔ وہ کہنے لگے، میرے ڈاکٹر اور اکرام میاں کا کہنا بجا ہے کہ میرے دل کا دورہ شادیِ مرگ کی وجہ سے تھا۔ مجھے پچیس ورش بعد کل سچی خوشی ملی تھی۔ اگر آپ لوگ میرے پاس نہ ہوتے تو میں اب تک مر چکا ہوتا۔ ان کی بات پر میں نے سوچا کہ رمیا بھی شاید اسی شادیِ مرگ کا شکار ہوئی تھی۔ اگر وہ رات اپنے کمرے میں اکیلی نہ ہوتی تو شاید وہ بھی آج زندہ ہوتی۔ پھر انہوں نے اکرام سے پوچھا، اکرام میاں تمہارے گھر والے کب تک یہاں آ جائیں گے۔ وہ بولے، مہاراج کچھ دیر پہلے انہوں نے فون کر کے بتایا ہے کہ وہ تین دن میں یہاں پہنچ رہے ہیں۔ نیتو بیٹی نے ان کو کلکتہ ائیر پورٹ سے یہاں تک پہنچانے کا بندوبست کر دیا ہے۔ میرے خیال میں وہ سوموار کو یہاں پہنچ جائیں گے۔ پھر انہوں نے لانی اور وکرم کی جانب دیکھتے ہوئے کہا، میں نے وکرم بابو اور لانی جی کو ایک خاص وجہ سے تکلیف دی ہے جس کا ثبوت میرے کل رات دل کے دورے کی صورت میں آپ کو مل گیا ہوگا۔ میں عمر کے جس حصے میں ہوں میرے لیے یہ جاننا مشکل ہے کہ ابھی میرا کتنا دانا پانی اور سانسیں اس دھرتی پر لکھے ہیں۔ اس بھون نے پچھلے پچیس سال سے کوئی خوشی نہیں دیکھی۔ میں چاہتا ہوں کہ ہم اپنے بچوں کا جتنی جلد ہو سکے بیاہ کر دیں تا کہ میں اپنی پوتری کے لیے یہ خوشخبری ساتھ لیتا جاؤں کہ میں اس کے صیام کو اپنے ہاتھ سے بیاہ کر آیا ہوں۔ میں نے حیرانی سے نیتو کو دیکھا۔ وکرم نے جواب دیا، نیتو آپ کی بیٹی ہے مہاراج، آپ جب چاہیں ہم بیاہنے کے لیے تیار ہیں۔

بابا نے کہا، تو پھر اگلے دو ہفتوں کے اندر بیاہ کا انتظام کر دیتے ہیں۔ اس کے نانکے اور دادکے دونوں موجود ہوں گے۔ مہاراج ہم یہ بھی کر سکتے ہیں دونوں نے کہا۔ اچھا تو پھر ایک اور کام بھی کرتے جائیں اس بڑھاپے میں میں بارات کلکتہ نہیں لا سکوں گا۔ آپ کانپور میں ہمارے بھون میں ہی سب انتظام کر دیں۔ اگر ڈولی بھون کے ایک کمرے سے اٹھے اور دوسرے کمرے میں جائے تو مجھ بوڑھے پر آپ کا بڑا کرم ہوگا۔ اس بھون کے پچاس کمروں میں شادی کے

دنوں میں آپ اور آپ کے کسی مہمان کو کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔ وہ تو ٹھیک ہے مہاراج مگر۔۔۔ لانی نے کچھ کہنا چاہا لیکن کچھ سوچ کر خاموش ہوگئی۔ پھر بولی، اچھا تو پھر ہم آج کلکتہ واپس جا کر تمام انتظامات کر کے بیاہ سے دو روز پہلے یہاں پہنچ جائیں گے۔ ٹام نے کہا تو میں بھی ان کے ساتھ واپس کلکتہ چلا جاتا ہوں۔ بابا نے کہا، ایسی بھی کیا جلدی ہے؟ تم تو میرے صیام کو شوالے ہو گورے بابو۔ وہ بولے، مجھے اپنے کچھ اور جھمیلے دیکھنے ہیں۔ میں بھی شادی سے ایک دو دن پہلے واپس آ جاؤں گا۔ اگر یہ بات ہے تو تم بھی وکرم بابو کے ساتھ چلے جاؤ۔ اکرام بولا، میں بھی ان کے ساتھ کلکتہ اپنے گھر والوں کو کم از کم ایئر پورٹ پر لینے تو جا سکتا ہوں۔ اسی طرح انہیں نئے ملک میں اجنبیت محسوس نہیں ہوگی۔ لانی نے جواب دیا، چلو ٹھیک ہے۔ آپ بھی ہمارے ساتھ کلکتہ چلیں۔ بابا نے انکل اکرام سے کہا، پٹھان بابو، تم کل تک کے لیے رک جاؤ۔ مجھے تم سے کچھ کام ہے جسے نمٹانے کے بعد کل میرا ڈرائیور تمہیں کلکتہ لے جائے گا۔ وہ بولے، جیسے آپ مناسب سمجھیں مہاراج۔ جینا بولی، بابا جی راموا ور میں تو آپ کے پاس ہیں۔ اگر تم لوگ گئے تو میری تو جان نکل جائے گی، بابا بولے۔ میں نے قریب جا کر ان کے ہاتھوں کو تھامتے ہوئے کہا، اب ہم آپ کو کبھی اکیلا نہیں چھوڑیں گے بابا۔ انہوں نے اپنا بوجھ میرے کندھوں پر ڈال دیا۔

یہ سب کچھ اتنی تیزی سے ہو رہا تھا کہ میں ابھی تک کچھ نہیں سوچ سکا تھا۔ دو ہفتوں کے اندر اندر میری شادی ہونے والی تھی۔ ایک طرف تو یہ میرے لیے خوشخبری تھی کہ نیتو ہمیشہ کے لیے میری ہو جائے گی تو دوسری طرف میرے لیے باعثِ خوف۔ خوف کی وجہ صاف ظاہر تھی۔ میں سوچنے لگا کہ ابھی تو میری عمر صرف انیس سال ہے۔ ابھی تو مجھے اپنے کل کے بارے میں سوچنا ہے۔ یہ سچ ہے کہ موجودہ حالات کے پیشِ نظر مجھے کسی قسم کی مالی پریشانی نہیں ہوگی۔ لیکن مالی پریشانی تو شادی کا صرف ایک جز ہوتی ہے۔ کیا میں ذہنی طور پر یہ ذمہ داری سہنے کا حوصلہ رکھتا ہوں؟ اگر نہیں تو کیا میں بابا سے انکار کر کے کہہ سکتا ہوں کہ میں ابھی ان جھمیلوں میں پڑنے کے لیے ذہنی طور پر تیار نہیں۔ میرا سچا جواب تھا، بالکل نہیں۔ میں کسی طور بھی کسی سے وابستگی کے لیے ابھی بالکل تیار نہیں تھا۔ اگر میں اس بوجھ کے لیے واقعی تیار نہیں ہوں تو پھر کیا میں بابا کے جیون کی سب سے بڑی خواہش ٹالنے کا حوصلہ رکھتا ہوں؟

اگر میری سگائی نہ ہوئی ہوتی تو شاید وہ یہ سب کچھ نہ سوچتے۔ انہوں نے کتنے ارمان سے نیتو کے والدین کو بلوا بھیجا تھا۔ مشرق کے باسیوں کا جیون کچھ عجیب سی قربانیاں دیتے ہوئے گزرتا ہے۔ بچپن اور جوانی وہ اپنے بزرگوں کی خواہش کے احترام میں گزارتے ہوئے بوڑھے ہوتے ہیں اور بڑھاپا اپنے بچوں کی آشاؤں کی بھینٹ چڑھاتے ہیں۔ میرے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہو رہا تھا اور مجھے یقین ہے کہ وکرم اور لانی کا بابا کے لیے اتنی جلدی اپنی اکلوتی بچی کی شادی پر رضامندی کا اظہار بھی اپنی آشاؤں کی قربانی کی ایک مثال تھی۔ میں نے سوچا کہ جانے سے پہلے نیتو سے اس کی رائے ضرور لوں گا۔ میں نہیں چاہتا کہ اسے خواہ مخواہ یہ سب کچھ سہنا پڑے۔

میری سوچوں کی دھار باپو کی آواز پر رک گئی۔ وہ کہہ رہے تھے مجھے آ گیا دیجیئے مہاراج۔ میں بھی اپنی بٹیا کے ساتھ وہی واپس آؤں گا۔ آپ تو میرے پاس یہاں رہیں گے باپو۔ بابا کی بجائے میں نے باپو کو جواب دیا۔ بابا نے میری تائید کرتے ہوئے کہا، شان جی آپ اب یہاں سے کبھی نہیں جائیں گے۔ صیام میرا تو صرف نواسہ ہے، لیکن آپ کی تو جان ہے۔ آپ نے اس کے لیے اپنا سب کچھ تیاگ دیا تھا۔ باپو بولے، وہ تو ٹھیک ہے لیکن میری بٹیا کو بھی میری ضرورت ہے۔ خصوصی طور پر اس وقت جب ہماری نیتو کا بیاہ ہونے والا ہے۔ ہاں بیاہ کے بعد میں کچھ دن یہاں رہوں گا۔ میں باپو کو اچھی طرح سے جانتا ہوں وہ اپنا کیا ہوا فیصلہ کم ہی بدلتے تھے۔ اس لیے میں نے جواب میں کچھ نہیں کہا۔ باپو نے قریب آ کر مجھے اپنی بغل میں دبوچتے ہوئے کہا تو میرے پاس دیوئیوں کی امانت تھا۔ اب تجھے اپنا پریوار مل گیا ہے تو کیا ہوا۔ تو اب بھی میرا ہی رامو ہے اور اگر میں کہیں گیا بھی تو میں تیرے پاس وقتاً فوقتاً آتا جاتا رہوں گا۔ میں تری دلہن کو سجانے کے لیے جا رہا ہوں رے۔ تو بس اپنا خیال رکھنا۔ بھلوندر نے ہمیں دوپہر کے کھانے کی تیاری کی اطلاع دی تو بابا بولے، تم لوگ کھانا کھا کر چلے جانا۔ سب لوگ کھڑے ہونا شروع ہو گئے تو میں نیتو کے قریب پہنچا اور اسے آہستہ سے کہا جانے سے پہلے مجھ سے بات کرتی جانا۔

کھانے کے بعد سب لوگ اپنا اپنا سامان باندھنے اپنے کمروں میں گئے اور میں اپنے کمرے میں جا کر نیتو کا انتظار کرنے لگا۔ کچھ دیر بعد نیتو میرے کمرے میں آ کر حیرت سے پوچھنے لگی، سب ٹھیک تو ہے؟ ہاں یہ دو ہفتے کے اندر اندر ہمارا بیاہ۔۔۔ میں نے جان بوجھ کر اپنا جملہ ادھورا چھوڑتے ہوئے نیتو کی جانب دیکھا۔ تو پھر کیا ہوا؟ اس نے بھی میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے الٹا مجھ پر جواباً سوال جڑ دیا؟ پھر بولی کہیں۔۔۔ کہیں تم میرے ساتھ بیاہ سے پشیمان تو۔۔۔ اس بار اس نے میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ میں نے جواب میں اس کا چہرہ اپنے ہاتھوں سے تھامتے ہوئے کہا، اوہ نہیں نہیں، ایسی کوئی بات نہیں۔ مجھے غلط مت سمجھو۔ پگلی، میں بھلا کیوں پشیمان ہونے لگا۔ تم تو میرا سب کچھ ہو، میرے جیون کا سرمایہ ہو۔ میں تو تمہارے بارے میں سوچ رہا تھا کہ آیا تم اچانک اور اتنی جلدی اس بندھن کے لیے تیار ہو یا نہیں۔

وہ میری ناک سے اپنی ناک رگڑتے ہوئے، پلکوں سے اپنی پلکیں ٹکراتے ہوئے اور میرے ہونٹوں کے قریب اپنے ہونٹ لہراتے ہوئے بولی، تم سے جیون بندھن باندھنے کو تو میں اس دن سے تیار ہوں جب تم جھیل پر مجھے پہلی بار ملنے آئے تھے اور پھر مجھ سے خفا ہو کر چلے گئے تھے۔ میں نے ممی سے تمہارے ساتھ رشتے کی ہاں کرتے ہوئے کہہ دیا تھا کہ میں بیاہ کے لیے بھی تیار ہوں۔ تمہیں اتنے قریب دیکھ کر کبھی کبھی تو مجھ سے صبر نہیں ہوتا اور مجھے تمہارے صبر پر بھی حیرانی ہوتی ہے۔ اگر آج بابا بیاہ کا نہ کہتے تو بھی پاپا اور ممی میری وجہ سے ہمارے بیاہ کے لیے تیار تھے۔ وہ باپو سے سگائی کی بجائے بیاہ کی بات کرنے والے تھے۔ میں

نے جذبات سے اسے اپنی بانہوں میں بھرتے ہوئے کہا، پھر دو ہفتے کیوں؟ دو منٹوں میں بیاہ ہوجانا چاہیے۔ دو ہفتے کا عرصہ کافی لمبا ہے اور یہ اکیلے میں کیوں کر کٹے گا۔ اب اتنا صبر تو کرنا پڑے گا۔ اس نے شرارت سے کہا۔ میں نے جواب دیا، پھر تم جلدی سے کلکتہ جاؤ، یہاں کھڑی اپنا اور میرا وقت کیوں برباد کر رہی ہو؟ تمہارے بنا میرے جیون کے یہ دو ہفتے میرے لئے سب سے لمبے اور بورنگ ہوں گے۔ وہ ہنس دی۔ جاتے جاتے اس نے میرے ہونٹوں پر اپنے ہونٹ رکھ دیئے۔

اب میں کم از کم نیتو کی جانب سے بے فکر تھا۔ یہ جان کر میرے من کا بوجھ ہلکا ہو گیا تھا کہ اس کے ماتا پتا کسی طرح بھی بابا کے دباؤ میں آ کر اتنی جلدی بیاہ کے لیے تیار نہیں ہوئے تھے۔ بلکہ نیتو کا اندرونی حال معلوم ہونے کی وجہ سے ہی لانی اتنی جلدی تیار ہوگئی تھی۔ نیتو کے کمرے سے باہر نکلنے کے بعد میں بھی ان لوگوں کو وداع کرنے کے لیے کمرے سے باہر نکلا تو ٹام اپنے کمرے کے سامنے کھڑا تھا اور جینا اس سے چمٹ کر روئے جا رہی تھی۔ ٹام اسے کہہ رہا تھا میں کل بھی تمہارا ڈیڈی تھا اور آج بھی ہوں اور کل بھی رہوں گا۔ تُو تو بھاگوان ہے کہ جن لوگوں کی کھوج میں تو اتنی بے قرار ہو رہی تھی وہ آج تیرے پاس ہیں اور انہوں نے تمہیں جان کر خود سے جدا نہیں کیا۔ بلکہ وقت کے ریلے تمہیں ان سے جدا کر گئے تھے۔ مجھے اپنے قریب آتا دیکھ کر ٹام نے مجھے بھی جینا اور اپنے ساتھ چمٹاتے ہوئے کہا اور تمہارے اس بھائی نے تمہارے ڈیڈی کو موت کے منہ سے شاید اسی لیے واپس کھینچا تھا کہ ہم تمہارے گھر والوں کی کھوج لگائیں۔ اس سے ملنے سے پہلے شاید نہ تمہیں اپنے پیاروں کی کھوج کا خیال آتا اور نہ ہی مجھے۔ ایسے میں باپو، وکرم، نیتو اور لانی بھی اپنے اپنے کمروں سے نکل کر برآمدے میں جمع ہو گئے۔ ہم سب صدر دروازے کی جانب بڑھے۔ نیتو کا چہرہ خوشی سے تمتما رہا تھا۔ وہ بار بار مجھے دیکھتی اور دھیرے سے مسکرا دیتی۔ پھر وہ جینا کے پاس آ کر اس کا ہاتھ تھام کر چلنے لگی۔ سب لوگ وکرم کی گاڑی میں بیٹھ کر کلکتہ کے لیے روانہ ہو گئے تو میں اور جینا اداس ہو گئے۔ جینا نے اپنا سر میرے کندھے پر رکھ دیا۔

ایک دوسرے کی بانہوں کے حصار میں سمٹ کر ہم برآمدے میں چلنے لگے تو میں نے جینا سے کہا تمہارا بابا کے پاس رہنے کا فیصلہ مجھے اچھا لگا ہے۔ وہ بولی اس فیصلے میں تم سے کی ہوئی گفتگو کا کافی ہاتھ ہے۔ اور پھر بابا پر پڑنے والے دل کے دورے نے میرے فیصلے کو آخری شکل دینے میں کافی مدد دی۔ میں نے ڈیڈی سے کہہ دیا ہے کہ میں بابا کے جیون میں لنڈن واپس نہیں آؤں گی۔ مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی ہے میں نے جواب دیا۔ ہم باتیں کرتے کرتے ماتا جی کے کمرے میں پہنچے جہاں جینا نے اپنا مستقل ڈیرہ لگا لیا تھا۔ کمرے میں داخل ہو کر جینا نے بنوں بی بی کی تصویر کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا، میں نے بھی اس دیوی کو کئی بار سپنے میں دیکھا تھا۔ میں نے جواب دیا، چند روز بعد تم اس دیوی کو جاگتے میں دیکھو گی۔ ہماری دادی ہو بہو اس دیوی کی زندہ تصویر ہیں۔ لیکن افسوس کہ تم ان سے بات نہیں کر سکو گی اس لیے کہ وہ صرف پشتو زبان جانتی ہیں۔

مجھے پشتو آتی ہے۔ اس کے جواب نے مجھے حیرت زدہ کر دیا تو میں نے پوچھا، تمہیں کیسے پشتو آتی ہے؟ ہاں جب مجھے معلوم ہوا کہ میرا باپ پشتون تھا تو میں نے لنڈن کی ایک مسجد کے اتوار والے سکول میں پشتو زبان سیکھی تھی۔ میں چاہتی تھی کہ جب میں اپنے باپ کے رشتہ داروں سے ملوں تو کم از کم ان کی زبان میں ان سے بات کر سکوں۔ ہندی مجھے پہلے سے آتی تھی۔ اور اردو بولنے میں ہندی جیسی ہے اس لیے میرے لیے دونوں زبانیں سمجھنا اور بولنا مشکل نہیں ہے۔ اس لحاظ سے تو تم مجھ سے نمبر لے گئی ہو۔ کیا تم مجھے پشتو بولنا سکھا سکتی ہو؟ میں نے جینا سے پوچھا۔ کہنے لگی، کیوں نہیں! لیکن اس کے عوض تم مجھے کیا دو گے؟ ایک پپی دوں گا، میں نے اپنے گال کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ اس نے ہنس کر میرا گال چومتے ہوئے کہا، چلو اس معاوضے کی وجہ سے آج سے پشتو زبان سیکھنے کے لیے تم سرکاری طور پر میری شاگردی میں آ چکے ہو۔ چلو میں تمہیں ماتا جی کی وہ ڈائری دکھاتی ہوں جو انہوں نے لنڈن میں لکھی تھی۔

کیا یہ وہی ڈائری ہے جس کا ذکر تمہارے ڈیڈی کر رہے تھے؟ میں نے جینا سے پوچھا۔ ہاں یہ وہی ہے جینا نے جواب دیا۔ تم مجھے ڈائری صرف دکھاؤ گی یا پڑھنے کے لیے دو گی۔ میرا مطلب ہے پڑھنے کے لیے یا دکھانے کے لیے ایک چیز ہے، وہ بولی۔ نہیں دکھانا اور پڑھنا دو مختلف چیزیں ہیں، میں نے ہنس کر کہا۔ اچھا بابا، پڑھنے کے لیے ہی۔ لیکن اسے دیکھنا مت۔ بس آنکھیں بند کر کے پڑھنا، جینا ہنستے ہوئے بولی۔ آنکھیں بند کر کے بھلا کوئی پڑھتا ہے، میں نے کہا۔ اسی لیے تو کہا تھا کہ دیکھو۔ پڑھنے سے پہلے دیکھنا ہوتا ہے نا۔ اس نے اپنے سوٹ کیس کی باہر والی جیب سے ایک گلابی جلد والی درمیانی سائز کی ڈائری میرے ہاتھ میں رکھ دی۔

ایسے میں دھرمیندر بابا کا بلاوا لے کر آیا۔ ہم دونوں جیسے کھڑے تھے ویسے ہی بابا کے کمرے کی جانب چل پڑے۔ انکل اکرام بابا کے پاس پہلے سے بیٹھے تھے۔ ہمارے کمرے میں داخل ہوتے ہی انہوں نے کہا، آؤ بچو! میں تم سے ایک ضروری بات کرنا چاہتا ہوں۔ ہمارے بیٹھتے ہی انہوں نے کہا، میرے کل والے دل کے دورے نے مجھے ایک سبق سکھایا ہے۔ میں اب مناسب وقت کے انتظار کے بجائے وہ سب کچھ آج اور کل میں کرنا چاہتا ہوں۔ اس لیے میں نے کل صبح اپنے وکیل کو بلایا ہے۔ میں اپنی تمام منقولہ اور غیر منقولہ جائیداد تم دونوں کے نام کر کے اس ذہنی بوجھ سے فارغ ہونا چاہتا ہوں۔ پھر انہوں نے انکل اکرام کی جانب منہ کر کے کہا، پٹھان بابو، کل تم نے مجھے موت کے سے واپس کھینچا ہے اس نے مجھے ایک خیال دیا ہے جس کے لیے میں نے تمہیں ایک دن کے لیے کلکتہ جانے سے روکا ہے۔

میں نے جو ہسپتال اپنی پوتری اور تمہاری بھابھی کے لیے آج سے بیس سال پہلے بنوایا تھا وہ آج بھی ویسے کا ویسا کھڑا ہے۔ تم اور تمہاری پتنی دونوں ڈاکٹر ہو۔ جیسے میری پوتری اور تمہارا بھائی۔ میں چاہتا ہوں کہ میں وہ عمارت تمہارے نام کر دوں اور تم دونوں پتی پتنی اس ہسپتال کو چلا کر اپنی بھابھی کا وہ سپنا پورا کرو جو کیلاش نے اس سے چھین لیا تھا۔ میں یہ سب نہ صرف اپنے پاپوں کا کفارہ ادا کرنے کو کرنا

چاہتا ہوں بلکہ اپنی پوتری کو منہ دکھانے کے قابل ہو کر مرنا چاہتا ہوں۔ میں وہاں تمہارے بھائی کے سامنے سرخرو ہو کر جانا چاہتا ہوں۔ میں تمہیں صرف ہسپتال کی عمارت ہی نہیں بلکہ اس میں سب کچھ ڈال کر دینا چاہتا ہوں۔ اس عمارت میں طبّی سہولتوں کے تمام اخراجات کی ذمہ داری بھی میری ہوگی۔ ان اخراجات کی مد میں میں نے بہت سارو پیہ آج سے پچیس سال پہلے مختص کر کے برطانیہ کے بنک میں رکھوادیا تھا۔ سامان کی فہرست بنانا تمہارا کام ہوگا سامان مہینوں میں منگوانا میرا کام ہوگا۔ رہائش کے لیے تم اس بھون میں رہ سکتے ہو۔ پچاس کمروں کا تنا بڑا بھون کئی سالوں سے سونا پڑا ہے اس میں رونق آ جائے گی۔ اگر تم چاہو تو ہسپتال کے احاطے والی حویلی میں رہ سکتے ہو۔ وہ حویلی بھی میں نے پوتری کے لیے بنوائی تھی۔ اگر تم کہو تو میں تمہاری پتنی کے آگے ہاتھ جوڑ کر پنتی کرنے کو تیار ہوں۔ بس تم انکار کر کے مجھے نراش نہ کرنا۔ تمہیں اپنے بھائی اور بھابھی کا واسطہ۔

بابا نے اپنی بات ختم کر کے انکل کی جانب جواب طلب نظروں سے دیکھا۔ اکرام کا چہرہ جذبات سے سرخ ہو گیا۔ معلوم نہیں یہ جذباتی کیفیت کس وجہ سے تھی۔ وہ کچھ دیر تک اپنی گفتگو کے لیے شاید مناسب الفاظ تلاش کرتے رہے پھر کہنے لگے، مہاراج آپ نے مجھے جن دو ہستیوں کا واسطہ دیا ہے میں ان کا نام بھی بغیر وضو کے نہیں لینا چاہتا۔ آپ جیسا چاہتے ہیں ویسا کریں میں آپ جیسی ہستی کو نراش نہیں کروں گا۔ جہاں تک میرے گھر والوں کا تعلق ہے تو ان کے لیے اس سے بڑی بات اور کوئی نہیں ہوگی کہ وہ میرے بھتیجے اور بھتیجی کے قریب رہیں۔ ان دونوں سے ہمیں آپ کی، اپنی بھابھی اور اپنے بھائی کی خوشبو آتی رہے گی۔

بابا خوش ہو کر بولے، چلو ٹھیک ہے۔ میں اپنے وکیل کو بلا کر یہ وصیت تیار کروا کر اڈتھ کمشنر سے منظور کروانا چاہتا ہوں۔ کل صبح سویرے تم کاغذات پر دستخط کرنے کے بعد میرے ڈرائیور کے ساتھ کلکتہ چلے جانا۔ پرسوں وہاں سے گھر والوں کو ایئر پورٹ سے لے کر جلدی واپس آنے کی کوشش کرنا۔ تم لڑکے والے ہو اور شادی کے سارے انتظامات خود ہی سنبھالنا۔ اس عمر میں مجھ سے کوئی توقع مت رکھنا۔ جو آپ کا حکم بابا جی۔ اس بار انکل اکرام نے انہیں مہاراج کی بجائے بابا جی کہا تھا۔ اس کے ساتھ ہی بابا نے مجھے فون لانے کو کہا۔ میں نے انہیں فون لا کر دیا تو انہوں نے نمبر گھمانے کے بعد دوسری جانب کسی پطرس صاحب سے بات کر کے انہیں کل دس بجے تک تمام کاغذات تیار کرنے کو کہا۔ دوسری جانب سے کچھ کہا گیا جس کے جواب میں بابا بولے، میں اپنے نواسے صیام کے ہاتھ آپ کو ابھی سب کچھ بھجوائے دیتا ہوں۔

بابا نے فون رکھنے کے بعد مجھے کہا، صیام بیٹا، میرے کمرے کی داہنی الماری میں کالے رنگ کی لکڑی کا ایک ڈبّا رکھا ہے۔ اسے اٹھا کر یہاں لے آؤ۔ میں نے وہ ڈبّا لا کر دیا، بابا نے اسے کھول کر چند کاغذات نکال کر مجھے دیتے ہوئے کہا، تم پطرس صاحب کو یہ کاغذات دے آؤ وہ تمہیں بھرنے کے لیے چند فارم دیں گے وہ یہاں لیتے آنا۔ پطرس صاحب اینگلو انڈین عیسائی ہیں ان کا خاندان کئی پشتوں سے ہمارا خاندانی وکیل چلا آ رہا ہے۔ ان کا دفتر اور گھر ایک جگہ ہے۔ نچلی منزل پر ان کا دفتر ہے اور وہ خود اوپر والی منزل پر رہتے ہیں۔ کلو نے پطرس صاحب کا گھر دیکھا ہے۔ اسے ساتھ لیتے جاؤ۔

وہاں سے نکل کر کلو کے ساتھ میں پطرس صاحب کے گھر روانہ ہوا۔ ان کا گھر شہر کی نئی کالونی میں تھا۔ گاڑی پھاٹک پر رکی۔ ڈرائیور نے ہارن بجایا تو ایک ملازم نے پھاٹک کھولا تو ہم گاڑی اندر لے گئے۔ گاڑی سے نکل کر میں نے ملازم سے پطرس صاحب کے بارے پوچھا تو وہ سامنے کمرے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بولا، صاحب آپ اندر تشریف رکھیں میں اُوپر اطلاع کرتا ہوں۔ کمرے میں داخل ہوا تو سب سے پہلے میری نظر شیشے کے ایک بڑے پنجرے پر پڑی جس میں ایک طوطا سانپ رکھا تھا۔ یہ سانپ طوطا اس لیے کہلاتا ہے کہ طوطے کی طرح اس کا منہ لال اور جسم سبز ہوتا ہے۔ اس کی دو اقسام ہیں۔ ایک غیر زہریلا اور دوسرا کم زہریلا ہوتا ہے۔ یہ دوسری قسم کا سانپ تھا۔ بے خیالی میں میں نے پنجرہ کھول کر سانپ نکالا اور اس سے کھیلنا شروع کر دیا۔ میری پیٹھ دروازے کی جانب تھی کہ پیچھے سے ایک خوفزدہ نسوانی آواز آئی، ارے ارے، یہ کیا کر رہے ہیں۔ اگر اس نے آپ کو کاٹ لیا تو؟

سانپ کو اپنے کندھوں پر رینگتا چھوڑ کر پیچھے مڑ کر دیکھتے ہوئے کہا، تو میں آپ کو اس کا ذمہ دار نہیں ٹھہراؤں گا۔ میرے پیچھے ایک درمیانی قامت کی، پتلی سی، نکھرے نکھرے گول چہرے والی اینگلو انڈین لڑکی کھڑی تھی۔ اس نے نیلے پھولوں والی بغیر بازو کے گھٹنوں تک لمبی سفید سکرٹ پہنی تھی۔ میں نے اپنی بات آگے بڑھاتے ہوئے کہا، دراصل یہ سانپ مجھے بڑا پیارا لگا اس لیے اٹھالیا۔

کیا آپ کو معلوم ہے یہ ایک زہریلا سانپ ہے؟ اس نے ڈری ڈری آواز میں دوسرا سوال کیا۔

میں نے جواب دیا، جی بالکل معلوم ہے۔

پھر بھی آپ کو اس سے ڈر نہیں لگتا؟ اس نے مجھے اس قدر پرسکون دیکھتے ہوئے حیران ہو کر بڑی معصومیت سے پوچھا۔

مجھے تو نہیں لگتا۔ اگر آپ کو اس سے اتنا ڈر لگتا ہے تو پھر آپ نے اسے کس خوشی میں پال رکھا ہے؟ میں نے سوال کیا۔ اسی معصومیت سے کہنے لگی وہ دراصل مجھے Ophidiophobia (the fear of snakes) یعنی سانپوں کا ڈر ہے اور ماہرِ نفسیات نے کہا ہے کہ اگر میں سانپ کو روز دیکھوں گی تو میرا ڈر جاتا رہے گا۔ اس لیے میں نے اس کو یہاں رکھا ہے۔ پھر اس نے مجھے دیکھتے ہوئے حیرت سے کہا، کمال ہے، سانپ نے آپ کو ابھی تک کچھ بھی نہیں کہا۔ آپ کو بھی کچھ نہیں کہے گا اگر آپ اس سے ڈرنے کی بجائے اس سے دوستانہ انداز سے پیش آئیں، میں نے اسے بتایا۔ اچھا! وہ کیسے؟ اس نے متجسس ہو کر پوچھا۔

میں نے جواب دیا، سانپ اصل میں ہم سے ڈرتا ہے اس لیے تو وہ اپنے بچاؤ کی وجہ سے ہمیں کاٹنے کو تیار رہتا ہے۔ اگر آپ دوستانہ انداز میں سانپ کے قریب جائیں تو اس کا ڈر جاتا رہتا ہے اور وہ نہیں کاٹتا۔ اچھا اب میں

یہ سانپ آپ کے قریب لاکر آپ کے کندھوں پر چھوڑوں گا۔ آپ کوئی حرکت نہ کریں اور دیکھیں کہ سانپ آپ سے کیا سلوک کرتا ہے۔ یہ کہتے ہوئے میں نے سانپ اپنے کندھے سے اٹھا کر اس کے کندھوں پر رکھا تو اس کی گلابی رنگت کچھ پیلی ہوئی۔ سانپ اس کے کندھوں پر ہولے ہولے سرکتا ہوا اس کے بھرے بھرے سینے پر رینگنے لگا تو میں نے کہا، اب آپ اس کے جسم پر ایسے ہاتھ پھیریں جیسے کسی بچے کے گال پر پھیرتے ہیں۔

اس نے جھجکتے ہوئے میری ہدایت پر عمل کیا تو اس کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ اس نے سانپ کو حیرت سے دیکھتے ہوئے کہا، اس نے مجھے بھی کچھ نہیں کہا۔

اگر آپ اس کے ساتھ ایسے کھیلیں گی جیسے کوئی بچوں کے ساتھ پیار سے کھیلتا ہے تو یہ آپ کو کچھ نہیں کہے گا۔ چند لمحے پہلے سانپوں سے خوف کھانے والی لڑکی اپنے اوپر رینگتے ہوئے سانپ کو دیکھ کر پیار سے ہاتھ پھیرتے ہوئے مسکرا رہی تھی۔ سانپ اس کے شانے تک لمبے نیم سنہری بالوں سے رینگتا ہوا اس کی گردن تک آیا اور اس نے اپنی زبان نکال کر لڑکی کی گردن پر پھیری تو اسے گدگدی ہوئی تو وہ ہنسی سے لوٹ پوٹ ہو کر بولی، یہ اپنی زبان سے مجھے گدگدی کر رہا ہے۔

اچھا اب آپ اس کی دم ہلائیں، میں نے اسے کہا، اس نے میری ہدایت پر عمل کیا تو سانپ اس کے سامنے پیٹ کے بل الٹ گیا۔ اسے یہ کیا ہوا؟ اس نے پوچھا۔ اس نے مرنے کا سوانگ رچایا ہے۔ اس سانپ پر اگر کوئی دُم کی جانب سے یا پیچھے سے حملہ آور ہوتا ہے تو یہ مردہ بننے کا سوانگ رچا کر اپنا بچاؤ کرتا ہے۔ میں نے جواب دیا۔

وہ اسے کچھ دیر تک اسی حالت میں دیکھتی رہی پھر کہنے لگی، اچھا تو اب یہ اصلی حالت میں کب واپس آئے گا؟

بس آپ اسے واپس اپنے پنجرے میں رکھیں تو کچھ دیر بعد یہ دوبارہ زندہ ہو جائے گا۔ میں نے جواب دیا۔

اس نے سانپ کو پنجرے میں واپس رکھتے ہوئے حیرت سے ڈوبی آواز میں کہا، آپ نے ایک منٹ کے اندر مجھے سانپ کے ڈر سے نکال کر میری مشکل حل کر دی۔

کونسی مشکل؟ میں نے پوچھا۔

وہ بولی، بار ایٹ لاء کے داخلے کے لیے ایک شرط یہ ہوتی ہے کہ امیدوار اپنے کسی ایک اندرونی خوف پر قابو پانے کے بعد اس کا سامنا کرنے کو تیار ہو۔ مجھے بچپن سے سانپوں سے خوف آتا تھا۔ ماہرِ نفسیات کی ہدایت پر میں یہ سانپ لائی تھی اور روز دیکھتی تھی لیکن اس کے پنجرے کے قریب جانے کی ہمت مجھ میں نہیں تھی۔ آپ نے نہ صرف میرا خوف دور کر دیا بلکہ مجھے اس سانپ کی محبت میں مبتلا کر دیا ہے۔ اب میں اپنی بار ایٹ لاء کے داخلے کی درخواست میں لکھ سکتی ہوں کہ میں نے نہ صرف سانپ کے خوف پر قابو پایا ہے بلکہ اس کا سامنا بھی کیا ہے۔

مجھے خوشی ہے کہ میں آپ کے کسی کام آ سکا مس، میں نے کہا۔

میرے مس کہنے پر اسے خیال آیا کہ ہم ابھی تک ایک دوسرے سے متعارف نہیں ہوئے تھے۔ اس نے اپنا ہاتھ آگے بڑھاتے ہوئے کہا، میرا نام ماریہ پطرس ہے۔ میں پطرس مسیح کی بیٹی، سیکرٹری اور نائب ہوں۔

میں نے کہا، میرا نام صیّام ہے۔

اوہ اچھا اچھا۔ آپ مہاراج پرکاش کے نواسے ہیں، اس نے پوچھا۔

میں نے جواب دیا، جی جی میں بالکل اور مجھے یہ جان کر حیرت اور افسوس ہوا ہے کہ آپ نے اپنی ننھی سی جان پر اتنے سارے عہدے لاد رکھے ہیں۔

ہنستے ہوئے، بیٹی کا عہدہ تو مجھے ورثے میں ملا تھا۔ ڈیڈی کی سیکرٹری ان دنوں بچے کی ولادت کے انتظار میں چھٹی پر ہے اس لیے میں نے یہ فرائض خود پر لاد دے ہیں۔ جہاں تک نائب ہونے کا تعلق ہے تو میں نے یہ عہدہ بھی خود قبول کیا ہے۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ میں نے حال میں انڈیا بار ایسوسی ایشن کا امتحان پاس کیا ہے۔ بار ایٹ لاء کے لیے لندن جانے سے پہلے کچھ تجربہ حاصل کرنا چاہتی تھی اس لیے ڈیڈی کی نائب بن گئی۔

تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ اپنے تمام عہدوں سے بخوبی نمٹ رہی ہیں۔

بالکل، اس نے جواب دیا۔

اچھا وکیل صاحبہ، میں آپ کے ڈیڈی کو اپنے نانا کی جانب سے کچھ کاغذات دینے اور ان سے چند فارم لینے کے لیے بھیجا گیا ہوں، میں نے کہا۔

ماریہ بولی، ڈیڈی اس وقت اپنی لائبریری میں ہیں۔ آپ اوپر چل کر ڈیڈی سے مل لیں۔ میری طرح انہیں بھی آپ سے مل کر خوشی ہوگی۔

میں نے ہنستے ہوئے کہا، آپ نے مجھے نہیں بتایا تھا کہ آپ کو مجھ سے مل کر خوشی ہوئی تھی۔

اس کی ضرورت نہیں سمجھی، ماریہ نے ہنس کر جواب دیا۔ چلتے چلتے وہ اچانک رکی اور کہا، میں اوپر جا کر ڈیڈی کو حیران کرنا چاہتی ہوں۔ اس کے ساتھ ہی ماریہ نے طوطا سانپ اٹھا کر گلے میں ڈالا اور میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے تقریباً گھسیٹتے ہوئے گھر کی سیڑھیاں پھلانگنے لگی۔ سیڑھیاں ایک لائبریری نما کمرے میں جا کر ختم ہوئیں۔ کمرے کی تین دیواروں پر کتابیں بڑے سلیقے سے لکڑی کے شیلفوں میں بھری تھیں۔ جن میں زیادہ تر قانون سے متعلق تھیں۔ کمرے کے بیچ ایک بڑی میز کے گرد کرسیاں رکھی تھیں۔ میز پر چند بند، چند کھلی اور چند نیم کھلی کتابوں کے علاوہ شراب کی ایک بوتل اور چند گلاس رکھے تھے۔ ایک گلاس میں کچھ شراب بھی موجود تھی۔ جس کے سامنے والی کرسی پر ایک بڑی توند والا پختہ عمر کا آدمی بنیان اور لنگوٹ پہنے ایک کتاب پر جھکا بیٹھا تھا۔ ڈیڈی مجھے دیکھو، ماریہ نے کمرے میں قدم رکھتے ہوئے کہا۔

بیٹی کے گلے میں سانپ دیکھ کر باپ چند لمحے کے لیے بوکھلایا اور پھر حیرت سے بولا، بے بی کیا تمہیں اس بلا سے ڈر نہیں لگا؟

نہیں، بالکل نہیں، ماریہ نے جواب دیا۔

وہ کیسے؟ باپ نے پوچھا۔

اس جادوگر نے ایک منٹ کے اندر مجھے سانپ کے ڈر سے نکال کر اس کی محبت میں مبتلا کر دیا ہے۔ اس نے اپنے باپ کی توجہ میری جانب مبذول کراتے ہوئے کہا۔ پھر اس نے میرا تعارف پطرس جی سے کرایا۔ وہ مجھے بڑے تپاک سے ملے۔ میں نے انہیں نانا کے کاغذات دئے تو انہوں نے مجھے بیٹھنے کو کہا۔ اور ساتھ ہی سامنے پڑی ہوئی شراب کی بوتل کی جانب اشارہ کرتے ہوئے پوچھا، کیا آپ شوق فرماتے ہیں۔ کبھی کبھی، میں نے جواب دیا۔ اس نے پاس پڑے ہوئے ایک خالی گلاس سے کچھ شراب انڈیل کر اس میں برف کی ڈلی ڈالتے ہوئے کہا، یہ روسی۔۔۔ واڈکا ہے، میں نے اس کی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

پطرس جی نے کہا، لگتا ہے آپ بھی شغل کرتے ہیں؟

جی ہاں کبھی کبھی، میں نے جواب دیا۔ پھر اس کے دئے ہوئے گلاس سے شراب کی چند چسکیاں لینے کے بعد اجازت چاہتے ہوئے کہا، نانا جی نے کہا تھا کہ آپ مجھے بھرنے کے لیے چند فارم دیں گے۔

پطرس صاحب کے بجائے ماریہ کہنے لگی، آپ کچھ دیر رکیں۔ آخر آپ کو جلدی کاہے کی ہے؟

میں نے جواب دیا، ایک تو نانا انتظار کر رہے ہیں اور دوسرا کچھ اور لوگ بھی وہاں ہیں جو دستاویز پر دستخط کرنے کے بعد کلکتہ جانے والے ہیں۔ اس لیے، ہم یہ فارم جلدی جلدی بھرنا چاہتے ہیں۔

ماریہ بولی، آپ بڑے کمال کے آدمی ہیں۔ پلیز آپ کچھ دیر رک جائیں! میں آپ سے بہت سی باتیں کرنا چاہتی ہوں۔ پھر اس نے اپنے والد کی جانب دیکھتے ہوئے کہا، ڈیڈی! آپ انہیں کہیں نا کہ یہ رک جائیں۔

پطرس جی نے مجھے کہا، میری بیٹی کبھی کسی سے اتنی متاثر نہیں ہوتی۔ تم میں کوئی غیر معمولی صلاحیت ضرور ہے جس نے بے بی کو چند منٹوں میں تمہارا گرویدہ بنا دیا ہے۔ ورنہ میں نے تو اسے تم سے کاغذات لینے کو نیچے بھیجا تھا اور عام حالت میں یہ عاغذات لینے کے بعد گاہکوں کو دروازے سے ہی واپس لوٹا دیتی ہے۔

دراصل یہ ماریہ جی کی اپنی بڑائی ہے جو مجھے اچھی نگاہوں سے دیکھ رہی ہیں، میں نے جواب دیا۔

اگر میں بھی آپ کو اچھی لگی ہوں تو آپ کچھ دیر ٹھہر کیوں نہیں جاتے؟ پلیز۔ ماریہ نے کہا۔

اچھا یوں کریں کہ میں آپ کو فارم دیتا ہوں۔ آپ گھر جا کر یہ فارم پُر کر کے شام کو ہمیں دینے آ جائیں اور اسی بہانے آج شام کا کھانا ہمارے ساتھ کھائیں۔ میری بجائے پطرس جی بولے۔

ٹھیک ہے، میں نے ان کی بات مانتے ہوئے کہا۔

وعدہ، ماریہ بولی۔

جی وعدہ۔ میں نے جواب دیا۔ اس کے ساتھ ہی میں کھڑا ہو گیا۔ باپ کے بتائے ہوئے فارم دینے کے بعد ماریہ مجھے گاڑی تک چھوڑنے آئی، میں کھانا بہت اچھا بناتی ہوں آپ شام کو سات بجے تک ضرور آ جائیں۔ اور ہاں کھانے کے بعد جلدی نہیں جانے دوں گی۔

جی بالکل، میں نے جواب دیا اور وہاں سے فارم لے کر میں کلو کے ساتھ گھر آیا۔ نانا کی سرکردگی میں جینا، انکل اکرام اور میں نے تمام فارم بڑی احتیاط سے بھرے۔ اس کے بعد مناسب مقام پر ہم سب نے اپنے اپنے دستخط ثبت کیے۔ یہ سب کرتے کرتے چار بج گئے۔ فارم اپنے ساتھ کمرے میں لا کر میں کچھ دیر کے لیے لیٹ گیا اور مجھے نیند آ گئی۔ شام کے ساتھ بجے میری آنکھ کھلی تو مجھے پطرس جی کے ہاں سات بجے کی دعوت یاد آئی۔ دیر تو خیر ہو چکی تھی اس لیے میں بوکھلانے کی بجائے تسلی سے نہایا۔ گھر سے فارم اٹھا کر تقریباً آٹھ بجے ڈرائیور کو ساتھ لینے کی بجائے خود ہی گاڑی نکال کر سوچا کہ فارم دینے اور کھانا کھانے کے بعد کچھ دیر بیٹھ کر واپس آ جاؤں گا۔ پطرس جی کے گھر کا پھاٹک میری گاڑی دیکھ کر خود بخود کھلتا چلا گیا۔ پھاٹک کھولنے والی ماریہ تھی۔ اس نے ہلکے گلابی رنگ کا ڈھیلا اور ٹخنوں تک لمبا بغیر بازو کے غرارہ پہنا تھا۔ اور اپنے چہرے پر ہلکا سا میک اَپ بھی کیا تھا۔ گاڑی سے نکل کر میں نے کہا، آپ نے خواہ مخواہ گیٹ کھولنے کی زحمت کی۔ کسی نوکر سے کہہ دیا ہوتا۔ بولی، نوکر دن ڈھلتے ہی گھر چلے جاتے ہیں۔ پھر میں نے معذرت بھرے انداز میں کہا، دیر سے آنے کی معافی چاہتا ہوں۔ دراصل۔۔۔

ماریہ میری بات کاٹ کر ہنستے ہوئے بولی، معذرت کی ضرورت نہیں آپ وقت سے دو گھنٹے پہلے پہنچے ہیں۔

وہ کیسے؟ میں نے حیرت سے پوچھا۔

لگتا ہے آپ نے اپنی عمر ہندوستان سے باہر گزاری ہے۔ ہندوستان میں ہم اگر کسی کو دس بجے بلانا چاہیں تو اسے سات بجے کا وقت دیتے ہیں۔ میں نے آپ کو سات بجے اس امید پر بلایا تھا کہ آپ دس بجے سے پہلے نہیں آئیں گے۔ خیر آ ہی گئے ہیں تو پھر اوپر چلیں، ماریہ نے ہنستے ہوئے کہا۔

میں نے ماریہ کے کندھے پر طوطے سانپ کو دیکھ کر کہا، اب یہ سانپ آپ کے دوپٹے کے متبادل استعمال ہو رہا ہے۔ وہ بولی، تو اور کیا۔ جب سے آپ نے اسے میرے گلے میں ڈالا ہے، میں نے اسے گلے کے ہار کی طرح اپنے بدن پر سجا لیا ہے۔

لائبریری سے نکل کر ہم ایک ہال نما کمرے میں گئے جہاں صوفے رکھے تھے۔ اس نے مجھے بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے پوچھا، کیا پینا پسند کریں گے؟ واڈکا یا سوڈا۔ یا دونوں کا محلول (Mixture)۔ میں نے جواب دیا، آپ جو پینا چاہیں میرے لیے بھی لائیں۔ اس نے دو شیشے کے فینسی گلاس اور واڈکا کی بوتل میز پر لا کر رکھی تو میں نے پوچھا، آپ کے ڈیڈی نظر نہیں آ رہے۔

آپ کے جانے کے بعد انہیں یاد آیا کہ انہوں نے آج شام کسی کو دھیرج گنج میں ملاقات کا وقت دیا تھا۔ اس لیے انہیں جانا پڑا، ماریہ بولی۔

میں نے کہا، آپ مجھے فون کر کے بتا دیتیں، میں کسی اور دن آ جاتا۔

اس نے گلاس میں واڈکا انڈیلتے ہوئے کہا، ڈیڈی نے نہیں، آپ کو میں نے بلایا تھا اور میں یہاں ہوں۔

جی یہ بات تو ہے، میں نے گلاس اٹھا کر ہونٹوں سے لگاتے ہوئے کہا۔

واڈکا کا ایک گلاس اپنے اور دوسرا میرے سامنے رکھتے ہوئے ماریہ بولی، آپ کے جانے کے بعد میں نے اپنے ماہرِ نفسیات کو فون کر کے اپنے سانپ کے ڈر کے اختتام کا واقعہ سنایا تو وہ بھی آپ سے کافی متاثر ہوا اور اس نے آپ سے ملنے کی خواہش کا اظہار کیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی اس نے سانپ کو اپنے پاس پڑے ہوئے ایک بکس میں ڈال کر اپنا گلاس اٹھایا اور آہستہ سے چسکی لیتے ہوئے پوچھا، آج صبح آپ نے اپنے نام کے علاوہ مجھے اپنے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔ اب آپ مجھے اپنے بارے میں کچھ بتائیں۔

میں نے اپنی رام کہانی سنانے کے بجائے اسے صرف اتنا بتایا کہ میں نے ایف ایس سی کا امتحان پاہیرالہ کانونٹ کالج سے دیا ہے اور نتیجے کے انتظار میں ہوں۔ نتیجہ آنے پر آگے کی سوچوں گا۔

مجھے تو ایسے لگتا جیسے آپ سانپوں کی رگ رگ سے واقف ہیں، ماریہ بولی تو میں نے جواب دیا، آپ کا قیاس درست ہے۔ میں واقعی سانپوں کی رگ رگ سے واقف ہوں اور اس کی وجہ سانپوں کے بارے میں میرا ذاتی شوق ہے۔

آپ نے جس کمال سے میرا سانپوں کا ڈر دور کیا ہے میرا ماہرِ نفسیات سوچ رہا تھا کہ شاید آپ نے سانپوں کی نفسیات میں پی ایچ ڈی کی ہوئی ہے۔ جب میں نے اسے بتایا کہ آپ شکل وصورت سے نوجوان لڑکے سے لگتے ہیں تو وہ کہنے لگا بعض لوگ نوعمری میں پی ایچ ڈی کر لیتے ہیں۔ تفصیل میں جانے کی بجائے میں نے صرف اتنا کہا، مجھے بچپن سے سانپوں کے علم میں دلچسپی تھی۔ لیکن آپ کی باتیں اور آپ کا تجربہ کسی طرح غیر پختہ نہیں لگتا اس نے اپنا گلاس خالی کرتے ہوئے کہا۔

ہم باتوں کے دوران واڈکا کی بوتل خالی کر کے گلاس بھرتے رہے اور بھرے ہوئے گلاس اپنے حلق میں خالی کرتے رہے۔ اس دوران وہ سامنے والے صوفے سے اٹھ کر میرے پاس آ کر بیٹھ گئی۔ پھر اس نے اپنے جسم کا بوجھ مجھ پر اور اپنا بازو میری گردن میں ڈالتے ہوئے مجھے کچھ ایسی نظروں سے دیکھا جس کا مطلب سمجھنے کے لیے مرد کو کسی ترجمان کی ضرورت نہیں ہوتی۔ میں بھی اس کے بہاؤ کے ساتھ بہنے لگا۔ شراب اور شباب تنہائی میں اکٹھے ہو کر دو آتشہ ہو جاتے ہیں۔ پہلے ہمارے لب ملے، پھر ہمارے جسم ملے اور اس کے ساتھ ہی ہمیں اپنے کپڑے جسم پر بوجھ محسوس ہونے لگے۔ کچھ دیر ہم ایک دوسرے کے بدن سے کھیلتے رہے۔ پھر ہم ایک دوسرے سے بار بار سیر ہوتے رہے۔

کافی دیر بعد ماریہ نے اچانک اٹھتے ہوئے کہا، ارے معافی چاہتی ہوں۔ میں آپ کو کھانا کھلانا بالکل ہی بھول گئی۔ آپ کو بھوک تو نہیں لگی؟

میں نے جواب دیا، کوئی بات نہیں، اب کھا لیتے ہیں۔

ہم وہاں سے اٹھے اور ایک ساتھ غسل خانے میں گھس گئے۔ ہم دونوں نے پہلے ایک دوسرے کو اچھی طرح نہلایا پھر ایک دوسرے کا بدن سکھایا اس کے بعد ایک دوسرے کو کپڑے پہنائے اور پھر کھانا کھایا۔ اس وقت تک رات کا ایک بج رہا تھا۔ کھانے کے بعد میں نے جانے کی اجازت چاہی تو اس نے مجھے رات رکنے کو کہا۔

میں نے جواب دیا، گھر والے میری غیر موجودگی کی وجہ سے پریشان ہوں گے۔ گھر بتا کر آیا ہوتا تو شاید رک بھی جاتا۔

ماریہ کہنے لگی، آپ کے ساتھ گزارا ہوا وقت مجھے اچھا لگا ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ آپ کے ساتھ ہر رات کچھ وقت گزاروں۔ کیا آپ کل پھر ہمارے ہاں آ سکتے ہیں؟

میں نے جواب دیا، وعدہ اس لیے نہیں کرتا کہ اگر مصروفیت نکل آئی تو آپ کو خواہ مخواہ انتظار کی زحمت ہوگی۔ ماریہ اپنا جسم میرے جسم سے رگڑتے ہوئے بولی، آپ کے وعدے پر تو میں تمام عمر انتظار کی لذت برداشت کرنے کو تیار ہوں۔

میں نے کہا، کل صبح آپ نے اپنے ڈیڈی کے ساتھ ہمارے ہاں آنا ہے۔ اگر مجھے آنا ہوا تو میں آپ کو وہیں پر بتا دوں گا۔

وہ بولی، پہلے تو شاید نہ آتی لیکن اب ضرور آؤں گی۔ آخری بوسے کے بعد ہم ایک دوسرے سے جدا ہوئے۔ گھر آ کر مجھے سوتے سوتے صبح کے تین بج گئے۔ اس لیے میری آنکھ صبح دس بجے دھرمیندر کے آنے پر کھلی، اس نے بتایا کہ پطرس جی آئے ہوئے ہیں اور سب لوگ بیٹھک میں میرا انتظار کر رہے ہیں۔ میں جلدی سے نہا کر بیٹھک میں پہنچا تو دیکھا کہ پطرس جی تنہا تھے۔ نانا نے مجھے دیکھ کر کہا، آؤ بیٹا، آؤ۔ میرے آنے سے پہلے ہی پطرس جی نے ہمارے بھرے ہوئے تمام فارموں کی پڑتال کر لی تھی۔ مجھے کہنے لگے، سارے کاغذات تیار ہیں۔ آج ان کو پچھلے پہر کچہری سے رسیدی ٹکٹ اور اوتھ کمشنر کے دستخط اور مہر لگوا کر سیشن جج کے دفتر داخل کرا دیتے ہیں۔ نانا جی راضی ہو گئے۔ ہم نے پطرس جی کی موجودگی میں کاغذات پر دستخط کیے۔ نانا نے دستخط کے ساتھ اپنی مہر بھی لگائی۔

کاغذات مکمل کرنے کے بعد انہوں نے مجھے کہا بھئی معافی چاہتا ہوں تمہیں بلانے کے بعد یاد آیا کہ مجھے دھیرج گنج جانا تھا۔ مجھے یقین ہے کہ بے بی نے تمہیں میری کمی محسوس نہیں ہونے دی ہوگی۔ اس نے ابھی میرے ساتھ یہاں آنا تھا لیکن صبح اس کی طبیعت خراب تھی اس لیے میں نے اسے آرام کرنے کو کہا۔ پھر بولے، تم ابھی میرے ساتھ چل کر یہ سب کاغذات کچہری میں خود ہی جمع کروا دو۔ میں نے جواب دیا، آپ جائیں مجھے انکل اکرام کو کلکتہ کے لیے رخصت کرنا ہے اس کے بعد دوپہر تک آؤں گا۔

پطرس جی کے جانے کے بعد ہم نے انکل اکرام کو کلکتہ بھیجنے کی تیاری کی تو جینا نے نانا سے پوچھا کہ وہ اپنی دادی کو کلکتہ کے ائیر پورٹ پر لینے کے لیے انکل اکرام کے ساتھ جانا چاہتی ہے نانا راضی ہو گئے۔ اس لیے دونوں کو گاڑی میں کلو کے ساتھ بھجوایا۔ میں نے کلو کو نیتو کے گھر کا راستہ اچھی طرح سمجھا دیا اور ساتھ ہی انہیں نیتو کے گھر کا فون نمبر بھی دے دیا۔ ان کے جانے کے بعد میں اور نانا کچھ دیر تک بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ وہ آرام کے لیے اپنے کمرے میں گئے تو میں گاڑی نکال کر پطرس جی کے گھر گیا۔ ان کے گھر کے باہر غیر معمولی چہل پہل تھی اور کئی ایک گاڑیاں بھی کھڑی تھیں۔ میں اپنی گاڑی سڑک پر ایک جانب کھڑی کر کے اندر گیا تو دیکھا کہ پطرس جی دفتر میں کئی لوگوں کی موجودگی میں رو رہے تھے۔

مجھے دیکھ کر بولے صیام بابو، میری بے بی چلی گئی ہے۔ وہ مر گئی ہے بابو وہ مر گئی ہے۔ ساتھ ہی اس نے زور زور سے رونا شروع کر دیا۔ اس خبر سے مجھے دھچکا لگا اور حیرت بھی ہوئی۔ میں نے پوچھا، کیسے؟ کل تک تو اچھی بھلی تھیں۔ آج صبح تمہاری طرف آنے کے وقت اس نے طبیعت کی خرابی کی شکایت کی اس لیے میں اسے گھر چھوڑ گیا۔ تمہارے ہاں سے واپس آیا تو وہ اپنے بستر پر بے حس و حرکت پڑی تھی۔ ڈاکٹر کو بلایا تو اس نے بتایا کہ بے بی اپنے بوڑھے ڈیڈی کو ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر چلی گئی ہے۔ ڈاکٹر کی رپورٹ کے مطابق اسے سوتے میں دل کا جان لیوا دورہ پڑا تھا۔

اوپر والی منزل سے ایک آدمی نیچے آیا اور پطرس سے بولا، صاحب آپ کو ڈاکٹر صاحب اوپر بلا رہے ہیں۔ میں بھی ان کے ساتھ اوپر گیا۔ ماریہ کا جسدِ خاکی ایک بستر پر پڑا تھا۔ اس کے ہونٹوں کی رنگت دیکھ کر میرے ہوش اڑ گئے۔ اس کے ساتھ ہی میں نے اس کی آنکھوں پر نظریں دوڑائیں تو مجھے ایسے لگا جیسے کسی نے میرے قدموں تلے سے زمین کھینچ لی ہو۔ پھر میں نے جلدی سے اس کے سینے پر رکھے ہوئے ہاتھوں کے ناخنوں کو دیکھا تو میرا شک یقین میں بدل گیا۔

اپنی زندگی میں میں نے سانپ کی کاٹ سے مرنے والوں کی اگر ہزاروں نہیں تو سینکڑوں لاشیں دیکھی تھیں۔ زہریلے سانپ کے ڈسنے مرنے والوں کے جسم پر ہو بہو ایسی ہی نشانیاں پائی جاتی ہیں۔ ماریہ کے جسم پر ساری نشانیاں سانپ کے کاٹے کی تھیں اور مجھے یقین ہے کہ یہ موت دل کے دورے کا نتیجہ نہیں تھی۔ کل ماریہ طوطا سانپ سے کھیل رہی تھی۔ لیکن طوطا سانپ اتنا زہریلا نہیں ہوتا اور نہ ہی اس کی کاٹ سے انسان مرتے ہیں۔ میں نے خود سے سوال کیا تو پھر ماریہ کے جسم میں سانپ کا زہر کیسے داخل ہوا؟

ایسے میں مجھے رمپا کی موت یاد آئی۔ مجھے یاد آیا کہ کمبرلی جاتے ہوئے برف پگھلنے کی وجہ سے رمپا کی لاش کو درست کرنے کے لیے جب گاڑی رکی تھی تو میں نے اس وقت اس کے ناخنوں کی پیلاہٹ محسوس کی تھی۔ مجھے یہ بھی یاد آیا کہ جسے میں نے صلح کرنے کے بعد اس کے مردہ ماتھے پر بوسہ دیا تھا تو میں نے دیکھا تھا کہ رمپا کی آنکھوں کی پتلیاں بھی سکڑی ہوئی تھیں لیکن طبیعت کی خرابی کی وجہ سے میں اس وقت زیادہ دھیان نہیں دے سکا تھا۔ کالی رنگت اور کالے ہونٹوں کی وجہ سے میں رمپا کے ہونٹوں کی رنگت نہیں دیکھ سکا تھا۔ تو اس کا مطلب تھا کہ رمپا بھی شادیِ مرگ کا شکار نہیں زہر کا شکار ہوئی تھی۔ اب مجھے اس بات پر کوئی شک نہیں تھا کہ رمپا اور ماریہ کی اموات سانپ کے زہر سے ہوئی تھیں کس کے زہر سے؟

میرے زہر سے۔ دونوں میرے ساتھ ہمبستری کی سزاوار تھیں اور یہ زہر ان کے جسم میں میں نے یعنی ایک سپیرے نے دورانِ ہمبستری داخل کیا تھا جس کے بعد دونوں کو صبح کا سورج دیکھنا نصیب نہیں ہوا۔ یہ سوچ مجھے پاگل کرنے کے لیے کافی تھی کہ میری رگ و پے میں خون نہیں بلکہ زہر دوڑ رہا تھا۔ اس زہرِ قاتل سے صرف مجھے کاٹنے والے حشرات الارض ہی نہیں، مجھے پیار کرنے والے بھی ہم بستری کرنے کے بعد میرے زہر کی تاب نہ لاتے ہوئے ہمیشہ کے لیے موت کی نیند سو جاتے ہیں۔

اس یقین کے بعد میرا جسم کسی طوفان زدہ درخت کی طرح لرزنے لگا۔ میرے ذہن میں جیسے آندھیاں چلنے لگیں اور دماغ نے آگے سوچنے سے انکار کر دیا۔ مجھے ایسے لگا جیسے سارے جہان کی انگلیاں مجھ پر اٹھی ہوں اور ساری دنیا کی آنکھیں مجھے گھور رہی ہوں۔ مجھے اطراف سے آوازیں سنائی دینے لگیں۔ تم قاتل ہو، تم خونی ہو۔ تم ایک زہریلے انسان ہو۔ تم نے رمپا جیسی معصوم ہستی کو افریقہ میں اپنے زہر سے مار ڈالا تھا اور کل رات ماریہ تمہارے زہر کا شکار ہوئی ہے۔ میں نے اپنے ضمیر کی ڈانٹ سنی جو مجھ سے اقبالِ جرم کروانا چاہتی تھی۔ میرے پاس اپنی صفائی کا کوئی ثبوت نہیں تھا اور میرے لیے اعترافِ جرم کرنے کے علاوہ کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ میں نے اقبال جرم کرتے ہوئے کہا، ہاں میں ایک زہریلا انسان ہوں جس نے اپنے پیار کی دیوانی دو خوبصورت لڑکیوں کو اپنے زہر سے مارا ہے۔ مجھے اپنی بڑبڑاہٹ وحشت ناک لگی۔ ایسی حالت میں اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا اور اپنے حواس کھو کر ماریہ کے مردہ جسم پر جا گرا۔

خدا کی محبت

خدا کی محبت کا ہو گا تبھی دعویٰ سچا
کہ خلق خدا سے بھی جب ہو گی ویسی محبت
اگر ظلم مخلوقِ خالق پہ کرتے رہو گے
تو الفت کہاں کی، تمہارا نصیب اُس کی لعنت

حافظ محمد احمد

(راولپنڈی)

''چندن کا بدن''

شگفتہ نازلی

(لاہور)

کچھ تو بتایئے کہ یہ کس کی کہانی ہے
جملوں میں جس کے پانیوں کی سی روانی ہے

اک نظم لکھ کے رکھی ہے طرزِ جدید کی
لیکن نہیں ہے طے ابھی کس کو سُنانی ہے

اسلوب خاص سے ہی تو مشکل ہوئی آساں
کچھ بھی کہیں مگر یہی تو مہربانی ہے

جس ڈھب سے آپ نے اسے منظوم ہے کیا
سچ تو یہی کہ سوچ کی یہ ترجمانی ہے

ساری وضاحتیں تو اُن پر بے اثر رہیں
قائم وہاں پہ اب بھی وہی بدگمانی ہے

معمول زندگی کے کب یکساں سے رہتے ہیں
تو کیوں نہ سوچیے اگر کچھ ناگہانی ہے

ہر سو فضا ہے خوشگوار، لہجے پُر بہار
شاید کہ نازلی تبھی تو رُت سہانی ہے!

○

وشال کھُلر

(لدھیانہ)

اک آگ کا دریا سا بنا کیوں نہیں لیتے
اور دھوپ سے بارش کو سجا کیوں نہیں لیتے

آنکھوں میں اترنے کا بہانہ کوئی ڈھونڈے
اُس خواب کو پلکوں پہ بٹھا کیوں نہیں لیتے

کیوں زرد چراغوں میں اجالے نہ بھریں گے
اک سوچ کا طوفان اٹھا کیوں نہیں لیتے

اس شاخ سے اجگر کوئی لپٹا بھی نہیں ہے
چندن کا بدن اور بنا کیوں نہیں لیتے

ہستی کے مطابق ہی ڈھلا جائے تو اچھا
ورنہ کوئی پتھر ہی اٹھا کیوں نہیں لیتے

○

افتخار راغب

(دوحہ)

ہنسی آئے تو ہو کچھ کم اداسی
دیارِ جاں میں ہے پیہم اداسی

یہ کیا حالت بنا رکھی ہے تو نے
سدا رنجیدگی، ہر دم اداسی

ستایا ہے بہت تو نے کسی کو
نہیں چھوڑیں گے تجھ کو ہم اداسی

کبھی تو چھیڑنا ہو بار آور
کبھی تو مجھ سے ہو برہم اداسی

ہنسیں کس طرح آخر کھلکھلا کر
خوشی کے ساتھ ہے مدغم اداسی

ہماری مُسکراہٹ سے نہ ٹکرا
کہاں ہے تجھ میں اتنا دم اداسی

درؤں ہر آن خالی پن ہے راغبؔ
برؤں دیوار و در پر غم، اداسی

○

ابراہیم عدیل

(جھنگ)

وہ رنگ و نور کے جتنے تھے باب کھول دیئے
عجب ہوا تھی گلوں کے نقاب کھول دیئے

اُسی کے پاس حسیں موسموں کی یاس بھی تھی
ہمارے سامنے جس نے سراب کھول دیئے

شکارِ غم ہوئی پرواز فاختاؤں کی
فضا میں ظلم کے ایسے عقاب کھول دیئے

کچھ اب وہ شخص بھی کم کم دکھائی دینے لگا
کچھ اپنی آنکھوں سے ہم نے بھی خواب کھول دیئے

بڑے ہی شوق سے پہلے خسارے باندھ لیے
مگر ہی ایسا ہوا کہ شتاب کھول دیئے

کچھ اس ادا سے وہ جھونکا ورق پلٹنے لگا
کہیں پہ زخم کہیں پہ گلاب کھول دیئے

عجب ڈر تھے دلوں میں ملے جو دریا سے
بھنور نے ذہن کے سب پیچ و تاب کھول دیئے

غبار اُڑنے لگا برگ و بار جھڑنے لگے
عدیلؔ جب بھی پرانے نصاب کھول دیئے

○

نیلم ملک

(لاہور)

مانیں گے ہم قضا نہ زمانے کا فیصلہ
خود ہی کریں گے جانے نہ جانے کا فیصلہ

تُو بھی تو ایک راز ہے اس کائنات کا
سو عقل نے کیا تجھے پانے کا فیصلہ

مانوس ہوں خزاں سے تو آ جائے پھر بہار
موسم نے کر رکھا ہے ستانے کا فیصلہ

فرصت کا مشغلہ ہے، تمنائے گل نہیں
ہے ریت پر جو باغ لگانے کا فیصلہ

پہلے تو تیرا در تھا پڑاؤ مرے لیے
اب کر لیا یہیں پہ ٹھکانے کا فیصلہ

چھانے لگا زمان و مکاں پر عجب سکوت
میں نے کیا جو شور مچانے کا فیصلہ

ہم نے زمیں پہ امن بھی دیکھا ہے والفلک
جھوٹی خبر سہی، ہے اڑانے کا فیصلہ

اے لاشریک! واسطہ اس وصف کا تجھے
کر مجھ سا کوئی اور بنانے کا فیصلہ

ہو طور پر کہیں کہ ملے عرش سے پرے
اب کے ہے تجھ کو ڈھونڈ کے لانے کا فیصلہ

○

عامر عبداللہ

(جھنگ)

یہ شعبدہ نہیں صاحب، یہ ہے کمال مرا
چمک اُٹھا میں، بڑھا جس قدر ملال مرا

اُسی گلی اُسی روشن گلی کی بات ہے یہ
جب ایک موڑ پہ مجھ سے مِلا ملال مرا

میں اپنے جسم کی صد حیرتی میں لوٹ آیا
ہزار شکر کہ خود سے ہوا وصال مرا

مرے لیے کوئی جائے اماں نہیں شاید
کوئی جہان نہیں ہو جو حسبِ حال مرا

تمام عمر کھلا رکھا میں نے دروازہ
تمام عمر نہ لوٹا وہ خوش جمال مرا

○

سیفی سرونجی
(سرونج)

کچھ کام کر سکیں نہ رسوائیاں ہماری
آباد پھر سے ہو گئیں تنہائیاں ہماری

چہرہ ستا ہوا ہے نگاہیں اداس ہیں
بے چین کر گئیں اسے پرچھائیاں ہماری

بارات اس کی دھوم سے نکلی ہے اس طرف
لیکر رہینگی جان یہ شہنائیاں ہماری

ظلم و ستم پہ آپ کے اف تک نہ کر سکے
یہ ظرف ہے ہمارا یہ گہرائیاں ہماری

کچھ کچھ تو ختم ہو گئی نفرت دلوں کی آج
لیکن ہیں پھر ساتھ میں رسوائیاں ہماری

○

رومانہ رومی
(کراچی)

وہ گنگناتی، مہکتی ہوئی حسیں شامیں
مری حیات پہ پھیلی ہیں دِل نشیں شامیں

غزل نے چھیڑ دیا سازِ روح کو میرے
سُروں میں ڈھلنے لگیں پھر سے نغمگیں شامیں

مصوری کی ہیں شہکار، شاعری کی دھنک
ہزاروں نقش کھلاتی ہیں مرمریں شامیں

تمھارا ساتھ تھا یا زندگی تھی میرے ساتھ
کہیں تھیں صبحیں مری اور تھیں کہیں شامیں

عجیب لطف تھا کیا بے خودی کا عالم تھا
خیال آیا بچھڑنے کا رو پڑیں شامیں

مرے لیے تو حسیں خواب لے کے آتی ہیں
مرے لیے تو سبھی کچھ ہیں کیا نہیں شامیں

مہک رہی ہے فضا یاسمیں کے پھولوں سے
ترے لیے تو مہکتی ہیں دلنشیں شامیں

شگفتگی کا یہ احساس بارشوں میں ہوا
گل و شجر کی طرح کیسی ڈھل گئیں شامیں

ستارے بن گئے ذرّے بھی میرے آنگن کے
جبیں پہ میری تو افشاں بنی رہیں شامیں

محبتوں کے حسیں سرمئی اُجالوں میں
مَیں ہنس پڑی تو مرے ساتھ ہنس پڑیں شامیں

مہک کے رہ گیا رومی مشامِ جاں اپنا
گُلوں کی طرح سے دِل میں اُتر گئیں شامیں

○

نوید سروش
(میرپورخاص)

جہاں پانی ذخیرہ تھا وہاں صحرا بنایا ہے
جہاں صحرا ہی صحرا تھا وہاں دریا بنایا ہے

یہ دیواریں عمارت کی بڑی رنگین تھیں یارو
یہاں کے چپے چپے پر ترا نقشہ بنایا ہے

ان آنکھوں سے برستے ہیں ذرا سی بات پر آنسو
یہ شکلِ دل ہر اک سینے میں اک بچہ بنایا ہے

ذرا سی ٹھیس لگنے سے یہ چکنا چُور ہوتا ہے
ہر اک انساں کا پیکر بہت کچا بنایا ہے

اگر وہ داستاں میری سمجھ پائے تو آ جائے
اُسے جو خط لکھا ہے اُس میں اک نقشہ بنایا ہے

○

سبھاش گپتا شفیق

(ہوشیارپور)

ظلمتوں کے ہونٹوں پر نور کی کہانی ہے — تیرگی کا بڑھ جانا صبح کی نشانی ہے
اپنے آپ راتوں کو پلکیں بھیگ جاتی ہیں — اپنے پاس یہ انکے پیار کی نشانی ہے
دل دکھا نہیں پاتی تب سے کوئی محرومی — جب سے ہم نے سمجھا ہے یہ حیات فانی ہے
روز جسکے کہنے سے اتنے پیڑ کٹتے ہیں — لوگ کہتے ہیں اسکا شوق باغبانی ہے
چاند پر بسیروں کا انتظام کرتے ہیں — دنیا یہ فنا کر کے دوسری بسانی ہے

○

احسان قادر

(لاہور)

اب دل میں کوئی خواہش نے کوئی خسارا ہے — بے نام دریچوں میں جب ہجر گزارا ہے
جی چاہے تو لوٹ آنا کچھ قید نہیں تم پر — یہ بستی تمہاری ہے یہ گھر بھی تمہارا ہے
قدرت نے کیا جو کچھ بہتر ہے مرے حق میں — جو کچھ وہ عطا کر دے وہ ہم کو گوارا ہے
انسان حقیقت میں خودسر بھی ہے ناداں بھی — جب چوٹ پڑی دل پر پھر کس کو پکارا ہے
اشعار مرے پڑھ کر کیوں کر نہ کوئی سوچے — جب فکر کی کرنوں کو کاغذ پہ اتارا ہے
جو پاس نہیں ہے سب اس شے کی طلب میں ہیں — اس کثرتِ خواہش نے انسان کو مارا ہے
تو ہی تو ہے ساتھ اپنے ہر مشکل و آساں میں — اے حسنِ ازل تو ہی جینے کا سہارا ہے
احسان پیادے کی ہر چال پہ قادر تھا — ہارا ہے اگر بازی کچھ سوچ کے ہارا ہے

○

اصغر شمیم

(کلکتہ)

تیرگی شب کی اب مٹائے کون — ہر طرف اب دئے جلائے کون
جب اندھیرے میں ہے بدن میرا — روشنی میں مجھے نہائے کون
عشق ہی جب نہیں رہا تجھ سے — تیرے نخرے بھلا اٹھائے کون
میرے اپنوں کا کچھ پتا ہی نہیں — خاک پر اب مجھے سلائے کون
تیرگی سے فرار ناممکن — اب کرن روشنی کی لائے کون
جو تھا اپنا وہی نہیں اصغر — دل میں امید اب جگائے کون

○

سگریٹ

(امریکن کہانی)

ظفر قریشی (نیویارک)

سام سیوتیج (Sam Savage) نے سگریٹ کے حوالے سے اپنی کمزوری کی کہانی بیان کی ہے۔ بیس ناولوں کا مصنف کہتا ہے کہ ''سگریٹ نوشی ترک نہیں کرنا چاہتا۔ جین اسٹیفورڈ (Jean Stafford) سگریٹوں کو اپنے ننھے منے دوست قرار دیتی ہیں۔ وہ ایک مصنفہ ہیں اور کہتی ہیں کہ سگریٹ ہمیشہ ان کے ساتھ رہتے ہیں اور ان کے لیے اس حد تک کارآمد ہیں کہ وقت کا تعین کرتے ہیں اور انہیں دوستوں سے الگ کرتے ہیں جن میں ان کی اپنی صاحبزادی بھی شامل ہیں۔ سگریٹ یا تمباکو نوشی پر سام سیوتیج کی تحریر بہت نازک ہے اور عام طور اسے ایک قبیح عادت کی بے جا حمایت قرار دیا جائے گا۔ یہ تحریر دراصل انتخاب اور محبت کے بارے میں ہے کہ آپ اپنے لیے کیا منتخب کرتے ہیں اور اس سے آپ کو کتنی انسیت ہے۔ خود سام سیوتیج کا کہنا ہے کہ میری دیگر تحریروں کی طرح یہ کہانی بھی ایک جملے اور ایک تصویر سے شروع ہوتی ہے۔ کمرے میں مرد ہے اور دروازے پر عورت ہے اور دونوں تمباکو نوشی میں مصروف ہیں۔ اس لحاظ سے میری دیگر کہانیوں کی طرح یہ کہانی بھی مختصر ہے لیکن جب میں ناول لکھتا ہوں تو یہ ایک طویل، مشکل اور صبر آزما عمل ہوتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں الفاظ پر الفاظ رکھنے اور اسے ایک دیوار کی شکل دینے کا نام ناول نگاری ہے۔ ناول تحریر کرتے ہوئے جب بیچ میں وقفہ آتا ہے اور کہانی کا تانا بانا آگے بڑھنے لگتا ہے تو ایسے مراحل پر سگریٹ بہترین ساتھی کا کردار ادا کرتا ہے۔

☆

میں جس عورت کا کرایہ دار ہوں وہ اس وقت میرے دروازے پر کھڑی ہے۔ اس کا ایک ہاتھ دروازے کے ہینڈل پر ہے۔ دو مالے چڑھ کر آئی ہے اس لیے ہانپ رہی ہے یا یوں کہیں کہ اس کا سانس پھولا ہوا ہے۔ میرا کمرہ دوسری منزل پر ہے جیسا کہ میں ابھی ابھی کہہ چکا ہوں۔ اس نے اتنی زحمت اس لیے کی ہے کہ اسے ایک عدد سگریٹ چاہیے۔ یہ وہی پرانی کہانی ہے کہ ڈاکٹر کے پاس گئی تھی۔ ڈاکٹر نے سگریٹ کے حوالے سے ڈراؤنی کہانیاں سنا سنا کر اُس کی پھونک سرکا دی تھی۔ وہ ڈاکٹر کے کلینک سے نکلی تو اس عزم کے ساتھ تھی کہ اب وہ تمباکو نوشی بند کر دے گی۔ اس نے ڈاکٹر سے وعدہ بھی کر لیا تھا۔ اس کا باقی سارا دن صرف اس قسم کی باتیں کرتے گزرا تھا کہ کسی طرح وہ اس نتیجے پر پہنچی ہے کہ اسے بالآخر سگریٹ چھوڑنا ہی پڑے گا۔ دوران گفتگو وہ بار بار اپنے اسے مصمم ارادے کا اعادہ کرتی رہی تھی کہ اس مرتبہ اس نے پکا ارادہ کر لیا ہے۔

اگلی صبح میں کچن میں داخل ہوا تو میں نے دیکھا کہ کاؤنٹر پر اس کی کافی کا کپ رکھا ہے اور کپ جس طشتری میں رکھا ہے اس میں بجھے ہوئے سگریٹوں کے چند ٹوٹے پڑے ہوئے ہیں۔ ''دراصل مجھے یہ عادت ترک کرنے کی کوشش بھی نہیں کرنی چاہیے تھی۔'' مجھے دیکھ کر اُس نے کہا۔ ''اگلی بار جب میں سگریٹ نوشی ترک کرنے کا فیصلہ کروں تو میری تم سے درخواست ہے کہ مجھ سے کہہ دو کہ مشکل ہے۔ تم نہیں چھوڑو گی۔ اس لیے رہنے ہی دو۔ کوشش بھی نہ کرو۔'' مجھے معلوم ہے کہ عادت ترک نہ کر سکنے کی مجبوری کا اسے پورا احساس ہے چنانچہ میں کوئی جواب نہیں دیتا۔ میں موقع ملنے پر بھی اس کا مذاق نہیں اڑاتا اور خاموشی سے ایک سگریٹ اس کے حوالے کر دیتا ہوں۔ وہ جھپٹ کر سگریٹ پکڑ لیتی ہے اور وہیں کھڑے کھڑے اسے لائٹر کا شعلہ دکھا دیتی ہے۔ ایک طویل کش لینے کے بعد ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے اور ناک سے دھواں نکالتے ہوئے وہ کہتی ہے:

''شِٹ (Shit)!''

میں اپنی گول گھومنے والی کرسی پر بیٹھا ہوں۔ میں کرسی کو گھماتا ہوں تو وہ میرے سامنے ہوتی ہے۔ اس میں پھیل کر کرسی کی پشت کو پیچھے کی طرف دھکیلتا ہوں اور اپنا سگریٹ سلگا لیتا ہوں۔ ہم تھوڑی دیر اپنی اپنی سگریٹوں سے لطف اندوز ہوتے ہیں اور کوئی بات نہیں کرتے۔ ہم دونوں دن بھر میں دو پیکٹ سگریٹ پی جاتے ہیں۔ میری مالک مکان اور میں۔ ادھر اس کا بھائی کلیمنٹ (Clement) ہے جو ہماری طرح دو پیکٹوں پر گزارا کرتا ہے۔ وہ علیحدہ اپنے اپارٹمنٹ میں رہتا ہے۔ اس کا اپارٹمنٹ زیر زمین ہے جسے یہاں بیسمنٹ (Basement) کہا جاتا ہے۔ لیکن اس کا زیادہ وقت دوسری منزل پر اسی کچن میں یا بیٹھک میں ٹی وی کے سامنے گزرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ سب کی طرح وہ بھی ٹی وی دیکھتے ہوئے تمباکو نوشی سے محظوظ ہوتا ہے۔ کلیمنٹ اور ہم میں فرق یہ ہے کہ وہ اپنے سگریٹ خود بناتا ہے چنانچہ دوسری منزل کا ہمارا اپارٹمنٹ دھوئیں کا گھر مشہور ہے۔ اس گھر میں ہم تینوں میں سے کوئی ایک تمباکو نوشی میں ہی مصروف رہتا ہے۔ کبھی ہم تینوں یکجا ہو جاتے ہیں تو اکٹھے سگریٹ پینا شروع کر دیتے ہیں جس کے نتیجے میں اپارٹمنٹ میں دھواں کہر جتنا دبیز ہو جاتا ہے۔

کھڑکیوں کے شیشوں پر دھوئیں کی پتلی سی جھلی جم جاتی ہے۔ شیشوں کو انگلی لگاؤ تو انگلی چپکنے لگتی ہے۔ مکان مالکن کہتی ہے کہ شیشے صاف کرنے کا کوئی فائدہ نہیں کیونکہ دو دن بعد شیشوں پر نئی جھلی جم چکی ہوگی۔

آج کل تمباکو نوشوں کی تعداد بہت تیزی سے کم ہو رہی ہے بلکہ میں تو کہوں گا کہ پہلے کے مقابلے میں یہ تعداد اب اقلیت میں تبدیل ہو گئی ہے۔ ''بات دراصل یہ ہے کہ ہم لوگوں کا تعلق اس نسل سے ہے جو تیزی سے ختم ہو رہی ہے۔'' یہ کلیمنٹ کا پسندیدہ جملہ ہے۔ ہم تینوں کے پاس ایک دوسرے سے کہنے کے لیے کچھ نہیں ہوتا لیکن ہم عموماً ساتھ ہی ہوتے ہیں۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ ہم تمباکو نوشوں پر ہر طرف سے پابندیاں ہی پابندیاں ہیں۔ ہم ریستورانوں میں سگریٹ نہیں پی سکتے۔ باروں (Bars) میں ہم پر پابندی ہے لہٰذا شامیں ہماری

اکثر گھر ہی پر گزرتی ہیں بلکہ راتوں کو ہم گھر سے ہی نہیں نکلتے۔ پہلے پارکوں وغیرہ یعنی کھلی جگہوں پر ہمیں تمبا کو نوشی سے منع نہیں کیا جاتا تھا، اب وہاں بھی پابندی ہے۔ مجھے یاد ہے کہ ایک زمانے میں ہم سینما تھیٹر (Theaters) میں سگریٹ پیا کرتے تھے، دوستوں کے گھروں پر یا دعوتوں میں کھڑے کھڑے دھواں اڑا لیا کرتے تھے، کہیں گپ لگانے پہنچ جائیں تو اب کہا جاتا ہے کہ سگریٹ پینا ہے تو باہر جا کر جلدی جلدی چند کش لگا لو اور واپس آ جاؤ۔ اب انہیں کوئی پروا نہیں ہوتی کہ باہر بارش ہو رہی ہے یا برفباری، گھر کے اندر تمبا کو نوشی کی اجازت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ پرانا سامان فروخت کرنے والی دوکانوں میں ڈھیروں ایش ٹرے پڑی ہوتی ہیں جنہیں اب کوئی نہیں پوچھتا۔ اب اگر کوئی ایش ٹرے رکھتا بھی ہے تو اس میں آپ کو پیپر کلپس (Paper Clips) وغیرہ ہی نظر آئیں گی۔

چنانچہ میں کہہ رہا تھا کہ کلیمنٹ، میں اور میری مالک مکان ہم تینوں کا زیادہ وقت ساتھ ہی گزرتا ہے۔ ہم بیٹھک میں ٹی وی کے سامنے، صوفے پر بیٹھتے ہیں تو ایسا لگتا ہے جیسے ہمارے نچلے دھڑ آپس میں جڑے ہوئے ہیں۔ ہم تینوں میں کلیمنٹ (Clement) ماہر تمبا کو نوش ہے۔ وہ جب بھی اچھے موڈ میں ہوتا ہے اور سگریٹ پی رہا ہوتا ہے تو دھوئیں کے مرغولے منہ سے نکالتے ہوئے انگریزی کا حرف ''O'' اتنی اچھی طرح بناتا ہے کہ ہم داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ کبھی کبھی تو وہ ایک ''O'' میں سے دوسرا ''O'' گزار دیتا ہے اور کبھی ''O'' کا حرف زنجیر کی طرح اس کے منہ سے نکلتا دکھائی دیتا ہے۔ ایک ''O'' کے بعد دوسرا اور دوسرے کے بعد تیسرا، چوتھا اور پانچواں۔ غرض یہ ایک سلسلہ بن جاتا ہے۔ کبھی کبھار میں بھی دھوئیں کا دائرہ بنانے میں کامیاب ہو جاتا ہوں لیکن میں ہر مرتبہ ایسا نہیں کر سکتا۔ کلیمنٹ ''O'' تو بنا لیتا ہے لیکن بتا نہیں سکتا کہ اس نے یہ فن کس طرح سیکھا۔ وہ کہتا ہے کہ غالباً یہ مہارت اس میں فطری طور پر پیدا ہوئی ہے۔ آپ غلط نہ سمجھیں، کلیمنٹ کے فن پر مجھے جلن یا حسد وغیرہ نہیں ہے کیونکہ میں نہیں سمجھتا کہ دھوئیں کے مرغولے بنانا تمبا کو نوشی کی عادت کا اہم ترین جز ہے بلکہ میں نے تو اسے کہا ہے کہ وہ ٹوائلٹ میں جائے اور دھوئیں کے دائرے میں سے پیشاب کی دھار گزارنے کی مشق کرے۔

نوجوانی کے دور میں میں نے کچھ عرصہ فرانس میں گزارا تھا تقریباً ایک سال۔ فرانس ان دنوں جنت نظیر تھا میں شدید غربت کا شکار تھا۔ میں سستے ترین سگریٹ خریدنے پر مجبور تھا۔ ان سگریٹوں کو پیریزئین (Parisiennes) کہا جاتا تھا۔ ان چار سگریٹوں کا ایک پیکٹ ہوتا تھا جو قصداً ڈھیلے ڈھالے پیک کیے جاتے تھے کہ پیکٹ میں ہلتے تھے تو ان کے اندر بھرا ہوا تمبا کو ڈبیا میں گرتا جاتا تھا اور آخر میں کھوکھلا سگریٹ رہ جاتا تھا۔ جب کسی کو یہ سگریٹ پیش کرنا ہوتا تو پیکٹ کو باقاعدہ لٹا کر ایک سگریٹ نکالنا پڑتا تھا۔ اصل بات یہ ہے کہ سگریٹ پیتے وقت بھی سگریٹ کو لٹائے رکھنا ہوتا تھا کیونکہ دوسری صورت میں تمبا کو یا تمبا کو کی چنگاریاں زمین پر یا لوگوں کے کپڑوں پر گرنے لگتیں۔ اس سگریٹ کے عادی لوگ اسے پی 4 کہتے تھے۔ میں تو طویل عرصہ فرانس میں رہا تھا کہ میں بھی اس سگریٹ کو پی 4 کہنے لگا تھا۔

آج کل ہم تینوں کے زیادہ تر پیسے سگریٹوں کی خریداری پر خرچ ہوتے ہیں۔ میری بیٹی جب مجھ سے ملنے آتی ہے تو میرے کمرے میں داخل نہیں ہوتی۔ وہ کہتی ہے کہ اس کے کپڑوں میں سگریٹوں کی بُو بس جاتی ہے اور کپڑوں کی تین چار بار کی دھلائی کے بعد بھی اس بُو سے چھٹکارا نہیں ملتا۔ میں اپنی مکان مالکن کو زیادہ پسند نہیں کرتا۔ اس وقت میں نے اپنی کرسی کو ترچھا کر کے دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھا تھا۔ ہم دونوں ایک دوسرے سے بات بھی نہیں کر رہے تھے۔ ہم گویا دوسرے الفاظ میں اپنے اپنے سگریٹوں سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ میں چاہتا تھا کہ اپنی بیٹی کو میں اپنی کمزوری کے بارے میں بتاؤں اور اسے قائل کروں لیکن میں یہ نہ کر سکا اس کا مجھے بے حد دکھ ہے۔

December calendar.

(This will be the only time you will see this phenomenon in your life)

M	T	W	T	F	S	S
					1	2
3	4	5	6	7	8	9
10	11	12	13	14	15	16
17	18	19	20	21	22	23
24	25	26	27	28	29	30
31						

The month of December this year will have 5 Saturdays, 5 Sundays, and 5 Mondays. It only happens once every 823 years. The Chinese call it "BAG FULL OF MONEY". Send this message to all your friends and within 4 days the money will surprise you.

Based on Chinese Feng Shui, the one who does not transmit this message can lose this great opportunity ... I do my part, you never know!

دھڑکن کی بے قاعدگی

ڈاکٹر فیروز عالم
(کیلیفورنیا)

جانے والے دل کو پتھر کر گئے
پھر کسی کے نام پر دھڑکا نہیں

اربوں سال قدیم کائنات نے جب ارتقائی سفر طے کیا اور اس سرزمین پر چھایا ہوا سکوت جب حیات کے وجود سے آشنا ہوا تو زندگی کی علامتوں میں سب سے زیادہ مانوس علامت ''دھڑکن'' کا وجود ٹھہرا۔ دھڑکتا ہوا دل ہی زندگی ہے اور یہی دھڑکن، حیات کے وجود کی ضامن۔

دوسری جانب دھڑکن کا تعلق انسان کی زندگی کے بدلتے ہوئے پہلوؤں سے بھی بہت گہرا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مختلف موقعوں اور مرحلوں پر اس کی رفتار، شدت اور تسلسل میں ڈرامائی تبدیلی ہم سب نے کبھی نہ کبھی ضرور محسوس کی ہوگی۔

دھڑکن کیا ہے؟

خون کو گردش میں رکھنے کے لیے دل ایک پمپ کی طرح کام کرتا ہے۔ خون کو ایک ہی جانب رواں رکھنے کے لیے دل کے خانوں کے درمیان ایک ہی جانب کھلنے والے دروازے ہوتے ہیں۔ دل کے پھیلنے اور سکڑنے کے وقت یہ دروازے بند ہوتے ہیں جس سے دھڑکن کی آواز پیدا ہوتی ہے۔ عام حالات میں اور صحت مندی کے دوران دل نہایت تسلسل اور ایک خاص لے یا تال کے ساتھ دھڑکتا ہے۔ یعنی ہر دھڑکن ایک خاص وقت پر وقوع پذیر ہوتی ہے اور انسان کو دل کے دھڑکنے کا احساس بھی نہیں ہوتا۔

دل کے سکڑنے کا سبب ایک برقی لہر ہے جو دل کے بالائی خانے سے شروع ہوتی ہے اور دل کے نشیبی خانے تک پہنچ کر اس کے سکڑنے کا سبب بنتی ہے۔ دل کے بالائی خانے میں ایک چھوٹا سا ''بجلی گھر'' ہوتا ہے جہاں ایک منٹ میں ستر بار ایک برقی شرارہ پیدا ہوتا ہے جو اس برقی لہر کا منبع ہے۔ یہ برقی لہر دل میں موجود کچھ خاص ریشوں کے (جو بالکل بجلی کے تاروں کی طرح کام کرتے ہیں) ذریعے دل کے نشیبی خانوں تک پہنچتی ہے۔ دھڑکن کو نارمل حالت میں رکھنے کے لیے اس ننھے سے بجلی گھر اور ان ریشوں کا صحت مند رہنا ضروری ہے جس کا انحصار بڑی حد تک ان کو ملنے والی آکسیجن یا خون کی باقاعدہ ترسیل پر ہے۔

دھڑکن کے مسائل

دل کی دھڑکن انتہائی صحت مند اور نارمل لوگوں میں بھی بے قاعدہ یا ناگوار ہوسکتی ہے۔ دراصل دھڑکن پر ہر قسم کی کیفیات اثر انداز ہوسکتی ہیں۔ جسم میں موجود ایک خاص کیمیائی مادہ جو خوف، غصے، شرم وحیا، تشویش اور فکر کے عالم میں خارج ہوتا ہے، دھڑکن کی رفتار کو متاثر کرتا ہے اور اس میں شدت اور تیزی میں اضافے کا باعث ہوتا ہے۔ یہی کیفیت ضرورت سے زیادہ کافی، چائے، تمباکو نوشی نیز کم خوابی اور اعصابی کشیدگی کی وجہ سے بھی ہوسکتی ہے۔ اگر دل صحت مند ہو تو کچھ ہی وقت کے بعد کیفیت نارمل ہوجاتی ہے لیکن جو لوگ عارضۂ قلب میں مبتلا ہوں ان کے لیے یہ پریشانی کا باعث ہوسکتی ہے۔ اس لیے دل کے مریضوں کو ان چیزوں سے احتیاط نیز ہیجانی کیفیات سے اجتناب برتنا چاہیے۔

دھڑکن کے غیر معمولی ہونے میں، دھڑکن کی بے قاعدگی، دھڑکن میں شدید تیز رفتاری اور ہر چار چھ دھڑکنوں کے بعد ایک دھڑکن کا ساقط ہوجانے کا احساس، شامل ہے۔ جو لوگ دھڑکن کے عارضے میں مبتلا ہوتے ہیں ان کے لیے یہ احساس بے حد دہشت ناک ہے مگر خوش قسمتی سے دھڑکن کے زیادہ تر مسائل بے ضرر ہوتے ہیں۔

دھڑکن کی تیز رفتاری

یہ تقریباً سب سے زیادہ عام مسئلہ ہے اور عام طور پر نوعمری میں لاحق ہوجاتا ہے۔ دل ایک منٹ میں ایک سو پچاس یا اس سے بھی زیادہ دفعہ دھڑکتا ہے۔ مریض کو سخت اختلاج کی کیفیت محسوس ہوتی ہے۔ موجودہ سائنس میں اس کی تشخیص اور علاج ممکن ہے۔ عام طور پر یہ پریشان کن تو ہے مگر خطرناک نہیں ہے۔ پختہ عمر میں اس کی وجہ بلڈ پریشر یا عارضہ قلب ہوسکتی ہے مگر اس عمر میں بھی یہ کوئی زیادہ خطرناک نہیں ہوتا۔

دھڑکن کی بے قاعدگی

دل کے سکڑنے کے تسلسل میں اگر بے قاعدگی ہو، یعنی کچھ دھڑکنیں وقت سے پہلے یا بعد میں وقوع پذیر ہوں تو مریض کو دھڑکن میں بے قاعدگی کا احساس ہوتا ہے جو ایک بے حد ناگوار احساس ہے۔ عام طور پر جوان اور صحت مند لوگوں میں بھی یہ کیفیت ہوسکتی ہے۔ تاہم یہ کیفیت اگر پچاس سال کے بعد شروع ہو اور کسی قسم کی ورزش سے بے قاعدگی بڑھ جائے تو کسی ماہر طبیب سے مشورہ کرنا چاہیے۔

دھڑکنوں کے ساقط ہونے کا احساس

ہر شخص کو کبھی نہ کبھی اس کیفیت کا تجربہ ضرور ہوا ہوگا اس لیے ایک آدھ دھڑکن کا ساقط ہوجانا کوئی اہم بات نہیں ہے۔ مگر جن لوگوں کو بلڈ پریشر ہو یا جن کے دل کی شریانیں تنگ ہوگئی ہوں ان کو اس کیفیت کا فوراً نوٹس لینا چاہیے اور اپنا مکمل معائنہ کروانا چاہیے۔

مسئلے کی تشخیص

موجودہ دور میں سائنس کی ترقی عقل کے لیے حیران کن ہے۔ جدید سائنس کے ذریعے اب دل میں پیدا ہونے والی برقی لہروں کی پیمائش اور ان لہروں کی ترسیل کے ذمہ دار ریشوں کی نقشہ بندی بھی ممکن ہوگئی ہے۔ اب ایک عام الیکٹروکارڈیوگرام سے لے کر دل کی اندرونی برقی پیمائش ایک عام چیز ہے۔

ان سہولتوں کی وجہ سے ان مسائل پر قابو پانا بڑی حد تک ممکن ہو گیا ہے۔

اگر دل کے ''بجلی گھر'' میں کوئی خرابی ہو تو ایک مصنوعی بیٹری لگا کر بجلی کے شرارے پیدا کیے جا سکتے ہیں جس کو ''پیس میکر'' کہا جاتا ہے۔ اگر دل کے ریشوں میں برقی رو کی ترسیل بہت تیز ہو تو اس کے لیے ایسی دوائیں موجود ہیں جو ان کو سست اور آہستہ رو بنا سکتی ہیں یا بعض حالتوں میں سرجری کے ذریعے انہیں کاٹا بھی جا سکتا ہے۔

زیادہ تر دھڑکن کی بے قاعدگیوں کا علاج دواؤں سے ہو جاتا ہے۔ دل کی دھڑکن میں بے قاعدگی کے لیے اب ہر قسم کی خرابی کی دوا ایجاد ہو چکی ہے۔

گزشتہ کچھ سالوں میں دل کی صوتی عکس بندی کے عام ہونے سے یہ معلوم ہوا کہ دنیا میں لاکھوں لوگ ایسے ہیں جن کے دل کا دروازہ یعنی (MITRAL VALVE) ناقص ہے۔ یہ ایک پیدائشی نقص ہے اور عام طور پر لوگ اس سے ناواقف ہی رہتے ہیں کیونکہ اس قسم کے لوگ بالکل نارمل زندگی گزارتے ہیں نیز ان کی طویل عمر پر اسکا کوئی اثر نہیں پڑتا۔ صرف چند لوگ ایسے ہیں جن کو اس کی وجہ سے دھڑکن میں بے قاعدگی کا احساس ہوتا ہے جو اگرچہ بے ضرر ہے لیکن ناگوار ہے۔ ایسے لوگوں کو دواؤں کی ضرورت ہوتی ہے جو جلد ہی اس مسئلے کو قابو میں لے آتی ہے۔

غرض دھڑکن کی بے قاعدگی ایک دلچسپ موضوع ہے مگر جو اس میں مبتلا ہیں ان کے لیے نہایت ناگوار اور دہشت ناک تجربہ ہے۔ ضروری ہے کہ اس سلسلے میں طبیب سے مشورہ کر لیا جائے جو ان کے لیے صحت اور اطمینان کا پیغام ہو سکتا ہے۔

- بقیہ -

''صندل کی خوشبو''

مشعل راہ سمجھ کر پڑھتے رہیں گے اور اس سے رہنمائی حاصل کریں گے۔ دنیا میں جہاں جہاں غلامی کی زنجیریں انسانیت کو جکڑ رہی ہیں وہاں سے ایسی تحریکیں جنم لیتی ہیں استعماری اور طاغوتی طاقتیں انسانیت کو لاشوں میں تبدیل کرتی ہیں مجھے روہنگیا میں بے گناہ مسلمانوں پر ڈھائی جانے والی اذیتیں چین نہیں لینے دیتی۔ جہاں بھاری بوٹوں والے لمبے چوڑے خونی درندے معصوم بچوں کے زندہ جسموں کو روندتے ہوئے اس طرح گزر جاتے تھے کہ خونیں سیلاب میں تڑپتی چیختی معصوم بچوں کی آوازیں ان کے اوپر سے گزر جاتی تھیں۔ میں اس عورت کو کبھی معاف نہیں کروں گی جو ستر برس کی عمر میں انسانیت کا قتل عام کر کے امن کا نوبل انعام حاصل کرتی ہے۔ ایک بت پرست کو کلمہ گو حکمران اپنے ملک کا اعلیٰ نشان دیتا ہے مجھے میرا گائیڈ کہتا ہے واپس آ جاؤ اپنی دنیا میں۔ حق و باطل کا معرکہ ہونے والا ہے اپنے کام پر توجہ کرو۔ تم جانتی ہو وہ زندہ لاش تھی تم نے اسے جینے کا حوصلہ دیا آج وہ تمہاری کیمپ انچارج ہے اور ہاں تم نے ابھی تو خوشبوؤں میں بسی وادیوں میں ایک لمبا سفر کرنا ہے خوشبو کا سفر سنگلاخ چٹانوں اور بہتے پانیوں کے ساتھ اور میں اپنا بیگ سنبھالے اونچی چوٹیوں پر چڑھنے لگی دوسری طرف میرے سامنے میرا ہدف تھا اور میرے ہونٹوں پر وہ دھن مچلنے لگی جو طاؤس بانہالی کے طنبورے پھوٹتی تھی۔ محبت اور امید کی خوشبو میرے قدموں میں اور تیزی آ گئی!!!

- بقیہ -

''اردو شاعری کی بند گلی''

افہمیات، سماوات، عالمِ ملکوت سے متعلق ہونا چاہیے لیکن حقیقت میں ایسا نہیں ہے۔ نظم کا آغاز جن لائنوں سے ہوتا ہے وہ جہنم کی جدیت اشارہ کرتی دکھائی دیتی ہیں۔ آپ سوچیے جس طرح میں سوچ رہا ہوں۔ آیا خوشہ چینی اور استفادے کے اس اعتراف کے بعد اور نظم کے اس خلاف توقع آغاز اور غیر متوقع انجام کی جانب سفر کو دیکھ کر اردو کے کسی بھی مجلّے میں اس کا شائع ہونا ممکن ہو گا؟ مجھے تو یہ ممکن نظر نہیں آتا، آپ کو۔۔۔؟

ادبی جرائد میں شاعری کی اشاعت کے معاملے کو میں نے ایک بند گلی میں محصور دیکھا ہے۔ اس ضمن میں ایک اور پہلو سے بھی غور کیا جانا چاہیے۔ ایک جانب اردو شاعری کی ایک زندہ صنف ''غزل'' کے خلاف ہرزہ سرائی کرنے والے ''کلیشے'' کا رونا روتے ہیں تو دوسری جانب ادبی مجلوں میں اشاعت کے لیے کسی ''نئی'' لگنے والے غزل یا نظم پر قدغن لگاتے ہیں۔ اردو کے نقادوں کو بھی وہی چاہیے جس سے وہ آشنا ہیں۔ ایسی صورت حالات میں اردو شاعری کو بند گلی سے کبھی رہائی نصیب ہو گی؟ درست رویہ جو سامنے موجود ہے وہ دکھائی نہیں دیتا اور وہ صرف یہہ رویہ ہے کہ کسی ''مشکوک'' یا ''مشکوک'' نظر آنے والی تخلیق کو شائع ہونے دیا جائے۔ جس قاری یا نقاد کو اس پر اعتراض ہو وہ کھل کر اس پر اعتراض شائع کروائے اور جس قاری یا نقاد کو وہ درست لگے وہ اعتراضات کو رد کرے تا کہ اردو شاعری آزادی کے ساتھ اپنے اگلے سفر پر روانہ ہو سکے۔

☆

اردو شاعری کی بندگلی

عبداللہ جاوید
(کینیڈا)

اردو شاعری کا جب ہم مغربی شاعری ، امریکی شاعری یا ہندوستان کی بعض مقامی زبانوں کی شاعری سے تقابلی مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں واضح طور پر یہ احساس ہوتا ہے کہ اردو شاعری یا تو ایک مقام پر کھڑی ہے یا اگر چل رہی ہے تو اس کی رفتار اس گھونگے (Snail) کی مانند ہے جو اپنے گھر کو اپنی پشت پر اٹھائے رینگتا ہے یہ تو ہم سب جانتے ہیں کہ اب تک اردو شاعری میں تین بڑے شاعر ہو گزرے ہیں۔ ان کے نام بھی آپ کی زبان پر ہوں گے۔ میرؔ، غالبؔ اور اقبالؔ۔ اب اگر میں یہ کہوں کہ غالبؔ کی شاعری کا چھوٹا سا لیکن خاصا کنجلک اور بھرپور دائرہ بھی، میرؔ کی شاعری کے بڑے دائرے میں سما جاتا ہے تو اس صورت میں دو ہی شاعر رہ جاتے ہیں میرؔ اور اقبالؔ۔ میرؔ اور اقبالؔ کے بعد ہمیں کوئی قابلِ ذکر شاعر نظر نہیں آتا البتہ چند آوازیں ملتی ہیں جو میرؔ اور اقبال سے قدرے مختلف ہیں لیکن یہ آوازیں دبی دبی سی ہیں۔ جہاں تک تحریکات کا تعلق ہے ان کی اہمیت اپنی جگہ ہے لیکن سرسید کی تحریک نے اردو شاعری کو آزادؔ اور حالیؔ دیئے جن کے بطن سے اقبالؔ پیدا ہوئے۔ ترقی پسند ادب کی تحریک نے فیض کو کھڑا کیا لیکن ان میں اتنا دم خم نہیں تھا کہ اقبالؔ کے آگے شاعر کے طور پر آتے، اپنی انفرادیت کے ساتھ۔ تھوڑی بہت مقبولیت ان کے حصے میں ضرور آئی وہ تو قدرت کی دین ہے۔ ان کے انقلاب کے نظریے میں رومان کا رنگ تھا اور ان کے لہجے میں میرؔ و سوداؔ کے لہجوں کا جادوئی امتزاج تھا جو کام دکھا گیا۔ ن۔م۔ راشدؔ نے نظم کی شاعری کی جو اردو شاعری میں صحیح معنوں میں موجود نہیں تھی۔ لیکن وہ بھی محض آواز ہی ہو رہے۔ آج کی اردو شاعری فیضؔ اور راشدؔ یا میرؔ اجی یا مجید امجدؔ کی آوازوں سے آواز ملا رہی ہے۔

جب ہم یہ کہتے ہیں کہ اردو شاعری بندشوں میں جکڑی ہوئی اور اس کے مقابلے میں امریکی شاعری، مغرب کی شاعری حتیٰ کہ ہندوستان کی چند دیگر مقامی زبانون کی شاعری زیادہ آزاد ہے تو ہماری یہ مراد نہیں ہوتی کہ ان پر معیار اور قدر کی ضرور پابندیاں عائد نہیں ہیں۔ ایسا نہیں ہے اور اس طرح کی توقع کی بھی نہیں جا سکتی۔ اس سے قبل ہم ایک شعری انتخاب پر بات کر رہے تھے۔ اُس وقت ہمارے پیشِ نظر امریکہ کے ملک الشعراء بلی کولنس کا ایک انتخاب تھا۔ وہ انتخاب ہائی اسکول کے طلبہ کے لیے کیا گیا تھا اگرچہ کولنس نے یہ بھی لکھ دیا تھا کہ اس میں شامل نظمیں ان کے لیے بھی ہیں جنہوں نے ہائی اسکول نہیں پڑھا ہو۔ ۲۰۰۶ء میں بلی کولنس کا ایسا انتخاب شائع ہوا جو اس سال کی بہترین امریکی شاعری کا نمائندہ تھا۔

اس انتخاب کے پیش لفظ میں بلی کولنس اپنے ایک دوست کی اس رائے سے اتفاق کرتا نظر آتا ہے کہ عصری شاعری (امریکی) کا تراسی فیصد پڑھنے کے لائق نہیں ہوتا لیکن فوراً ہی وہ اعتراف کرتا ہے کہ باقی کی سترہ فیصد شاعری ایسی ہے جس کے بغیر ہم مفلس رہ جائیں۔ ۲۰۰۶ء کے انتخاب کے ضمن میں وہ بتاتا ہے کہ اس نے ایک ہزار سات سو چون ادبی مجلوں سے نظمیں لیں اور ان کے علاوہ ریڈیو سے بھی نظمیں حاصل کیں۔ اس پہلے مرحلے میں انتخاب نہیں کیا۔ جو کچھ چھپا اور جو کچھ نشر ہوا وہ سارا کا سارا جمع کیا۔ (اردو شاعری میں۔ پہلے مرحلے کا یہ کام اس طرح نہیں کیا جا سکتا۔ یہ نمایاں فرق ہے) پہلے دیانت داری اور محنت سے اس سال کی نظموں کا ایک انبار لگا کر اس میں سے پچھتر (75) سوئیاں الگ کیں اور انتخاب میں درج کیں۔ اس صورت حال میں اس شاعری کو ہم کس طرح زندہ، متحرک اور فعال کہہ سکتے ہیں؟ اردو شاعری کی اس سُست روی اور انجماد کی ذمہ داری کم از کم میں اردو شاعروں پر لادنا نہیں چاہتا۔ ادب شعر اور فن سماج کی مٹی میں اُگتے اور پروان چڑھتے ہیں۔ ہر ادیب، شاعر اور فنکار سے ہم یہ توقع نہیں رکھ سکتے کہ وہ سماج اور سماجی قدروں سے ٹکّر لے اور ان کا رخ موڑ دے۔ ایسی توقع بیجا ہوگی۔ اردو شاعری جس سماج کی پیداوار ہے وہ ایک جانب قبائلی اقدار میں جکڑا ہوا ہے تو دوسری جانب وڈیروں، جاگیرداروں، خانوں، راجاؤں، رئیسوں اور مقتدر اعلیٰ طبقے (جس میں حکمران شامل ہیں) کے استحصالی ہتھکنڈوں کے حصار میں ہے۔ یہی سبب ہے کہ اردو شاعری میں کچھ نیا سوچنے اور نیا تخلیق کرنے کی گنجائش نہیں ملتی۔ عوام کے استحصال پر قائم و دائم اس سماج میں صرف وہی قابل قبول ہے جو آزمودہ ہے، فرسودہ ہے، لگا بندھا ہے، لکیر کا فقیر ہے۔ یہ سماج نئی سوچوں اور نئی حسیات سے خائف ہے۔

اردو شاعری کے مقابلے میں مغربی ممالک کی شاعری، امریکی شاعری اور ہندوستان کی بعض مقامی زبانوں کی شاعری کو وہ آزادی میسّر ہے جو شعر، ادب اور فن کی ثقافتی اقدار کی پرورش میں مددگار ثابت ہوتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ سامنے آیا کہ شعر، ادب اور فن کے تخلیقی سوتے کھلے رہے۔ شعر، ادب اور فن کے اشاعتی اور تشہیری وسائل نے بھی تخلیقی پیداوار پر کم سے کم قدغن لگائے۔ چھوٹے ذہنوں نے بڑے ذہنوں کی تخلیقی اڑانوں کے لیے برداشت پیدا کی۔ اظہار رائے کی آزادی نے اختلاف رائے کو احترام بخشا اور اس احترام نے منافقت کے لیے جواز باقی نہیں رکھا۔ سچ سامنے آنے لگا۔ تخلیق کار نے تخلیق کے ساتھ انصاف کیا۔ تخلیق کار کو یہ سوچنا نہیں پڑا کہ اس کی تخلیق اس کی سوچ اور اس کی حسیّت کو قبول کیا جائے گا یا رد کیونکہ وہ دونوں صورتوں کے لیے تیار رہتا ہے۔ تخلیقی قوتوں کو کام کرنے کے لیے سازگار ماحول کا ملنا بڑی بات ہے اور سب سے بڑی بات تخلیق کار کے ذہن میں تخلیق کے علاوہ کسی اور خیال کا نہ ہونا۔

امریکی شاعری کے کسی انتخاب پر ایک نظر ڈالنے سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ تخلیقی شاعری کے انتخاب میں تخلیقی توانائی اور ہمہ جہتیت کو پیش نظر ہی نہیں رکھا گیا ہے بلکہ ان کو اوّلیت بھی دی گئی ہے۔ اس ضمن میں آپ ہر سال ہونے والے مختلف انتخابات میں کسی بھی انتخاب کا مطالعہ کر سکتے ہیں۔ کسی خاص انتخاب کی تخصیص نہیں مثال کے طور پر اس وقت میرے سامنے امریکی معاصر شاعری کا ایک انتخاب یوئٹری 180 (ذیلی سرخی ''شاعری کی جانب واپسی'') ہے۔ امریکہ کے ملک الشعراء (Poet Laureate) بلی کولنس (Billy Collins) نے ان نظموں کا انتخاب ہائی اسکول کے طلبہ کے لیے کیا ہے ہر روز ایک نظم کے حساب سے ایک سو اسّی نظمیں کتاب میں درج اور ویب سائٹ پر پڑھی گئی ہیں۔ بلی کولنس کا خیال ہے اُن کی آرزو یہ ہے کہ اس طرح وہ نئی نسل کو شاعری کی جانب رجوع کرانے میں کامیاب ہوں گے۔ اگرچہ نظموں کا یہ انتخاب اعلیٰ شاعری کے معیار پر نہیں ہے کیونکہ ہائی سکول کے لیول کے مطابق ہے لیکن ان نظموں کے موضوعات اور اسالیب میں اس قدر تنوع اور رنگا رنگی ملتی ہے کہ پڑھنے والا حیران رہ جاتا ہے۔ اس میں شامل ایک سو اسّی نظموں میں ہر نظم دوسری نظموں سے مختلف ہے۔ یکسانیت کا نام نہیں۔ ایسا کیوں کر ممکن ہوا؟ جب میں یہ سوچتا ہوں تو اس سوال کا ایک ہی جواب ملتا ہے اور وہ جواب یہی ہے کہ انتخاب کرنے والے نے کھلے ذہن کے ساتھ انتخاب کیا اور تخلیقی ذہن کی مختلف الجہتی کو وقعت دی۔ اس انتخاب میں بلی کولنس نے ہائی سکول کو ذہن میں رکھا ہے اور اس کے خیال میں ہائی سکول ہی وہ مقام ہے جہاں شاعری کی موت واقع ہوتی ہے۔ ہائی سکول کی عمر، کچی عمر، نوجوانی کی عمر (adokscence) جلد بازی کی عمر ہوتی ہے جس میں تیز روی ہی سب کچھ محسوس ہوتی ہے۔ نبض کی ایک ضرب کے دوران صفر سے ساٹھ تک پہنچنا ہوتا ہے۔ دوسری جانب شاعری دھیرج اور نرم روی کی طالب ہے۔ چنانچہ ہائی سکول کا طالب علم شاعری کو ''بور'' گردانتا ہے۔ ہائی سکول میں شاعری کا کچھ اس طرح مذاق اڑایا جاتا ہے:

میں انگریزی سمجھتا ہوں
یہ نظم انگریزی زبان میں ہے
مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ
نظم کیا کہہ رہی ہے۔

جہاں تک نظم کے کچھ کہنے کا تعلق ہے بلی کولنس انتخاب کے پیش لفظ میں ایک مقام پر یہ بھی کہہ چکا ہے ''یہ جو کلاس روم میں اس پر زور دیا جاتا ہے کہ کسی نظم کا مطلب کیا ہے شاعری کی روح کو قتل کرنے میں کامیاب ثابت ہوتا ہے۔'' آگے جا کر وہ یہ بھی تسلیم کرتا ہے کہ مطلب یا مفہوم سمجھنا بھی باعثِ لطف ہے لیکن ساتھ ہی وہ واضح کر دینا چاہتا ہے کہ اس کے چکر میں شاعری کے بے شمار دیگر مزوں سے بے بہرہ ہونے کے خدشات بڑھ جاتے ہیں۔ ان دیگر مزوں میں چند کا تعلق بحر، آہنگ، استعارے اور تخیل کی اڑان سے ہے۔ بلی کولنس نے یہ بھی واضح کر دیا ہے کہ اس کا مقصد ہائی اسکول کے طلبہ کو عصری شاعری کی نئی آوازوں سے روشناس کرانا ہے۔ اس نے اس حقیقت کی جانب توجہ دلائی ہے کہ اکثر شعری انتخابوں میں مرحوم اور زندہ شاعروں کا تناسب 1:9 ہوتا ہے۔ اس نے یہ اعتراف کیا ہے کہ نظموں کے انتخاب میں اس نے ہائی سکول کے طلبہ کے پسند کے موضوعات کو بھی نظر میں رکھا ہے۔ مارک ہیلی ڈے اور جم ڈائینل کی نظموں کا موضوع ''کاروں'' سے متعلق ہے۔ یک فلین کی نظم کارٹونوں سے تعلق رکھتی ہے۔ ایڈورڈ ہرش باسکٹ بال اور لوئی جنکن کی نظم فٹ بال پر ہے۔ ماؤں اور بیٹوں، باپوں اور بیٹیوں پر نظمیں شامل ہیں۔ اس کا یہ بھی کہنا ہے کہ یہ انتخاب ہائی سکول کے طلبہ کے علاوہ دیگر پڑھنے والوں کے لیے بھی ہے۔ ان کے لیے بھی جنہوں نے ہائی سکول میں نہیں پڑھا۔ مثال کے طور پر اس انتخاب میں نومی شہاب نائی کی نظم ''محمد زید عمر 15'' شامل ہے جو پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ بلی کولنس نے اپنے پیش لفظ میں اس کا ذکر نہیں کیا ہے۔ رچرڈ جونس کی مختصر نظم بھی میں نے اس انتخاب میں دیکھی ہے جس کا عنوان ہے ''سپید تولئے'' اس میں تنہائی اور اکیلے پن کے فرق کو اجاگر کیا گیا ہے۔ اس نظم میں تولیے اولاد کا استعارہ بن جاتے ہیں۔ ٹڈ کوسر کی نظم ''قاری کا انتخاب'' تنگ دستی کے موضوع پر ایک خوبصورت مگر دلخراش نظم ہے۔

ایک مرتبہ پھر میں اپنے پڑھنے والوں کو اس مسئلے کی جانب رجوع کرنا چاہتا ہوں کہ اردو شاعری کی تخلیقی قوتوں کو ایک تنگ گلی میں مسدود کر دیا گیا ہے جبکہ امریکی شاعری کو فنی اور تخیلی پرواز کے لیے فضائے بسیط میسر ہے۔

یہ نہ سوچیے کہ بلی کولنس نے (نظمیں) الگ کیں اور اپنے انتخاب میں درج کیں۔ اس کام کو انجام دینے کے طریقہ کار کو بھی وہ دیانت داری سے بیان کرتا ہے۔ ''اس بڑے انبار سے ان نظموں کو ایک علیحدہ ڈھیری میں ڈالتا گیا جن کو میں شروع سے آخر تک نہ پڑھ سکا۔ اس طرح ایک بڑی اور ایک خاصی چھوٹی ڈھیری نظموں کی حاصل ہوئیں۔ چھوٹی ڈھیری میں وہ نظمیں تھیں جنہوں نے اپنے آپ کو پورا پڑھایا تھا یا یوں کہیے پڑھنے پر مجبور کیا تھا۔ اس دوسری یعنی چھوٹی ڈھیری سے صرف ان نظموں کو لیا گیا جو دوسری مرتبہ پڑھنے کے لائق لگیں۔ خاص طور پر وہ جو ایک بار پھر پہلی لائن سے اپنے آپ کو پڑھوا رہی تھیں۔'' ذاتی پسند اور ذاتی ناپسند کے مسئلے پر زیادہ بحث سے قطع نظر کرتے ہوئے وہ اپنی نیت کو واضح کر دیتا ہے جب وہ یہ کہتا ہے:

''مجھے ہمیشہ یہ توقع رہی کہ میں کافی تعداد میں بہت اچھی نظمیں ڈھونڈھ نکالوں گا ایک ایسی اشاعت کے لیے جو آج کے امریکہ میں لکھی جانے والی شاعری کی توانائی Strength اور تخیلی تنوع Imaginative diversity کو دکھا سکے۔''

پاکستان میں اور خاص طور پر اردو شاعری (آج کی) پر بات کرتے ہوئے کوئی مائی کا لعل ثانی الذکر کو عزت دے گا۔

آپ نے دیکھا بلی کولنس نے مجموعی اعتبار سے شاعری میں قوت، طاقت اور توانائی کے علاوہ تخیل اور تخیل کی صدرنگی کو زیادہ اہمیت دی ہے۔ان کے بعد وہ فارم Form کو بے حد ضروری خیال کرتا ہے لیکن فارم سے وہ کیا مراد لیتا ہے اس کا سمجھنا دشوار ہے۔جو کچھ میری سمجھ میں آیا ہے وہ فارم نہیں بلکہ فارم کا احساس ہے۔اگر شاعر اپنی نظم میں پڑھنے والے کو ایسا احساس دلانے میں کامیاب ہو جاتا ہے کہ نظم اسے لے کر چل رہی ہے اور کہیں نہ کہیں پہنچانے والی ہے تو گویا وہ اپنی نظم کو ایک فارم دے رہا ہے۔قافیے اور بحور کی پابندی کو والٹ وٹ مین کی بغاوت یا جدت پسندی نے بڑی حد تک نکال باہر کیا تو اس کی جگہ موتی فضا اور آہنگ نے لے لی۔ایک اچھی نظم ایک مخصوص آہنگ کے توازن کو برقرار رکھتی ہے اصلی Authentic لفظ اور نقلی False لفظ اپنی آواز ہی سے پہچانا جاتا ہے۔پڑھنے والے کے کان اس کو سُن لیتے ہیں۔

اس انتخاب میں شامل نظموں کے بارے میں ان شاعروں کی اپنی وضاحتیں بھی علیحدہ درج کی گئی ہیں۔ان کے بارے میں بلی کولنس لکھتا ہے:

''شاعر اپنی نظموں پر جو تبصرہ کرتے ہیں وہ لائق اعتماد نہیں ہوتا۔''

لیکن میں نے ان تبصروں کو اکثر اوقات دلچسپ، پرلطف اور مفید پایا ہے۔

مثال کے طور پر نیویارک میں 1939ء میں پیدا ہونے والا، کنک ٹی کٹ کی ایک جھیل (تھرش ووڈ) کے قریب ایک جھونپڑی نما کاٹیج میں قریباً بارہ ہزار کتابوں، گوتم بدھ کے بے شمار مجسموں اور اپنی شاعر بیوی ایلؔ این ایلن کی رفاقت میں زندگی بسر کرنے والا نیم بدھی اور نیم عیسائی شاعر ڈک ایلن Dick Allen اپنی نظم ''اہرام کو نیل کے کنارے دیکھو'' پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتا ہے:

''بیشتر دوسرے لوگوں کی طرح میں بھی اکثر نظموں اور گیتوں کے فقرے اپنے سر میں لے کر بیدار ہوتا ہوں۔موت حُسن کی ماں ہے۔ Death is the mother of beauty زمین محبت کرنے کی لیے صحیح جگہ ہے۔Earth's the right place for love۔اسی طرح ایک صبح گیت ''تم میرے ہو'' You belong to me کا ایک مصرع See the pyramids along the Nile لے کر اٹھا سارا دن یہ فقرہ میرے سر میں آتا جاتا رہا۔آخر میں یہ سمجھنے پر مجبور ہو گیا کہ مجھ سے یہ کہا جا رہا تھا کہ میری سیاحت جلد ختم ہونے جا رہی ہے۔میں اب کبھی شخصی طور پر دریائے نیل کے ساتھ اہرام نہ دیکھ پاؤں گا۔جیسے ہی نظم آغاز ہوتی ہے میں دروازوں کے بند ہونے کے تلخ و شیریں Bittersweet احساس کو گرفت میں لانے میں مصروف ہوتا ہوں اور ابتدائے عمر کے ان برسوں کو جب زندگی بس سبزہ زار اور نیلے آسمانوں پر مشتمل لگتی تھی یاد کرنے میں (بغیر جذباتی ہوئے کیونکہ ایسی نظموں سے جذباتیت کو نکال باہر کرنا ہوتا ہے) نظم کے اختتام پر بولنے والا Speaker اس حقیقت کا اعتراف کرتا ہے جس کو ہم اکثر یاد رکھتے ہیں اور بھولتے ہیں کہ زندگی ہمیں کروڑوں اتفاقات، مواقع اور انتخابات کے مقابل کرتی ہے جن میں سے اگر ہم کسی اور کو اختیار کرتے تو ہم کسی اور سے شادی کرتے، کسی اور جگہ رہتے اور کوئی اور بن جاتے۔۔۔'' آپ نے ملاحظہ فرمایا ڈک ایلؔن نے نظم کے شانِ نزول، آغاز اور انجام کے بارے میں کیا کہا۔مجھے یقین ہے آپ کو اس کی باتیں دلچسپ اور حقیقت پر مبنی لگی ہوں گی۔

اس مرحلے پر میں آپ کی توجہ اردو شاعری کو درپیش مشکلات کی جانب مبذول کراؤں گا۔مجھے ننانوے فیصد یقین ہے کہ اگر کوئی اردو شاعر اس نظم کو اشاعت کے لیے بھیجتا تو وہ ردی کی ٹوکری میں ڈال دی جاتی۔مغربی تنقید آج سے بہت پہلے اس پر متفق ہو چکی ہے کہ ہر بڑی شاعری سابقہ بڑی شاعری کو ریفر بیک Refer Back یا اس کی بازیافت کرتی ہے (خواہ شاعر اپنی ہی کسی سابقہ نظم کے ساتھ ہی ایسا کرے) اردو تنقید اپنی تذکروں والی روش ترک کرنے پر ہنوز راضی معلوم نہیں ہوتی۔ایسے بیشتر معاملات میں آنکھ بند کر کے سرقے کا گمان کر لیا جاتا ہے اور تو اور غالبؔ پر تو مستقل سرقے کے الزامات لگتے ہی رہتے ہیں اگر کوئی شاعر بیان حلفی سے یہ ثابت کرتا ہے کہ اس نے ارادی طور پر ایسا نہیں کیا تو اس کو ''توارد'' کی دفعہ کے تحت باعزت بری کر دیا جاتا ہے۔اگر شاعر خود اقرار کرتا ہے تو اسے یہ ثابت کرنے پر مامور یا مجبور کیا جاتا ہے کہ اس نے سابقہ مضمون یا پیرائے کو ترقی دی ہے۔یہاں مجھ سے کم فہم یا کج فہم یہ سوچتے ہی رہ جاتے ہیں کہ سرقہ، توارد یا ترقی کے معاملات کا مقدمہ لے کر کس عدالت کا دروازہ کھٹ کھٹایا جائے؟ کسے وکیل کریں، کس سے منصفی چاہیں؟

ایک مرتبہ پھر ڈک ایلؔن کی نظم پر لوٹتے ہوئے یہ بتانا چاہتا ہوں کہ اس کی مذکورہ نظم جملہ بیس مصرعوں (لائنوں) پر مشتمل ہے۔ان بیس لائنوں میں ایلؔن گزرے برسوں کا ذکر کرتا ہے جو غائب ہو چکے، اپنی سیاحتوں اور مہمات کی جانب حوالے دیتا ہے۔جھیل کے کنارے اپنی کاٹیج کی زندگی، بوسیدہ کتابوں کی بات کرتے ہوئے اس سکوت کو توڑتے ہوئے شور پر خفیف برہمی ظاہر کرتا ہے جو پڑوسی کا آرا پیدا کر رہا ہے کسی غیر ضروری چیز بنانے میں۔وہ سیاحتوں اور مہموں کی تحسین کرتا ہے جو مجسموں اور مووِیز میں ڈھل جاتی ہیں۔نظم اچھی شاعری پر مشتمل ہے اور شاید سچی بھی لیکن پھر وہی بات اگر وہ اردو نظم ہوتی تو شائع ہونے سے رہ جاتی۔

امریکی شاعری کے ایک حالیہ انتخاب میں جگہ پانے والی پہلی نظم Divine کی خالق کم اڈوینزیو (Kim Addonizio) اپنی نظم کے بارے میں واضح الفاظ میں یہ کہتی ہے کہ اس نے اس نظم میں دانتے Dante افلاطون Plato، بائبل Bible، الف لیلیٰ Fairytales، پرانی وامپائر مووِیز Old Vampire Movies اور آسٹریلیا کے نباتاتی باغ کی چمگادڑوں سے استفادہ اور خوشہ چینی کی ہے (جدید شاعری میں یہ رویہ جائز ہے) نظم کا عنوان ''ڈِوین'' پڑھنے والوں کو یہ اشارہ دیتا ہے کہ نظم کا موضوع

باقی صفحہ ۹۷ پر ملاحظہ کیجیے

''روشن صدی کی بات''

غلام قادر آزاد
(برطانیہ)

زندگی کی رہ سفر میں کسی اجنبی سے اچانک ملاقات یا کسی نئی کتاب کے ملنے میں انسانی تجسس کو اکسانے والے غیر متوقع عناصر ضرور موجود ہوتے ہیں۔ اور یہی دونوں میں آدمی کی کشش کا موجب بنتے ہیں۔ گذشتہ دنوں ایک ایسی کتاب ملی جو ہماری حد تک نئی کتاب تو تھی مگر وہ ایک اجنبی سے ملاقات کے برابر بھی تھی۔ اس سے ہماری مراد انگلستان میں اردو کے جواں سال (نسبتاً) ادیب ومصنف یعقوب نظامی صاحب کی کتاب ''روشن صدی کی بات'' سے ہے جو اُن کی دسویں (۱۰ویں) تصنیف ہے اس کا جلی عنوان تو روشن صدی کی طرف اشارہ کناں ہے مگر اس کا ذیلی عنوان جو جلی عنوان کے اوپر ذرا دبے ہوئے انداز میں درج ہے وہ بتا رہا ہے کی یہ ایک سوانحی کتاب ہے یعنی محمد ایوب صابر صاحب ایڈووکیٹ کی سرگذشت جو ہمارے دوست نظامی صاحب کے برادر اکبر ہیں۔ دبے ہوئے انداز عنوان سے اُن کا انکسار ظاہر ہے۔ بہرحال ہمارے لئے یہ کتاب ایک اجنبی نہیں بلکہ مانوس اجنبی سے ملاقات کا درجہ رکھتی ہے کہ..... غالب ندیم دوست سے آتی ہے بوئے دوست!

کتاب کا سرنامہ صاحب سوانح کی تصویر سے مزین ہے جس پر بلاشبہ منہ بولتی تصویر کی بات صادق آتی ہے۔ ماشاءاللہ۔ حضرت علامہ نے تو اہل کشمیر کو ''قوم چرب دست وتر دماغ'' ہی فرمایا تھا مگر عمومی اور عوامی زبان انھیں ظاہری حسن ووجاہت سے متصف جانتی ہے۔ خیر کتاب کے مصنف چرب دست ہوں یا نہ ہوں مگر وہ بھی یکے از تر دماغان کشمیریان ہیں اس لئے ہم نے جو کتاب کی اولیں ورق گردانی شروع کی تو نظر کے سامنے جو پہلا صفحہ تھا وہ مشتمل تھا ہمارے ایک اور دوست اور دانشورا ے۔ حفیظ کے خط برادر یہ جس باب میں شامل تھا اُس کا عنوان تھا ''کہتی ہے خلق خدا غائبانہ کیا؟ عنوان اور پھر نقارہ خدا ہم نے پورا باب پڑھ ڈالا۔

یہ ہمارے لئے یک عجیب اتفاق کی بات ہے کہ جن دنوں زیر نظر کتاب ہمیں ملی انھیں دنوں ہمارے زیر نظر ایک اور سوانحی مضامین پر مشتمل کتاب تھی (دیکھئے حاشیہ) جس سے ہمیں معلوم ہوا (حضرت امام شافعی کے احوال سے) کہ وہ عصا لے کر چلتے تھے جبکہ ہمارے دوست اے حفیظ بھی عصا لے کر چلتے ہیں (بوجوہ) کہتے ہیں کہ حضرت امام شافعی سے پوچھا گیا کہ آپ ابھی مضبوط ہیں پھر عصا لے کر کیوں چلتے ہیں۔ فرمایا اس لئے کہ یاد رہے کہ میں مسافر ہوں! اے حفیظ کو بھی پہلی نظر میں عصا لے کر چلتے دیکھنے والے یقیناً ٹھٹھک کے رہ جاتے ہوں گے کہ وہ نہ صرف تندرست وتوانا بلکہ قد وقامت سے جواں تر (اگر جوان نہ بھی عمر کس تو) لگتے ہیں اُن سے بھی اگر یہی سوال کیا جائے تو اُن کا جواب نہ جانے کیا ہو مگر ہیں وہ بھی از کشمیریان تر دماغ۔ نظامی صاحب کے وطنی گرائیں۔ ترک وطن کے بعد اُن کے ہم شہر اور ہم کار یعنی Colleague اور تضاوت سن وسال کے باوجود ایڈووکیٹ صاحب محترم کے مصاحرین میں شامل خیر۔

دھیان ایک باب کے مطالعہ کے دوران ایک اور سوانح عمری کی طرف چلا گیا اس سے مراد ہے یوسف حسن خان صاحب کی خودنوشت یادوں بھری دنیا۔ جس میں کہیں یہ جملہ نظر سے گذرا کہ اس بات سے بڑا فرق پڑتا ہے کہ آپ کسی کتاب کو کہاں بیٹھے پڑھ رہے ہیں۔ غالباً وہاں کسی کی بجائے شاعری کی کتاب کا ذکر تھا مگر ہمارے لئے اب یہ کتاب تھی اور مقام مطالعہ تھا انگلستان کی سرزمین جو لکھی بھی یہیں گئی تھی۔ اب قدرتی طور پر ہمیں فرق یہ محسوس ہوا کہ اس کی بدولت کتاب مصنف اور ہم ایسے قارئین کے درمیان ایک رشتہ وتعلق پیدا ہو گیا۔ مقام مطالعہ کے اشتراک کے ساتھ ترک وطن کے گھمبیر مگر مشترک تجربے کی وجہ سے قارئین میں ایک تقابلی نظر بھی پیدا ہو گی ظاہر ہے اس زاویے سے ترک وطن کا تجربہ اب ہمارے لئے کوئی مجرد عملی مفروضہ نہ تھا بلکہ ایک ذاتی سچائی بھی تھی/ ہے۔ سوانحی ادب عموماً مَن کے زمرے میں آتا ہے جس کے اپنے تقاضے سمجھے جاتے ہیں مگر یہاں مصنف کے قدرتی، حقیقی، قلبی اور روحانی جذباتی رشتوں کے باعث جو صاحب سوانح سے ہیں۔ ایک فنی کتاب نے ایک ادبی کتب کی صورت اختیار کر لی۔ جذبات کی فراوانی ہے اور یاد آفرینی کی اُن اقدار کی وجہ سے جو یہاں ناگزیر تھیں۔ نظامی صاحب انگلستان میں بطور نثر نگار معروف ہیں۔ مگر ہماری دانست میں پہلی بار انھوں نے یہاں شعروں کا وافر مگر برمحل استعمال کیا ہے اور یوں کتاب کے دوران مطالعہ قارئین کے ذہن وفکر میں یادوں کی تجدید کا سامان و اہتمام بھی ہوا ہے۔ خصوصاً اس ایک یاد کا جسے یاد وطن سے موسوم کرتے ہوئے شاعر نے کہا تھا

ہم نے جب وادی غربت میں قدم رکھا تھا!
دور تک ..... یاد وطن آئی تھی سمجھانے کو!

نظامی صاحب نے شعروں کے انتخاب میں کسی ایک زبان پر اکتفاء نہیں کیا بلکہ مختلف زبانوں کے اشعار سے کام لیا اور ان زبانوں میں پنجابی شامل ہے اور اپنی مخصوص انفرادی تاثیر کے باعث یہ اشعار قارئین کی آنکھیں نم کرنے کو بہت ہیں۔

عام طور پر سوانحی ادب سے عظمت کا تصور وابستہ سمجھا جاتا ہے یعنی سوانح عموماً اُن شخصیتوں کے رقم ہوتے ہیں جو کسی نہ کسی پہلو سے عظیم قرار پا رہے ہوں۔ مگر غور کریں تو عظمت ایک اضافی وصف ہے۔ انگریزی کے ایک قول یا کہاوت میں اس کی تین قسمیں بیان ہوئی ہیں۔ جس کے مطابق some are born great some achive greatness and some

greatness through upon them یعنی کچھ پیدائشی عظیم ہوتے ہیں۔ کچھ اپنی محنت حوصلے اور عزم و ہمت سے اسے حاصل کرتے ہیں اور کچھ عظیموں کے سروں پر عظمت تھوپ دی جاتی یعنی Thrust کی جاتی ہیں۔ ویسے پیدائشی عظیموں میں کچھ تو واقعی ہوتے ہیں مگر کچھ موروثی قسم کے عظیم بھی ہوتے ہیں ''خصوصاً'' جن کا تعلق صاحب حیثیت خاندانوں سے ملتا ہے اور حیثیت سے مراد لی جاتی ہے۔ صرف دولت وثروت جبکہ کسی مغربی دانش ور کا یہ کہنا بھی بہت معنی خیز ہے کہ

"They who lived and died without a name are the chief heroes of the sacred list of fame"

یعنی شہرت میں بلکہ شہرت کی مقدس فہرست میں سب سے اوپر نام تو اُن سورماؤں کا ہے جو صرف جیئے اور بے نام گذر گئے یہاں انگریزی لفظوں میں چھپی بلاغت قابل غور ہے۔ در پردہ جو یہ ہے کہ زندگی پہاڑ کاٹنے جیسا مشکل کام ہے جسے عزت و وقار دیانت ومحنت سے انجام دینا خود ایک کارنامہ ہے۔ قابل تحسین بجائے خود ناموری کی جوئے شیر کے بغیر بھی تیشہ وسنگ گراں ہے زندگی۔ عزم وہمت وقار کی شرط پر عظمت کا حامل کارنامہ شاید اسی لئے شاعر نے کہا کہ

ہمت بلند دار کہ پیش خداو خلق
باشد بقدر ہمت تو اعتبار تو !

یعنی قدر ہمت ہی انسان کو خدا اور خلقت کی نظر میں معتبر بناتی ہے۔ اس سلسلہ میں حضرت علامہ کا یہ کہنا بھی بہت دلچسپ مگر فکر انگیز ہے کہ زندگی آدمی کا حق نہیں یہ تو جہد مسلسل کا نام ہے..... زندگی جہد است واستحقاق نیست؛

مصنف کے ایک عزیز پروفیسر محمد الیاس ایوب کہتے ہیں کہ ''یعقوب نظامی نے ایک اور بڑا کام کیا اور وہ ہے ابا جی کی زندگی کی داستان..... روشن صدی کی بات..... یعقوب نظامی بڑی انکساری کے ساتھ مسقط ندیم کی طرح کہتا ہے:

میرے باپ نے ہجرت کی تھی میں نقل مکانی !
اُس نے ایک تاریخ لکھی تھی میں نے ایک کہانی !

ہمارے نزدیک یہاں پر انکساری کے ساتھ ساتھ نظامی صاحب نے سعادت مندی کا مظاہرہ بھی کیا ہے کہ باپ کے عمل ہجرت کے مقابلے میں کہانی کاری کے اپنے عمل کو مسقط ندیم کی زبان میں کم تر عمل قرار دیا ہے جبکہ ہجرت کا عمل اگر تاریخ سازی ہے جو کہ تھا تو اُس کی کہانی لکھنے کے عمل کو اہل نظر تاریخ نگاری کہتے ہیں۔ اور تاریخ واقعات کی کھتونی کا نام نہیں یہ تلاش، دریافت اور انکشافات ہے واقعات کے پیچھے کارفرما عوامل وعناصر کی پردہ کشائی کا۔ اس امر کا ادارک کتاب کے مطالعے سے واضح ہوتا ہے ویسے بلاشبہ پروفیسر الیاس ایوب کے مطابق یہ آپ بیتی جگ بیتی بنی ہے۔ کیونکہ یہ ایک صدی کے ساتھ اُس صدی کے لوگوں کے رویوں پر بھی روشنی ڈالتی ہے۔ یوں بھی دیکھا جائے تو ایک فرد کی کہانی ایک طرح حیات وکائنات کی (اپنی حد تک) احاطہ کرتی ہے اس لئے کہ ایک فرد زندگی کے نامیاتی کل Organised whole کا ایک نامیاتی جزو ہی تو ہوتا ہے اور یہ باہم دیگر ملکر نمو پار ہوتے ہیں۔ اس کی ایک سادہ سی مثال وہ ہے جہاں مصنف کے والد محترم کی یادوں پر مشتمل کتاب ''ایک صدی کی بات'' میں نمو پزیر ہوئی گویا نامیاتی طور پر ہی بڑھتی ہوئی۔

اب ایک حقیقت پروفیسر محمد الیاس ایوب صاحب کے بارے میں یہ ہے کہ وہ خود بھی ایک سوانحی کارنامے کا موضوع اور ممدوح ہیں۔ جیسا کہ یعقوب نظامی ہمیں بتاتے ہیں کہ ''نور بصارت سے محروم ہونے کے باوجود وہ تین مضامین میں ایم اے ہیں۔ گورنمنٹ کالج لاہور ایم اے انگلش کے بعد میر پور آزاد کشمیر ڈگری کالج میں بطور پروفیسر بھرتی ہوئے کیا یہ بات بجائے خود کچھ کم ہے کہ ایسی محرومی کے باوجود ایسے پر مایہ علمی پس منظر کا حامل ہوتا۔ مگر ازیں بعد اُن کا یہ عمل بھی ایک کارنامہ ہی قرار پائے گا کہ انھوں نے آزاد کشمیر میں بلائنڈ اسکول کی بنیاد رکھی گویا علم سے خود فیضیاب ہوئے اور پھر دیگر نور بصارت سے محروم افراد کے لئے فیض رسائی کا ذریعہ بنے۔ ہمیں تو اپنی مصروفیات کیلئے اُنھیں پڑھتے ہوئے جو عنوان موزوں تر لگا وہ بھی یہی تھا کہ'' ایں خانہ ھمہ آفتاب است'' ویسے بھی دلیل آفتاب کو کتاب جس واضح ترین تاثر کو ظاہر کرتی ہے وہ علم ہی ہے۔ علم کی فضیلت پر جو زور مختلف اقوال حضرت امام شافعی کے یہاں نظر آتا ہے اکابرین میں دوسروں کے یہاں ذرا کم ہی ملا۔ مثلاً فرمایا جو شخص محبّ علم نہیں اُسے دوست مت بناؤ۔ دوسرے جو شخص طالب دنیا ہے اُسے بھی سیکھنا چاہئے اور جو شخص خواہان آخرت ہے اُسے بھی علم سیکھنا چاہئے۔ یہی نہیں مزید فرماتے ہیں نماز نافلہ سے طلب علم بہتر ہے''۔ بلکہ یہ بھی کہ ''ادائے فرائض کے بعد قرب الٰہی کے حصول کا سب سے افضل طریقہ حصول علم ہے۔ علم کے بارے میں یہ اقوال زریں کتاب کے مختلف مقامات پر خود یاد دلاتے ہیں۔ بلکہ کتاب کے صفحہ اول ہی سے ان کی بازگشت سنائی دینے لگتی ہے۔ بقول مصنف ''آج دنیا پر علم اور اہل علم کی حکمرانی ہے۔'' صاحب سوانح کی بابت یہ بیان کہ ''یہ کہانی ایک ایسے انسان کی ہے جس نے انتہائی غربت اور مفلسی میں زندگی کا سفر شروع کیا تو اُسے مشکلات کا سامنا کرنا پڑا لیکن اس باہمت انسان کے قدم ڈگمانے کی بجائے ثابت قدمی سے آگے بڑھے۔'' اس مقام پر معاً ہمیں خیال آیا کہ یہ قدم حصول علم کے رستے میں آگے بڑھ رہے تھے جس پر امام شافعی کا فرمان ہے کہ ''علم کا مزہ اُس کو آتا ہے جس نے تنگدستی میں سیکھا ہو۔ فرمایا طالب علمی میں یہ حالت تھی کہ مجھے کاغذ بمشکل دستیاب ہوتا''۔

روشن صدی کی بات کو بیان کرنے والے ہیں صاحب سوانح بھی اور مصنف بھی البتہ ایک تیسرے تصویری باب کو بھی ہم باب متکلم ہی کہیں گے۔ عام قاری کے لئے کتاب ایک سے زیادہ معنی ہیں۔

باقی صفحہ ۱۱۷ پر ملاحظہ کیجیے

چمراسر ناول

ڈاکٹر احمد علی جوہر (بہار)

چمراسر، عہد حاضر کے مشہور فکشن نگار شموئل احمد کا تازہ ترین ناول ہے۔ ناول کا نام ناول کے مرکزی کردار چمراسر کے نام پر رکھا گیا ہے۔ چمراسر، ایک انتہائی حساس، تعلیم یافتہ اور باغی دلت نوجوان کا کردار ہے۔ وہ جے، این، یو سے سماجیات میں پی، ایچ، ڈی ہے۔ وہ اپنے دلت سماج کے ہزاروں سالہ سیاسی، سماجی، معاشی اور تہذیبی وثقافتی استحصال پر بہت متفکر ہے۔ اسی فکر نے اس کے اندر احتجاج کا جذبہ پیدا کیا ہے۔ وہ دلتوں اور کمزوروں کے استحصال کے خلاف احتجاج کرنا چاہتا ہے۔ اس کے لئے وہ منصوبہ بند طریقے سے پروگرام بناتا ہے، مہیشاسر سنگھرش واہنی نام کی تحریک کی بنیاد رکھتا ہے، اسروانی نام کا رسالہ جاری کرتا ہے اور دلتوں کو اکٹھا کرنے کی پوری کوشش کرتا ہے۔ اس دلت تحریک کو تقویت دینے میں رکمنی ترپاٹھی جو کہ برہمن ہے، بہت اہم رول ادا کرتی ہے۔ رکمنی ترپاٹھی کا کردار بھی چمراسر کی طرح پورے ناول پر چھایا رہتا ہے۔ رکمنی ترپاٹھی، انسانیت ومحبت، سچائی، وفاداری، مساوات غرض تمام خوبیوں کی پیکر ہے۔ وہ برہمن ہوتے ہوئے بھی منووادی نظام کی کڑی تنقید کرتی ہے اور خالص انسانیت ومساوات کی بات کرتی ہے۔ وہ اپنی تحریر و تقریر سے مہیشاسر آندولن کو آگے بڑھانے میں بھرپور رول ادا کرتی ہے۔ اس دلت تحریک سے دھیرے دھیرے سیف اور کاشف جیسے نوجوان بھی جڑتے ہیں کیوں کہ وہ بھی فاسسٹ طاقتوں کے جبر وظلم کا شکار ہیں۔ یہ تحریک دلت، مسلم کے اتحاد سے رفتہ رفتہ زور پکڑتی چلی جاتی ہے۔ سورنوں کی چھوٹی چھوٹی تحریک جیسے اجگر ٹولی وغیرہ اسے کچلنے کی ہر ممکن کوشش کرتی ہے لیکن جب نہیں کچل پاتی ہے تو پھر سورن چھل کپٹ اور فریب کا سہارا لیتے ہیں جس کے ذریعے بھیشم پتامہ، کرن اور درونہ اچاریہ کا قتل ہوا۔ رکمنی جو دلت آندولن کی سب سے وفادار ممبر ہے اور جو انسانیت ومحبت سے سرشار ہے، اسے سجاتا کے ذریعے جن کلیان سمیتی کے جلسہ میں چیف گیسٹ بنا کر بلایا جاتا ہے اور پھر پروگرام کے بعد منصوبہ بند طریقہ سے امبیڈکر گیسٹ ہاؤس میں اس کا ریپ پھر قتل کیا جاتا ہے۔ یہ سب کام وزیر لکشمی کانت اور اس کے غنڈے مل کر کرتے ہیں۔ وزیر کا اثر ورسوخ دیکھئے کہ وہ انتظامیہ کو ہاتھ میں لے کر سارے ثبوت مٹا دیتا ہے اور بڑی چالاکی سے یہ خبر اخبار میں شائع کروا دیتا ہے کہ رکمنی کی موت حرکت قلب بند ہونے کی وجہ سے ہوئی ہے۔ اسی طرح فریب کا جال پھنسا کر چمراسر کو بھی قتل کیا جاتا ہے۔ یہ کام بھی وزیر لکشمی کانت کے اشارے پر ہوتا ہے۔ وزیر کی بھانجی جو چمراسر کی بدولت مجسٹریٹ بنتی ہے، وہی چمراسر کی جان لیتی ہے۔ بھانجی کئی سالوں سے امتحان دیتی ہے مگر پاس نہیں ہو پاتی ہے۔ بالآخر وزیر لکشمی کانت بڑی چالاکی سے ایڈمٹ کارڈ پہ فوٹو بدل کر بھانجی کی جگہ چمراسر کو امتحان دینے بٹھا دیتا ہے اور بھانجی پاس ہو کر مجسٹریٹ بن جاتی ہے۔ اس راز کے شواہد چمراسر کے پاس ہیں۔ اسی لئے وہ راز کو عیاں کر دینے کا خوف دلا دلا کر اپنی تحریک کو مضبوط کرنے میں مجسٹریٹ اور وزیر سے بہت کام لیتا ہے۔ وزیر لکشمی کانت جب براہ راست اسے کچھ نہیں کر پاتا ہے تو وہ اپنی بھانجی کے ذریعے فریب کا سہارا لے کر چمراسر کا قتل کروا دیتا ہے اور لاش پانی میں بہا دی جاتی ہے۔ چمراسر اگرچہ مر جاتا ہے لیکن فوراً گاما سر اس کی جگہ لے کر تحریک کے جاری رکھنے کا اعلان کرتا ہے۔

یہ ناول عہد حاضر کے ظلم و بربریت کا بیانیہ ہے۔ حالیہ چند برسوں میں دلتوں اور مسلموں پر جو بے انتہا مظالم ڈھائے گئے اور ڈھائے جا رہے ہیں، اس کی عکاسی اس ناول میں بہت ہی موثر طریقے سے کی گئی ہے۔ گئو رکشا کے نام پر ماب لنچنگ، دلتوں کے ساتھ بہیمانہ رویے، ان کی لڑکیوں اور عورتوں کے ساتھ زنا بالجبر اور ان کو دبائے رکھنے کی سورنوں کی تمام حرکتوں اور چالبازیوں کی تصویر کشی بھی بڑے جاندار انداز میں کی گئی ہے۔ ناول شروع سے آخر تک احتجاج اور بغاوت کی آگ سے بھرا ہوا ہے۔ دلت سماج میں جو احتجاج اور بغاوت کی آگ پائی جاتی ہے، اس کی قیادت چمراسر جیسا انقلابی نوجوان قائد تو کرتا ہے لیکن وہ فریب کے ذریعے قتل کروا دیا جاتا ہے۔ اس لئے دلت آندولن، ایک بڑا سماجی آندولن کا روپ لینے سے پہلے ہی دم توڑنے لگتا ہے۔ ناول کے آخری جملہ "یہ جنگ جاری رہے گی" سے امید کی کرن پھوٹتی ہے کہ آگے چل کر یہ آندولن دلت اور کمزور لوگوں کو ضرور انصاف دلانے میں کامیاب ہوگا۔

یہ ناول، کئی اعتبار سے قاری کی توجہ اپنی جانب مبذول کرانے میں کامیاب ہے۔ ناول میں موثر کردار نگاری کی گئی ہے۔ چمراسر کا کردار مرکزی کردار ہے، اس کے علاوہ سجاتا، وزیر لکشمی کانت، مجسٹریٹ اور دیگر کردار بھی اپنی حرکات وسکنات اور بات چیت سے قاری کو متاثر کرتے ہیں۔ ناول میں منظر کشی کم ہے مگر دلچسپ ہے۔ ناول کا بیانیہ انتہائی شفاف، روشن اور رواں ہے۔ کہیں کوئی رکاوٹ محسوس نہیں ہوتی۔ یہ ناول سیاسی اور تاریخی موضوع پر ہوتے ہوئے بھی اشتہاریت، نعرہ زنی، پروپیگنڈہ اور صحافت جیسے عیوب سے محفوظ ہے۔ ناول میں قاری کو متوجہ کرنے اور پوری طرح اپنی گرفت میں رکھنے کی طاقت موجود ہے۔ ایک بہتر ناول کی خوبی "چمراسر" میں بدرجہ اتم موجود ہے جو اسے اردو ناولوں میں معیار ووقار بخشتی ہے۔

''موت کی ذاتیں''

تم ہنسو تو دن نکلے چپ رہو تو راتیں ہیں
کس کا غم کہاں کا غم سب فضول باتیں ہیں
اے خلوص میں تجھ کو کس طرح بچاؤں گا
دشمنوں کی چالیں ہیں، ساتھیوں کی گھاتیں ہیں
تم پہ ہی نہیں موقوف آج کل تو دنیا میں
زیست کے بھی مذہب ہیں، موت کی بھی ذاتیں ہیں

(مصطفیٰ زیدی)

علم وعرفان کا خزینہ

ڈاکٹر رحمان اختر
(پٹیالہ)

برس ۲۰۱۹ء گورونانک دیو جی کا ۵۵۰ واں یومِ ولادت (پرکاش اُتسو) کے طور پر منایا جا رہا ہے۔ اس موقع پر عالمی سطح پر سیمینار، کانفرنسیں اور دوسری تقریبات منعقد کی جا رہی ہیں۔ جن میں گورونانک کے پیغامات ونظریات پر غور کیا جا رہا ہے۔ عصری دور میں ان کے فلسفۂ حیات اور شاعری (بانی) کی اہمیت اور زیادہ بڑھ گئی ہے۔ کیونکہ آج ہر طرف بے چینی، بے سکونی اور افراتفری کا ماحول بنا ہوا ہے۔ ان پیچیدہ حالات سے خلاصی اور خدا کو حاصل کرنے کا طریقہ انہوں نے اپنی شاعری میں پیش کیا ہے۔ آج سے ۵۵۰/سال پہلے گورونانک دیو جی ۱۴۶۹ء کو رائے بھوئے کی تلونڈی (ننکانہ صاحب جو آج کل پاکستان میں ہے) میں پٹواری مہتہ کالو کے گھر والدہ ماجدہ ترپتا کے بطن سے پیدا ہوئے۔ بچپن سے ہی آپ روحانی اور عرفان کی باتیں کرتے تھے۔ آپ کی شادی سلطان پور کے قیام کے دوران سلکھنی دیوی جی سے کر دی گئی۔ آپ کے یہاں دو بیٹے بابا سری چند اور بابا لکھمی داس پیدا ہوئے۔ ۱۵۳۹ء کو آپ کرتار پور میں مالکِ حقیقی سے جا ملے۔

گورونانک دیو جی کی حیات پر نظر ڈالنے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ ایامِ طفلی میں ہی ان کے اندر سے آبِ حیات کی دھارا خودرَو چشمے کی طرح پھوٹ نکلی تھی۔ اور ان کی تمام زندگی ایک عظیم ادبی رَو تھی۔ 'جنم ساکھیاں' ان کی زندگی کا تاریخی ماخذ ہیں۔ بچپن میں رسمِ زنّار پوشی (جنیؤ سنسکار) کی رسم کے موقع پر گورونانک صاحب نے پنڈت سے مودبانہ خطاب کر کے دائمی جنیؤ کی تعلیم اور مروجہ رسومات کی قیود سے رہائی کی ترغیب دی:

دیا کپاہ سنتو کھ سُوت   جَت گنڈھی سَت وَٹ
ایہہ جنیؤ جی کا   ہَئی تاں پانڈے گھَت

اس کے علاوہ 'سچّا سودا' کا واقعہ، بیئیں ندی کا واقعہ اور پنڈتوں، قاضیوں اور دوسرے مذہبی رہنماؤں سے مکالمات ان کی زندگی کے اہم پہلو ہیں۔ بیئیں ندی کے واقعہ سے ان کی زبان پر 'نہ کوئی ہندو نہ مسلمان' کے الفاظ مسلسل جاری ہوئے۔ لوگوں کے پوچھنے پر آپ نے ذاتِ لافانی (خدا) کا ذکر ان الفاظ میں پیش کیا جس کو سکھ فلسفہ میں 'مول منتر' کہا جاتا ہے۔

''اِک اُونکار سَت نام کرتا پُرکھ نِر بھوَ نِر وَیر اکال مُورتِ اَجُو نی سے بھَنگ گُر پَرسادِ۔''

اور فرمایا میرا آئندہ کام خدا کی تعریف وتوصیف بیان کرنے میں مصروف رہنا ہے۔

گورونانک دیو جی کی پہلی شعری تخلیق جس کے آخر میں آپ نے خود کو نانک ساعر لکھا ہے 'راگ آسا' میں 'پٹی' ہے جس میں پنجابی کے ۳۵/حروف کی ترتیب پر ۳۵/بندوں کے ذریعے خدا کی ہستی پر یقینِ کامل، اپنے تمام کام خوفِ خدا کے تحت کرنے اور راضی بہ رضا رہنے کے راز سے آگاہی حاصل کرنے کی تعلیم دی گئی ہے۔

گورونانک دیو جی کے کلام (بانی) کو ۱۶۰۴ء میں گورو ارجن دیو جی نے 'آدِ گرنتھ' صاحب میں ترتیب دے کر ہمیشہ کے لئے محفوظ کر دیا۔ کلامِ نانک کو بحروف گورمکھی الگ طور پر شرومنی گورودوارہ کمیٹی امرتسر اور پنجاب سرکار کے ادارہ بھاشا وبھاگ کی محنت اور کوشش سے شائع کیا گیا۔ اس کی اشاعت کے سلسلے میں انفرادی طور پر بھی چند حضرات نے کوششیں کی ہیں۔ پنجابی میں ڈاکٹر رتن سنگھ جگّی نے 'بانی گورونانک' اور ہندی زبان میں ڈاکٹر مشرا نے 'وانی گورونانک' کے نام سے پیش کیا۔ لیکن عصری دور میں بحروف فارسی رسم الخط اس کی اشد ضرورت ہے تاکہ قارئین اس سے مسرور ومحسور ہو سکیں۔

گورونانک کا مکمل کلام ۵۸۶/پدوں (بندوں) پر مشتمل ہے۔ ان کے کلام میں جپ جی، سِدھ گوشٹ، دکھنی اونکار، آسا دی وار، ماجھ دی وار، ملہار دی وار، پٹی، بارہ ماہا تکھاری جیسی طویل تخلیقات نیز ۵۷۸/منفرد 'شبد' مختلف مواقع پر موسیقی کی تانوں میں گورو جی کے لحن سے ادا ہوئے۔ ان کی متذکرہ صدر تمام تخلیقات، 'آدِ گرنتھ' کے اندر ۱۹/راگوں میں محفوظ ہیں۔ سفر کے دوران مردانہ ربابی (مطرب) گورونانک کے ہمراہ تھے۔ نانک مغنی تھے اور مردانہ ان کا سازندہ۔ اس لئے کہا جاتا ہے کہ گورونانک صاحب شاعری اور موسیقی کا مجسمہ تھے۔

جنم ساکھیوں کے مطالعہ سے گورونانک کی زندگی تاریخی پہلو سے تین ادوار میں منقسم نظر آتی ہے۔

۱۔ ۱۴۶۹ء سے ۱۴۹۷ء تک (تقریباً ۲۸ سالہ خانگی زندگی)
۲۔ ۱۴۹۷ء سے ۱۵۲۱ء تک (تقریباً ۲۴ سالہ سیاحت پر مشتمل زندگی)
۳۔ ۱۵۲۱ء سے ۱۵۳۹ء تک (تقریباً ۱۸ سالہ کرتار پور میں گزری زندگی)

گورونانک دیو جی کا تمام تر ادبی ذخیرہ اسی تاریخی پس منظر سے تخلیق ہوا۔ اولین دور کی تخلیقات میں حیات، رسومات اور خیالات پر روحانی پہلو سے تنقید کی گئی ہے۔ دوسرے دور کی بانی میں مروجہ نظریات، رسومات عقائد و مذاہب پر بے ضرر لیکن پُر اثر تنقید کی ہے۔ چاروں سیاحتوں کے دوران آپ کا پنڈتوں، جوگیوں، صوفیوں اور قاضیوں کے ساتھ رابطہ پیدا ہوا۔ ان کے ساتھ مکالمہ کے دوران تخلیق کردہ ادب میں مروجہ نظریات کا تجزیہ کر کے آپ نے حیاتِ انسانی کی کامیابی کے لئے سیدھا راستہ دکھایا۔ گورونانک صاحب کی بانی کی فہرست اس طرح ہے:

جپ جی ......سودر محلا پہلا......سوہلا محلا پہلا......سری راگ......راگ ماجھ......

راگ گوڑی...... راگ آسا...... راگ گوجری ......راگ وڈہنس...... راگ سوہلا آرتی:
دھناسری...... راگ تلنگ...... راگ سوہی...... راگ بلاول...... راگ رام کلی...... راگ مارو...... راگ سورٹھ...... راگ تکھاری...... راگ بھیرو...... راگ بسنت...... راگ سارنگ...... راگ ملار...... راگ پربھاری......سلوک سہسکرتی......سلوک واراں تو ودھیک۔

کلامِ نانک:

جپ جی صاحب میں ایک عمیق نفسیاتی موضوع کو دانائی اور نتیجہ خیز طریقے سے پیش کیا گیا ہے۔بابا نانک کی یہ تخلیق ایک عالمانہ شعری تخلیق ہے۔مضمون کے نفسیاتی آغاز،عروج اور اختتام سے تخلیقی فن، پرواز خیال،اشعار کے تنوع اور زبان و بیان کی تہ درتہ،تشبیہات کے موزوں استعمال سے شعری فن کی بلندیوں کو چھوا گیا ہے۔جپ جی صاحب کے مطالعے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ۱۶ویں صدی کے پنجاب کی معاشرتی اور تہذیبی پہلو سے یہ تخلیق زندہ و جاوید تصویر ہے۔پنجاب کے یہ راہبر نئے تعمیری اور سائنسی نقطہ نظر کی نشاندہی کرتے نظر آتے ہیں۔جپ جی صاحب میں صداقتِ ازلی کے پیچیدہ سوال کو کمالِ ہنرمندی سے حل کیا گیا ہے۔ایک ہی شلوک میں سچ (پرم سچ) لفظ کو چار بار استعمال کرکے الفاظ کے استعمال کی ہنرمندی کا مظاہرہ کیا ہے۔

آدِ سچّ جُگادِ سچّ
ہے بھی سچّ نانک ہوسی بھی سچّ

جپ جی صاحب میں انسان کو بخشش خداوندی کا طلبگار رہنے کی اطلاع دی ہے یہی گورمت کا یک لفظی فلسفہ ہے۔گورو کی تعلیم کو سننے اور ماننے سے جو عرفان حاصل ہوتا ہے جو روحانی حالت میسر آتی ہے اس وسعت کا نقشہ کھینچا گیا ہے۔

امرت ویلا سچّ ناوَ وَڈیائی ویچارُ
نانک سچّ کہے ویچارُ
تو صدا سلامت نِرنکار

آخری شلوک میں سردارِ کائنات ،انسان کے مقصدِ حیات کی پیچیدگی کے سلجھاؤ کی طرف اشارہ ملتا ہے۔

جنی نامُ دھیایا گئے مسکت گھالِ
نانک تے مکھ اُجلے کیتی چھٹی نالِ

سودر(رہِ راس):

گورو گرنتھ صاحب میں رہِ راس نام کا کوئی عنوان نہیں ہے صرف پہلے شبد کے ساتھ 'سودر' کا عنوان درج ہے اس بانی میں بابا نانک صاحب کے چار شبد آتے ہیں جو آسا راگ میں ہیں۔اس کلام کے بغور مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ خدا کی حمد وثنا ہے۔درگاہ،حضوری اور موکھ دوار وغیرہ الفاظ کا استعمال کیا گیا ہے۔ ذاتِ لافانی، بے عیب، بے نیاز، ہونے کے ساتھ ساتھ خدا ہر جگہ موجود ہے۔

سوہلا آرتی:

ایک ایسی مناجات ہے جو رات کو سونے کے وقت پڑھی جاتی ہے۔اس میں تین شبد ہیں جو راگ گوڑی، راگ آسا اور راگ دھناسری میں ہیں۔اس میں خدا کی وحدانیت کا ذکر ملتا ہے۔گُرمت کے مطابق شاستر وہی ہے جس میں کردگار کی تعریف ہو۔

پہرے:

میں صرف دو شبد ہیں ان میں شبدوں میں حیات انسانی کو رات کے چار پہروں سے تشبیہ دی گئی ہے۔اس کے مطالعہ سے دنیائے فانی کی حقیقت کا بخوبی عرفان ہوتا ہے۔یہ بھی عیاں ہوتا ہے کہ انسان کے اپنے اعمال ہی اس کی راہِ حیات کو تاریک یا روشن بناتے ہیں۔اس تخلیق میں رات کی علامت ظلمتِ جہل کو ظاہر کرنے کے لئے استعمال کی گئی ہے۔

ماجھ کی وار:

وار پنجابی ادب کی بیانیہ صنفِ سخن ہے۔گورو نانک صاحب کی واریں ان کی طویل بانیوں میں شامل ہیں۔ان کا مواد فلسفیانہ اور لطیف ہے۔ماجھ کی وار میں ۲۷ پوڑیاں اور ۶۳ شلوک ہیں۔یہ وار گورو(مرشد) کی توصیف سے شروع ہوتی ہے۔مرشد کو روشنی کا مرکزی منبع بتایا گیا ہے۔جدوجہد وار رزمیہ کی بنیادی روح ہے۔گورکھ(مرد صالح) اور من مکھ(بدراہ) بالترتیب ہیرو اور اس کا رقیب ہیں۔مرد صالح کا کام وردِ الٰہی(نام سمرن) ہے۔من مکھ(نافرمان) کا دل من مت،تکبر،انانیت، جہالت اور خواہشات میں مبتلا رہتا ہے۔ماجھ کی وار میں گورونانک صاحب نے خود کو خدا کا ثنا گر اور ڈھاڈی بیان کیا ہے جو خدا کی عظمت کو اس دنیا پر ظاہر کررہا ہے۔کہیں کہیں فارسی اور عربی الفاظ کا سلیقہ مندی سے استعمال کیا گیا ہے۔

پٹی:

پٹی میں گورمکھی حروف تہجی کے ۳۵ حروف کو بنیاد بنا کر ہر بند ایک ایک حروف سے شروع کیا گیا ہے۔جس میں زندگی کی عظیم صداقتوں کو بیان کیا گیا ہے۔پہلا بند حمدیہ ہے۔جس میں پوری تخلیق کا خلاصہ آجاتا ہے۔اِس میں واضح کیا گیا ہے کہ خواندہ صرف وہی ہے جس کا حساب کتاب درگاہ میں پورا اترتا ہے۔

من کاہے بھُولے مُوڑھ منا
جَد لیکھا دیوہِ بیرا تَوُ پڑیا ۔رہاوَ

بنیادی موضوع میں خدا کی قدرت کاملہ، دنیا کی ناپائنداری وغیرہ کا بیان کرتی ہے۔زبان کا سلیس انداز اور ہر دل عزیز طرزِ بیان احساس کو مزید نکھارتا اور چمکاتا ہے۔

دوے دوس نہ دیئو کسے دوس کرماں آپنِیاں
جو میں کیا سو میں پائیا دوس نی دیجے اور جناں

آسادی وار:

اِس طویل بانی کو گوربانی میں خصوصی مقام حاصل ہے۔ یہ بانی گر سکھ ریت (سکھ مذہب کی طریقت) میں صبح کے وقت اجتماعی طور پر پڑھی جاتی ہے۔ یہ کلام چھکے (مسدس) شلوک، اور پوڑی کا سنگم ہے۔ اس بانی میں ۲۴ پوڑیاں اور ۶۰ شلوک درج ہیں جن میں سے ۱۵ شلوک دوسرے گورو صاحب کے ہیں۔ اس بانی میں گورو کی شبیہہ کا بیان ملتا ہے۔ جو مقصدِ حیات، انسان کی انفرادی معاشرتی اور مذہبی زندگی جس کی بنیاد ستگورو کی عطا کردہ روحانی بصیرت ہے۔ مرشد گورو کی رہنمائی سے بشر خدا کی عبادت میں محو ہو جاتا ہے۔ محبت، خوف اور عبادت کے جذبہ سے وابستہ ہو کر مخلوقِ خدا کی خدمت کا راستہ اختیار کرتا ہے۔ گورو نانک کی بانی میں جہاں سچ کی روشنی ہے وہاں فریب، جہل اور وہم کی مذمت اور مخالفت بھی ہے۔ مختلف مذاہب کی رسومات کے کھوکھلے پن کو طنز کی نوکِ نشتر سے دور کیا گیا ہے۔ پیدائش اور مرنے کو امرالٰہی کہہ کر خداوندی کے تحت ثابت کیا گیا ہے۔ اس بانی کی ڈکشن اور استعاراتی اسلوب بلند ترین فنکارانہ لمسوں سے پُر اور انسانیت کے قلب پر دائمی اثر چھوڑنے والا ہے۔

رام کلی دکھنی اونکار:

گورو نانک صاحب کی بانی میں اونکار نام کی تخلیق کو خاص مقام حاصل ہے۔ اس کلام میں نہایت سادگی کے ساتھ فن کا استعمال کر کے اعلیٰ روحانی حقائق اور زندگی کی اٹل صداقتوں کا اظہار کیا گیا ہے۔ خدا کی ہمہ گیریت اور وسعت پر غور کیا گیا ہے۔ پُر تاثر اسلوبِ سخن کے ذریعے بلند پایہ فلسفیانہ مطالب کو بیان کیا گیا ہے۔ اس مطالعے سے دل و دماغ میں معرفت کا چراغ روشن ہو جاتا ہے۔ اور جہالت کی تیرگی ختم ہو جاتی ہے اس عظیم بانی میں صداقتیں بیان کی گئی ہیں۔ نمونہ کے طور پر دیکھئے

کام کرودھ کا یا کو گالے
جیوں کنچن سوہاگا ڈھالے
گُرمکھ آوے جائے نِسنگ
پر ہر میل جلائے کلنگ

سِدھ گوشٹ:

راگ ران کلی میں سِدھ گوشٹ تخلیق کی گئی ہے۔ اس بانی میں ۷۳ بند ہیں ہر بند مسدس (چھ مصرعوں کا) ہے۔ اپنی سیاحت کے دوران گورو نانک صاحب سادھوؤں، سنتوں صوفیوں، فقیروں، سِدھوں اور جوگیوں سے ملتے رہتے جن کا ذکر ان کی سوانح عمریوں (جنم ساکھیوں) میں ملتا ہے، مکالماتی انداز میں صداقت تک رسائی کی کوشش ہے۔ شمالی ہند میں جوگ مت کے پھیلاؤ سے روحانی گفتگو کا ماحول بنا۔ جوگ سادھنا یعنی جوگ کے مسالک اور نظریات عہدِ وسطیٰ کی ہندوستانی تہذیب کا وسیع حصہ ہیں۔ سکھ مذہب کی مقدس کتابوں میں جوگ کی علامات اور نظریات کو نئے معنی بخشے گئے ہیں۔ گورو نانک صاحب کی یہ تخلیق جوگ مت کی تشریح اور تجربہ سے متعلق ہندی فلسفہ میں نیا اضافہ کرتی ہے۔ لہٰذا اس کو سمجھنے کے لئے شعوری سطح کا بلند ہونا بہت ضروری ہے۔

متذکرہ بانی کے علاوہ 'اُلاہنیاں' جو موت جیسے اٹل موضوع پر سکھ فلسفہ کی وضاحت کرتی ہیں۔ جہاں موت قدرت کا اٹل اصول اور ہمہ گیر لازمی عمل ہے وہاں یہ خدا کے گھر تک رسائی کا مبارک موقعہ بھی ہے۔ پٹّی اور پٹّی لکھتی، تکھاری جھنت۔ بارہ ماہا، وار ملارکی، مارو سولہے، بابر بانی، شلوک سہسکرتی تے شلوک واراں تے ودھیک بانی (کلام) میں شامل ہیں۔

گورو نانک صاحب کی بانی عوامی شعری روایت کا وہ کلاسیکل خزانہ ہے جس نے روحانی دنیا کے ساتھ ساتھ ادب اور فن کی دنیا میں ان کو دنیا کا بادشاہ بنادیا ہے۔

کلامِ نانک میں اِملا

گورو گرنتھ صاحب میں فارسی اصوات والفاظ کو اصل شکل میں درج نہیں کیا گیا بلکہ خ، ذ، ز، ش، ظ، ض، ف، اور ق کی آوازیں گورمکھی حروف پیش نہیں کی گئیں۔

خ کی جگہ کھ جیسے:

خوار کی جگہ کھوار، بخشنہار کی جگہ بکھسنہار وغیرہ

ذ، ز، ض، ظ کی جگہ ج کا استعمال ہوا ہے:

قاضی کی بجائے کاجی، نماز کی بجائے نماج، زنجیر کی بجائے جنجیر، نیزا کی بجائے نیجا، روزہ کی بجائے روجہ، دروازہ کے بجائے درواجہ وغیرہ

ش کی جگہ س کا استعمال:

شبد کی جگہ سبد، آشنائی کی جگہ اسنائی، بہشت کی جگہ بہس، شیطان کی جگہ سیطان، شرع کی جگہ سرع، پاتشاہ کی جگہ پاتساہ، شاہوکار کی جگہ ساہوکار، شبہہ کی بجائے سبہہ وغیرہ

ق کی جگہ پر ک کا استعمال:

قاضی کی جگہ کاجی، قربان کی جگہ کُربان، قدرت کی جگہ کدرت، قیمت کی جگہ کیمت، لائق کی جگہ لائک وغیرہ

ف کی جگہ پھ کا استعمال:

فرمائش کی جگہ پھرمائس، فرمایا کی جگہ پھرمایا

غ کی جگہ پر گ کا استعمال:

مغل کی جگہ مگل، کاغذ کی جگہ کاگذ، غلولہ کی جگہ گلولہ وغیرہ

ظ کی جگہ پر 'د' کا استعمال:

نظر کی جگہ ندر وغیرہ

ع کی جگہ ا کا استعمال:

عمل کی جگہ امل، عرض کی جگہ ارج، عاقی کی جگہ آقی، عملی کی جگہ املی وغیرہ۔

نون غنہ کا بہت کم استعمال ملتا ہے۔فارسی رسم الخط میں اس معمول کو بدستور قائم رکھا گیا ہے۔

میں کے بجائے مَے، ہوں کے بجائے ہَو، ماں کے بجائے ما، تاں کے بجائے تا، کاؤں کے بجائے کاؤ، آواں کے بجائے آوا، چھاواں کے بجائے چھاوا، آکھاں کے بجائے آکھا، نہیں کے بجائے نہی، ناہیں کے بجائے ناہی وغیرہ۔

کئی جگہ 'ن' کا استعمال ملتا ہے:

گورونانک کے کلام میں نہ، نا، ناہ، اورتا اورتاں کا استعمال بہت کم ہوا ہے ان کی جگہ 'ن' اور 'ت' ہی اکثر استعمال کیا گیا ہے۔جیسے: مچھلی جال ن جانتا، انتر الکھ نہ جائی وغیرہ

'ء' کا مختلف طور پر استعمال ملتا ہے جیسے: کوء، کوئے، آء، آئے وغیرہ۔

'اؤ' کی جگہ جیسے جئو تئو وغیرہ، کلام میں ڑھ، ڈھ، بہت کم ملتا ہے صرف ڑ اور ڈ ہی استعمال کئے گئے ہیں جیسے: پڑھ کی جگہ پڑ، ہڑھ کی ہڑ، چڑھ کی چڑ، کڈھ کی کڈ وغیرہ۔

واؤ معدولہ کو حذف کر دیا گیا ہے جیسے: گورو، گور، گروکو گُر، اسی طرح خوشی کو کھُسی اور دوار کو دُآر لکھا گیا ہے۔

اعداد و شمار کا استعمال بھی دوسرے طریقے سے ہوا ہے: دو کی جگہ دوء، تہہ کی جگہ تِۃ، چوہ کی جگہ چہ، نوں کی جگہ نہُ، دو کی جگہ دوء وغیرہ

اعراب کا استعمال:

کلام نانک میں تلفظ اور روانی کے لئے اعراب کا استعمال کیا گیا ہے تاکہ معنی کا تعین کرنے میں کوئی دقت نہ ہو جیسے: جَن، جُن، گَن، گُن، دھَن، دھُن، رَت، رُت، دِہ، دیہہ، دَہ، دوء، دوئی وغیرہ۔

فرہنگ:

نام (ذکرِ خدا)، دان (خیرات)، پُن (ثواب)، گُن (اوصاف)، اوگُن (عیوب، گناہ)، صفت صلاح (صفت وثناء)، اننت (لاحد وشمار)، نِربھَو (بےخوف، نڈر)، اگوچر (فہم و فراست سے بالاتر)، اَلکھ (سرحدِ ادراک سے پرے)، نِرمل نِرنجن (آلائش دنیوی سے پاک)، انحد، انہد (روحانی آواز جو کسی ساز ومضراب کے بغیر پیدا ہو)، دیِدھم یادسم دآر (تمام حواس سے بالاتر)، نِج گھر یا اپنا گھر (مقامِ حقیقی)۔

اس جہاں اور اُس جہاں کو کئی ایک استعاروں اور تشبیہات سے موسوم کیا گیا ہے جیسے: اِت اُت (یہاں اور وہاں)، پیکے ساہورے (یہاں اور وہاں)، ایہا اور اوہا (دنیا و آخرت)، پیدا ہونا اور مرنا (جنم۔مرن) اور آنا جانا کو بھی اس طرح یاد کیا گیا ہے۔جنم مرن، جمن مرن، آوت جاوت، آء جاء وغیرہ۔

بحرِ وجود کے لئے بھوَ ساگر اور بھوَ جل الفاظ کا استعمال کیا گیا۔ملک الموت کو جم دوت، یمدوت، یمراج، اور موت کے مقام کو جم پُر اور جم لوک کہا گیا ہے۔رشتہ داروں کے ناموں کو مات، ماء، ما، مائی، پتا، کل، بھراتا، بھین، دھن کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔خدا کو خصم، پتی، سوہِ، سُہہ، بیلی، سنگی، ساتھی وغیرہ سے یاد کیا گیا ہے۔

چار وید......سام، رِگ، یجر اور اتھروید

چار یگ......ست جگ، تریتا، دوآپر اور کلجگ

حسِ سفلی:

کام کو حرص، کرودھ کو غصہ، لوبھ کو لالچ، موہ کو دنیوی محبت اور ہنکار کو خودی غرور کے معنوں میں لیا گیا ہے۔ہومَے......انسان کا غرور اور تکبر ہے۔مکتی......دنیا سے نجات پانے کو کہا گیا ہے۔دن رات کے لئے اہ نِس، سدا کے لئے دہِ رات یا دِن رات یا رین دوس۔ہر روز کے لئے اَن دِن۔بنانا بگاڑنا کے لئے دھاہ اُسارے، پیدا کرنا۔فنا کرنا کے لئے تھاپ اتھاپ، مار جواء وغیرہ۔دِل کو کئی ناموں سے موسوم کیا گیا ہے۔من، منوا، منو، منے وغیرہ۔محبت، عبادت بندگی کے لئے ۔بھگت، بھاؤ، بھے، پریم، پریت وغیرہ، جسم کے لئے سریر، دیہہ پنڈ۔کایا وغیرہ۔

بھولنا بھلانا کے لئے۔وِسرو سار، وسار یا، وِسریا۔

کہنا عرض کرنا: بھنت، کہت، کہہ، آکھے، بکھانے، اور دیکھنا۔دِسٹ دسٹی

نظرِ کرم کرنا۔ندر کرے، نہالے، ندری ندر، نہال

بیوقوف جاہل کے لئے: مورکھ، مُگدھ، گاوار، گنوار، اور گوار

عقل مند اور دانا کے لئے: پنڈت، سیانا، چتر، چاتر، اور جوسی وغیرہ۔

جوگیوں سے متعلق استعمال کئے گئے الفاظ مندرجہ ذیل ہیں: جوگ، لوگ، مندا، جھولی، بھوت، بھیک، بھسم، دسواں دآر، ناد، ہٹھ یوگ، پنگلا، سکھمنا، نہت سبد، سادھ وغیرہ

بیوپار سے متعلق الفاظ:۔ واپار، واپاری، ونج، ونجارا، ساہ، ہانی، توٹ، گھاٹ، لاہا، پاٹ، پتن وغیرہ۔

قربان جانا کو بل جاؤ، بل بل جاؤ، بلہارے جاؤ، بلہارے، بلہاری، واری جاؤ، کے روپ میں۔

جگہ مقام کے لئے: تھاء، تھاں، ٹھائی، ٹھور، تھاؤ، کا استعمال ملتا ہے۔خدا کے علاوہ کسی دوسرے سے محبت اور لگاؤ کے لئے دوجی، دوجا، دوجے، دوء، دونی، دُبدھا۔زمین و آسمان، خلاء کے لئے: دھرت، اکاس، مہیئل، اور سمندر۔ریتیلے میدان کے لئے جل اور تھل۔

مذکورہ بالا الفاظ کا استعمال بار بار متن میں آتا ہے اس لئے ان الفاظ کے املا اور فرہنگ سے واقفیت از حد ضروری ہے۔مجموعی طور کہا جاسکتا ہے کہ گورو نانک صاحب محقق اعلیٰ اور نقادِ قدرت تھے۔ان کا کلام خدا کی صفت وثنا اور حمد و مدح ہے۔یعنی ان کے کلام سے خدا کی صفات وحسنات کا خاطر خواہ پتہ چلتا ہے۔قاری اس کی محبت اور الفت میں مستغرق اور محو ہو جاتا ہے اور علم وعرفاں سے مسرور و محفوظ ہوتا ہے۔ان کا کلام جہاں وحدانیت کا درس دیتا ہے وہاں اس کے مطالعہ سے انسان کو شاہراہِ روحانیت پر گامزن ہونے کی دعوت بھی دیتا ہے۔

''تقدس کی خوشبو''

محمد الفیتوری (سوڈان)

ترجمہ : اقتدار جاوید (لاہور)

رات

جب
شہر کی ساری کفنائی گلیوں میں
سایوں بھرا جال پھیلاتی ہے
دیکھ سکتے ہو تم دیکھ سکتے ہو
لوگوں کو، گہری خموشی سے ڈھانپے ہوئے
درزیں تکتے ہوئے، ان کو بھرتے ہوئے
تم سمجھتے ہو
وہ مطمئن ہیں، نہیں، آگ میں جل رہے ہیں!

اندھیرا اسی شہر کی گلیوں میں کیسے ہیکل بناتا ہے
کیسی غضبناک ضربیں لگاتا ہے
تب شہر لوگوں کو
بل کھاتے زینے کی جانب بلاتا ہے
۔۔۔عہدِ گذشتہ کی جانب
جہاں
عود کی خوشبو سے لبریز ساحل ہیں
یادیں پرانی ہیں، جن کو جگانا بھی مشکل ہے
لوگوں کے اندر
تمنا بھری اور لعلوں بھری تازہ دیوار اٹھتی ہے!

جب رات سوتی ہے
شمعیں اٹھاتی ہے
اور دن نکلتا ہے
تب
امن پانی کی موجوں کی صورت
پلٹتا ہے
ناکارہ لگتا ہے، تب شہر کا دل
اسی مسکنِ اوّلیں کی طرف شہر مڑتا ہے۔۔۔یعنی لحد کی طرف

دوپہر کو دہکتا ہے
تنوّر کی طرح
(اندھوں کی خاطر اجالے بڑا لیمپ بنتے ہوئے)
شہرِ افریقہ کی طرح
نازک عباؤں میں ملبوس عورت کی صورت
تقدس کی خوشبو سے لبریز ہوتا ہے
اک بھیڑ کے سینگ میں
ایک آیت سے منقوش تعویذ میں
اک سیہ فام عورت کے رقصِ برہنہ میں ڈھلتا ہے
آقا گناہوں کی مدہوشی پر زندہ رہتا ہے
آقا کی خاطر
جہازوں کو بھرتے ہیں
ناکتخدا، نوجواں لڑکیوں، ہاتھی دانتوں سے، پرفیومز اور
زعفراں سے
جہازوں کو لے جاتے ہیں
دور دیسوں کے آقا کی جانب
جو سارے زمانوں کا آقا ہے

اک باغ ابھرتا ہے
ننگے بدن ڈھانپے جاتے ہیں
ملبوس سلتے ہیں
بہتی ہے اک رو
اسلاف کی طرح پانی کو رنگتے
خدا کے خدوخال رنگتے

سیہ رات
جب شہر کی گلیوں میں
پتھروں کی اٹھاتی ہے باڑیں
تو یہ لوگ
ہاتھوں کو اوپر اٹھاتے ہیں
سر کو جھکاتے ہیں
ٹھوڑی کے نزدیک لاتے ہیں
اور تم سمجھتے ہو، وہ مطمئن ہیں
نہیں، آگ ہیں آگ!!!

ہند کے باسیو

مشیر طالب (نیویارک)

اک بار ذرا سوچو تو!

نت نئے رنگ برنگے تھے چمن زار کے رنگ
جاتیوں کے سبھی رنگ ڈھنگ تھے سب سے آہنگ
پریم کے ٹھاٹ سروں پر تھی کھنکتی مردنگ

یہ چمن زار تھا دنیا کے چمن زاروں کا
مسجد و مندر و گرجاؤں کا گُردواروں کا
بھگوت و گیتا و انجیل کا قرآنوں کا
رنگ اور نسل سے بالا یہ حیاداروں کا
وسعتِ ظرف میں اس کا کوئی ثانی ہی نہ تھا!

ہند کی سرزمیں ! یہ پیار کا گہوارہ تھی
غیر ہندی کو بھی دامن میں جگہ دیتی تھی
اپنے آنچل میں ہر اک پھول سجا لیتی تھی

دامن ظرف تو محدود کبھی تھا ہی نہیں
فخرِ مشرق تھی یہ! سورج بھی نکلتا تھا یہیں
ایک بے پایاں اھنسا کی تھی یہ ہند زمیں

اب اسی ہندکو کیوں دستِ بلا کرتے ہو
نخلِ گل کس لیے کانٹوں سے سوا کرتے ہو
پاپ اور پُن کی تفریق بھلا بیٹھے ہو

نفرتیں ہند کو شمشان بنا ڈالیں گی
مہکے گلشن کو یہ کھلیان بنا ڈالیں گی
مرثیوں، نوحوں کو سنتان بنا ڈالیں گی

ہو سکے رام کی سیرت کو پھر اک بار پڑھو
کرنا کیا چاہیے تھا اور اب کرتے کیا ہو
سوچو اک بار ذرا، پھر سے ذرا سوچو تو!

○

مجاہدِ اردو

یوگیندر بہل تشنہ
(یو ایس اے)

گلزار تیرا یارو کرم
جہانِ چہارسو کا وکرم
مجاہدِ اردو ادب کا وکرم
ابھی ابھی تھا، اب نہیں ہے
عالمی اردو ادب کا وکرم

اُردو ادب کے دیوانوں کی
آنکھوں میں بھر گیا ہے وہ
اشکوں کے بحرِ قلزم
اس طرح ہمارے درمیاں سے
دفعتاً اٹھ کر چل دیا ہے
جیسے کوئی ستانے کی خاطر
اپنے شیشتاں کی جانب جائے

کرتا رہا دمِ آخر تک، اُردو ادب کی خدمت
عالمی ادب کا آخری شمارہ بھی سپردِ ڈاک کر گیا ہے
نپٹا گیا ہے اپنے ذمے کے کام سارے
کل تلک آنکھوں کی آبرو تھا
تشنہ نیا ہے اب خیالات کا پرندہ
لیکن ہمارے دلوں میں رہے گا
جاوید، زندہ و تابندہ
وہ میرا و کرم، ہمارا و کرم
گلزار تیرا یارو کرم
جہانِ چہارسو کا وکرم
مجاہدِ اردو ادب کا وکرم

عالمین

خواب ہے یا کوئی تصوّر ہے
یہ توازن، یہ فکر کا میزان
اتنا گہرا، خموش آوازہ
ہر تحرّک بقدرِ اندازہ
بے حصاری کا یہ معدوم حصار
کائناتوں کا بے شمار، شمار
قلزمِ بے کنار کا عالم
عالموں کے غبار کا عالم
کہکشاؤں کے ہار، لامحدود
مہرِ بے اختیار، لامحدود
بے حدو بے حساب سیّارے
داغ، بے داغ، بے پنہ تارے
ایسا بے انت ہے خلا کیونکر!
یہ خدا گر ہے، یہ خدا ہے گر
اس حقیقت کی کیا حقیقت ہے
جُز تصوّر کہاں یہ وسعت ہے!

○

خوشی

کیا پہننے کو اس پری کے پاس
ڈھنگ کا ایک بھی نہیں ہے لباس
جب بھی آتی ہے ملنے وہ مجھ سے
سوگوار،
ماتمی رنگ اوڑھے آتی ہے

فیصل عظیم
(کینیڈا)

مغلُوب

شمال میں برف تیزی سے گھُل رہی ہے
زمیں کا نقشہ بدل رہا ہے
سمندروں میں چڑھا ہوا ہے، گئے زمانوں کا تازہ پانی
کئی جزیرے تو اب بھی ہیں بیخبر، مگر کل
کہیں نہ ہوں گے!
بدلنے والی ہیں سرحدیں، پر
بڑا ہی شیریں ہے خوابِ غفلت
ہمارے اندازے، خواب، سب پیچھے رہ گئے ہیں
سمندروں میں بہت سے طوفان اُٹھ چکے ہیں
اِدھر زمیں پر،
بساط پر بازیوں کی تیزی، نظر سے اوجھل
اُدھر فلک پر ستارے اوجھل
وہ جن کو شہ مات ہو رہی ہے، وہ سارے اوجھل،
کہف کے غاروں میں سو رہے ہیں
وہ جن کے ساحل، جزیرے، فردوسِ منتظر کے
نشان، بے نام ہونے کو ہیں
کوئی تو جا کر اُنہیں جگائے
اُنہیں بتائے
زمیں کا نقشہ بدل رہا ہے
زمیں سے طوفان اُٹھ رہے ہیں
سمندروں میں بدل رہے ہیں

○

لافانی رشتہ

ڈاکٹر ریاض احمد
(پشاور)

ساتھی ہو میری تم بچپن کی
پھر یونہی گزرا لڑکپن بھی
جب گاؤں سے چل کر آتی تھیں
کچھ باتیں مجھے بھی سناتی تھیں

تیرے گاؤں میں جب بھی جاتا تھا
کچھ قصے تمہیں بھی سناتا تھا
جب کھیل کے ہم تھک جاتے تھے
تب باتوں میں لگ جاتے تھے

دو بہنیں ہماری اماں تھیں
جو ہم دونوں کی خالہ تھیں
تھیں اپنے وطن سے دُور بہت
پر رہتی تھیں مسرور بہت

یہ بہنیں جب مل جاتی تھیں
تب گزرے دن لوٹاتی تھیں
کبھی ہنستی تھیں کبھی روتی تھیں
یہ منظر سب کو دکھاتی تھیں

اپنوں کی یاد ستاتی تھی
مٹی کی مہک یاد آتی تھی
ہم پاس ہی ان کے رہتے تھے
اور کھیل میں گم ہو جاتے تھے

دو بہنیں اک دن بول اٹھیں
دل اپنے سب پہ کھول اٹھیں
یہ دونوں ہمارے بچے ہیں
گو کمسن ہیں پر سچّے ہیں

یہ دونوں ساتھ نبھائیں گر
اک دوجے کے ہو جائیں گر
یوں رشتہ ہمارا قرض ہوا
اور ہم دونوں پر فرض ہوا

جو ہوتا تھا ہو وہ ہو کے رہا
تقدیر کا لکھا پورا ہوا
تقدیر لکھی ہے جس رب نے
وہ رہبر وخالق ہم سب کا

میں تم سے محبت کرتا ہوں
تجدیدِ وفا بھی کرتا ہوں
یہ دنیا آنی جانی ہے
پر رشتہ یہ لافانی ہے

○

لمحوں کی مسافت

شگفتہ نازلی
(لاہور)

بے خبر ہیں منزل سے۔۔۔
لمحوں کی مسافت کو طے کیے تو جاتے ہیں۔۔۔
زندگی کی گاڑی سے لوگ اُترتے چڑھتے ہیں۔۔
دُکھ سُکھ بانٹے جاتے ہیں، سُنتے اور سُناتے ہیں۔۔۔
کوئی کہہ نہیں سکتا کس نے کب اُترنا ہے اور کہاں سے چڑھنا ہے۔۔۔
سلسلہ ازل تا اَبد یونہی چلا آتا ہے۔۔۔
چلتی رُکتی گاڑی میں ایسے بھی کچھ ہوتے ہیں۔۔۔
سب کے بیچ ہو کے بھی جو جُدا سے ہوتے ہیں۔۔۔
کتنے چہرے لمبی چپ ہونٹوں پہ سجائے ہیں۔۔۔
کتنے چہرے جانے کیا سوچ کے مسکائے ہیں۔۔۔
چُپ کا بھید اور مسکان کوئی جانتا ہی نہیں۔۔۔
کیا شناسا، کیا انجان کوئی مانتا ہی نہیں۔۔۔
کس نے اوجھل ہونا ہے کس نے دِکھتے رہنا ہے۔۔۔
چھپتے دِکھتے چہروں سے کیا کیا کہتے رہنا ہے۔۔۔
کچھ خبر کسی کو نہیں۔۔۔
اور جو چھپ گئے چہرے، ذکر اُن کا رہتا ہے۔۔۔
باقی رہنے والوں میں یادیں اُن کی رہتی ہیں۔۔۔
بے خبر ہیں منزل سے۔۔۔

○

کشمیر کی آواز!!!

ڈاکٹر انیس الرحمٰن (سکھر)

ابھی تو کشمیر جل رہا ہے
ابھی تو گل پوش وادیاں بھی لہولہو ہیں
ابھی تو ہر سُو کڑے ہیں پہرے ستمگروں کے
ابھی تو جنت نظیر وادی کا چپہ چپہ ہی بے اماں ہے
گلی گلی ہے ابھی تو مقتل
قدم قدم پر ہی کربلا ہے
ابھی تو برفیلی چوٹیاں بھی
اُگل رہی ہیں بَلا کے شعلے
ابھی تو گھر گھر الم زدہ ہے
تمام مظلوم ماؤں، بہنوں، بیٹیوں کی
یہی صدا ہے!
ابھی تو کشمیر جل رہا ہے!
تو کیسے لکھوں خوشی کے نغمے،
میں کیسے گاؤں، میں کیسے جھوموں!
میں کس طَرح قہقہے بکھیروں!
ابھی تو کشمیر جل رہا ہے

○

ثانیِ کرب و بلا

شوق انصاری (فیصل آباد)

انتہائے ظلم کی تفسیر ہے
ثانیِ کرب و بلا کشمیر ہے
دُخترِ حوّا یہاں بے آبرو
بہہ گیا معصوم بچوں کا لہو
ہر جواں پر موت کی تعزیر ہے
ثانیِ کرب و بلا کشمیر ہے

دھارا370

فرخندہ شمیم
(راولپنڈی)

سات دہائیاں بیت چکی ہیں
وادیٔ ظلم کے بلڈوزر میں ذرہ ذرہ بکھر چکی ہے
عریانی کی دھول لپیٹے کا روحشت
ظلم کے پنجے چاٹ رہی ہے
یواین او خاموش کھڑی ہے

☆

دیکھو دھارا370
نگل گیا ہے بچی کھچی سانسوں کا صندل
کرچ گیا بلور کا برتن
سرخ چنار کی آزادی پر
وزنی بوٹوں کی کچلاہٹ
10 دسمبر ماننے والو!
حق انساں جاننے والو!
دیکھو ظلم کا کیسا فاسق قبضہ ہے
اب کا نہیں یہ ستر برس کا قصہ ہے

☆

یواین او تو ایک فسانہ
ایک کہانی، ایک بہانہ
یواین او کا مطلب ہے کہ تم ہی تم

این او۔۔۔یعنی نو کا مطلب نہیں نہیں
گویا تم تو کبھی نہیں
یواین او کا مطلب ہے کہ نہیں نہیں۔۔۔تم کبھی نہیں
تم تو وہ ہو جن کی سانسیں، جن کی نسلیں
ایک ہماری گھنٹی کی محتاج رہی ہیں
جو صدائے جرس نہیں، صرف صدائے وحشت ہے
دیکھو لوگو، تبھی تو دنیا ظلم کی ریت میں دھنسی ہوئی ہے
ہواین او خاموش کھڑی ہے!

لوک سبھا کے ایوانوں میں
تلک لگائے نیتاؤں نے
بھالے اور بھی تیز کیے
اور سادھو نام کو داغ کیا
پھر تنخواہ دار غلاموں نے
سڑکوں پر انسان کو روندا
کلیوں کو بیلوں میں کھینچا
سرخ چنار کی بوٹی کر کے
مودی کو کھانے میں بھیجا
اس مودی کو، جو موذی ہے
اور نریندر موذی ہے،
ہواین او کی ناک کے نیچے
چارٹر کی دھجی بکھری ہے
ہواین او خاموش کھڑی ہے!

☆

لیکن یہ ہے لاءآف نیچر
یعنی کہ قانون فطرت
اس دنیا کی کوئی ساعت، کوئی منظر، کوئی نغمہ ابد نہیں ہے
کچھ بھی لایزل نہیں ہے!

☆

اس دنیا میں بسنے والے لوگوں پر
ظلم کی گولہ باری ہو
کیسی ہی سنگ باری ہو
کتنی نخوت، کتنی ٹھوکر، کتنی ڈنڈا کاری ہو!
جب پلٹے حالات کا دھارا
مردہ دھرتی قبر کے اندر دھڑکن بن کر اٹھتی ہے
مٹی کے آدم کو پھر سے جنتی ہے
اجڑا آنگن یوں دوبارہ بستا ہے
ڈل کی جھیل میں عکس چنار کا ہنستا ہے!

○○

ایک صدی کا قصّہ

مالاسنہا

دیپک کنول (ممبئی)

اُسکا نام آلدا سنہا تھا۔کلکتہ کے جس گرلز اسکول میں وہ پڑھتی تھی وہاں کی لڑکیاں اُسے ڈالڈا، ڈالڈا کہہ کے چڑاتی تھیں۔ڈالڈا گھی کا مشہور برانڈ ہے جسے متوسط طبقے کے لوگ استعمال کرتے ہیں۔اُسنے اپنا نام بدلا اور نیا نام نازیما رکھ دیا۔بہت سارے لوگ اس غلط فہمی میں مبتلا تھے کہ اُسکا باپ بنگالی ہے جس نے ایک نیپالی عورت سے شادی کی ہے۔سچ تو یہ تھا کہ وہ نیپالی نژاد تھی۔اُسکا باپ ایک نیپالی کرسچن تھا، نام تھا البرٹ سنہا۔نازیما 11 نومبر 1936 کو کلکتہ میں پیدا ہوئی۔اور وہیں اسکی پرورش ہوئی۔اُسنے بچپن میں ہی ناچ گانا سیکھا وہ آل انڈیا ریڈیو کی approved آرٹسٹ تھی۔اُسے پہلا بریک بطور چائلڈ آرٹسٹ ملا۔اُسنے بی بی نازیما کے نام سے اس فلم میں کام کیا۔اُسنے پہلی بنگالی فلم جو کی اُس کا نام ''جے وشنو دیوی تھا''۔اُسنے بچہ کلاکار کے طور پر چار فلمیں کیں۔''جے وشنو دیوی''''شری کرشن لیلا''''جوگ بیوگ''اور ''ڈولی''۔ چاروں فلمیں بنگالی زبان میں تھیں۔

جب وہ جوان ہوئی تو اُسنے ایک بار پھر اپنا نام بدل دیا۔اب کے اُس نے اپنا نام مالاسنہا رکھ لیا۔ایک دن بنگال کے مشہور ڈائرکٹر اردندو بوس نے اُسے اسٹیج ڈرامہ میں دیکھا۔وہ اُسکی اداکاری سے اتنا متاثر ہوا کہ اُسنے مالا کو اپنی فلم میں بطور ہیروئن لینے کا فیصلہ کیا۔اُس نے مالا کے باپ کی اجازت لے کر اُسے اپنی فلم ''روشن آرا'' میں کاسٹ کیا۔یہ فلم 1952 میں ریلیز ہوئی۔اس فلم کے بعد مالاسنہا نے کئی بنگالی فلموں میں کام کیا۔وہ ایک بنگالی فلم کی شوٹنگ کے سلسلے میں بمبئی چلی گئی۔وہاں اُسکی ملاقات مشہور ہیروئن گیتا بالی سے ہوئی۔وہ اُسکے چہرے مہرے سے اتنی متاثر ہوئی کہ اُس زمانے کے مشہور ہدایت کار کیدار شرما کے پاس لے گئی۔کیدار شرما جوہر شناس تھا۔اُسنے مالا کو اپنی فلم ''رنگین راتیں'' میں بطور ہیروئن سائن کیا۔فلم کسی وجہ سے سیٹ پر نہیں گئی اسلئے بمبئی فلم نگری کے لئے مالاسنہا انجان ہی رہی اور واپس کلکتہ جا کر بنگالی فلموں میں کام کرتی رہی۔خوش قسمتی سے فلم فیئر میگزین کے ایک فوٹو گرافر نے کلکتہ میں اُسکی ایک تصویر لی اور اسے میگزین میں چھاپ لیا۔امیہ چکرورتی نے اُسکا فوٹو فلم فیئر میگزین میں دیکھا۔وہ اُسکی شکل وصورت سے اتنے متاثر ہوئے کہ مالا کو کلکتہ سے بمبئی بلایا اور مالاسنہا کے ساتھ تین فلموں کا معاہدہ کیا۔مالاسنہا کے پو بارہ ہوگئے۔''بادشاہ'' امیہ چکرورتی کے بینر تلے بننے والی دوسری فلم تھی۔یہ فلم امیہ چکر ورتی کی ناکام محبت کی کہانی تھی۔وہ اوشا کرن کی محبت میں گرفتار تھے۔حالات کچھ ایسے ہوئے کہ وہ ایک نہ ہو سکے۔رلا کر چل دئے ایک دن ہنسی بن کر جو آئے تھے ۔چمن رورو کے کہتا ہے کبھی وہ مسکرائے تھے۔اسی فلم کا صدا بہار گانا جسے ہیمنت کمار نے آواز بخشی تھی۔یہ گانا امیہ چکرورتی نے اپنے اوپر فلمایا تھا۔یہ فلم 1954 میں ریلیز ہوئی مگر فلم بری طرح پٹ گئی حالانکہ اس کا سنگیت کافی مقبول ہوا۔اُسے ''گورودت کے ساتھ ایک اور فلم ملی تھی جس کا نام ''سہاگن'' تھا یہ فلم بھی 1954 میں ریلیز ہوئی ۔اسی سال اُسکی ایک اور فلم ریلیز ہوئی جس کا نام ''ہیملٹ'' تھا۔فلم ''بادشاہ'' کی طرح اس فلم کا ہیرو بھی پردیپ کمار تھا۔اسی سال اُسکی مزید دو فلمیں ریلیز ہوئیں۔دونوں فلموں نے ناکامی کا منہ دیکھا۔مالاسنہا کے خواب بھی ان فلموں کی ناکامی کے ساتھ بکھر گئے۔''بادشاہ'' کی ناکامی کے ساتھ ہی امیہ چکرورتی نے مالاسنہا کے ساتھ کیا گیا معاہدہ منسوخ کر دیا اور اُسنے اپنی اگلی دو فلموں ''سیما'' اور ''کٹھ پتلی'' کے لئے نوتن اور جینتی مالا کو سائن کیا۔یہی حال فلم ''ہیملیٹ'' کا ہوا جو کہ کشور ساہو کی ہدایت میں بنی تھی۔کشور ساہو ایک کامیاب ہدایت کار تھا۔مالاسنہا اُن دنوں اتنی نازک اندام اور چھریری تھی کہ کشور ساہو کی بیوی کو اُسکے بدن کو پیڈ وں سے بھرنا پڑتا تھا۔''ہیملیٹ'' اور ''بادشاہ'' کی ناکامی کے بعد کسی فلمساز نے مالاسنہا کے گھر کا رخ نہ کیا۔وہ روز اس انتظار میں رہتی کہ کوئی نہ کوئی فلمساز یا ہدایت کار اُسے اپنی فلم میں کام کرنے کی پیشکش لے کے آئے گا مگر کوئی نہیں آیا۔''بادشاہ'' کی ناکامی سے وہ اس قدر ٹوٹ چکی تھی کہ سوائے اندھیرے کے کچھ نظر نہیں آرہا تھا۔اُن دنوں اُنکی یہ حالت تھی کہ کمرے کا کرایہ ادا کرنے کے لئے اُنکے پاس پیسے نہیں تھے۔وہ اسقدر دل برداشتہ ہوئی کہ اُسنے اپنے کپڑے لتے باندھے اور بمبئی چھوڑ کے واپس کلکتہ لوٹنے کا فیصلہ کیا۔تبھی اپنے وقت کا مشہور کامیڈین جانکی داس اُسکے لئے فرشتہ بن کے آیا۔ڈائرکٹر لیکھ راج باکھڑی اپنی نئی فلم بنا رہے تھے۔فلم کا نام تھا ''نیا زمانہ''۔جانکی داس نے ڈائرکٹر سے اصرار کیا کہ وہ مالاسنہا کی ''ہیملیٹ'' دیکھے کہ اس لڑکی نے اُس فلم میں کیا غضب کی اداکاری کی ہے، گو کہ فلم بری طرح ناکام رہی تھی مگر اسکی اداکاری کی تعریف کی گئی تھی۔لیکھ راج نے فلم دیکھی اور مالاسنہا کے کام سے اس قدر متاثر ہوئے کہ اُنہوں نے مالا سنہا کو اپنی فلم ''نیا زمانہ'' کے لئے سائن کیا۔ایک بار انڈسٹری میں یہ خبر کیا پھیلی کہ لیکھ راج نے مالاسنہا کو اپنی فلم کے لئے سائن کیا تو کئی اور فلسازوں نے بھی اُسے اپنی فلموں کے لئے معاہدہ بند کیا۔

1955 میں مالا سنہا کی تین فلمیں ریلیز ہوئیں۔فلمیں تھیں۔ ''ریاست''''ایکا دشی'' اور ''رتنا منجری''۔ہیرو تھے مہی پال اور ترلوک کپور۔یہ سی گریڈ کی فلمیں تھیں جن سے اُسے کوئی پزیرائی نہیں ملی۔1956 میں اُسکی چار فلمیں ریلیز ہوئیں۔''جھانسی کی رانی''جسمیں اُسکا ہیرو سہراب مودی تھا۔''پیسہ ہی پیسہ'' جس میں ہیرو کشور کمار تھا۔''ایک شعلہ''جسمیں وہ پردیپ کمار کے مد مقابل تھی اور ''رنگین راتیں'' جسے اُسکی پہلی فلم ہونی چاہیے تھا، چار سال بعد ریلیز ہوئی۔اس فلم کا ہیرو شمی کپور تھا جو خود جدوجہد کے دور سے گزر رہا تھا کیونکہ اُس نے اپنی کوئی پہچان نہیں بنائی تھی۔

1957 سے مالاسنہا کی زندگی کے خوشگوار دور کا آغاز ہوا۔ایس مکھر جی جو کہ ہر سال بنگالی فیسٹول مناتے تھے، گیتادت اس فیسٹول میں باقاعدہ شامل ہوتی تھی۔ گیتادت بنگالیوں کے تئیں اپنے دل میں نرم گوشہ رکھتی تھیں۔ وہ مالا کو بھی اس فیسٹول میں لے آئی اور اُسے ایک ناٹک میں کام کرنے کے لئے راضی کر لیا۔ جس دن یہ ناٹک ہونے والا تھا وہ اُس دن اپنے ساتھ اپنے شوہر گورودت کو بھی لے کے آگئی۔ گورودت اپنی فلم پیاسا کے لئے ایک لڑکی کی تلاش میں تھے کیونکہ اس رول کے لئے پہلے مدھو بالا کو چنا گیا تھا مگر کسی وجہ سے وہ اس فلم میں کام نہ کر سکی اسلئے گورودت کو کوئی ایسی لڑکی نظر میں نہیں آرہی تھی جو مدھو بالا کا بدل ثابت ہو سکے۔ گورودت مالاسنہا کے ساتھ پہلی ہندی فلم کر چکا تھا لیکن اُس فلم میں وہ گورو دت کو متاثر نہ کر سکی اُس سے مانوس ہونے کے باوجود گورودت کو اُسکا خیال نہیں آیا۔ بھلا ہو اُس ناٹک کا کہ گورودت جو لڑکی کی تلاش میں تھا اُس کے کام سے اتنا متاثر ہوا کہ اُسنے اُسے اپنی نئی فلم ''پیاسا'' میں کام کرنے کی پیشکش کی۔ فلم ''پیاسا'' میں وہ گورودت کی معشوقہ اور رحمان کی بیوی بنی تھی۔ ''پیاسا'' نے ہر طرف کامیابی کے جھنڈے گاڑ دئے۔ دوسرے اداکاروں کے ساتھ اس فلم نے اُسے بھی شہرت سے ہمکنار کر دیا۔ اُسکی اداکاری کی تعریف ہونے لگی۔ بقول مہیش بٹ مالا نے ''پیاسا'' میں جسطرح اپنی آنکھوں کو اپنے جذبات کا آئینہ بنایا تھا وہ دیدنی تھا۔ اسی سال اُسکی سات فلمیں ریلیز ہوئیں۔ جن میں ''پیاسا'' کے علاوہ پردیپ کمار کے ساتھ ''فیشن '' اور ''نیا زمانہ'' بلراج ساہنی کی ہدایت میں بننے والی پہلی فلم ''لال بتی'' جس کا ہیرو بھی بلراج ساہنی ہی تھا۔ ابھی بھٹاچاریہ کے ساتھ ''اپرادھی کون'' اور ''ایک گاوں کی کہانی'' اور راجکمار کے ساتھ سہراب مودی کی سپر ہٹ فلم ''نوشیروان عادل'' تھی ۔اس فلم کو خوبصورت دھنوں سے سی رامچند رنے آراستہ کیا تھا۔ اس فلم کو ناظرین نے کافی سراہا اور کمائی کے لحاظ سے یہ فلم بیحد کامیاب رہی۔

1958 میں اُسکی پانچ فلمیں ریلیز ہوئیں ۔''ڈیلکو'' میں اُسکا ہیرو پردیپ کمار تھا جب کہ ''چندن'' میں وہ کشور کمار کے ساتھ جلوہ افروز ہوئی۔ اسی سال وہ راج کپور کے ساتھ پردہ سیمیں پر نظر آئی ۔ فلم تھی ''پھر صبح ہوگی'' جو ڈسٹوو سکی کی فلم ''کرائم اور پنش مینٹ'' پر مبنی تھی۔ اس فلم کے لاجواب گیت ساحر لدھیانوی نے لکھے تھے جب کہ اس کی سحر آگیں موسیقی خیام نے ترتیب دی تھی۔ اس فلم میں اُسکی اداکاری کو کافی سراہا گیا۔ اسکے علاوہ ''پرورش'' بھی اسی سال ریلیز ہوئی، جس میں اُسکا ہیرو راج کپور تھا۔ اب وہ فلم نگری کے کامیاب اداکاروں کے ساتھ نظر آرہی تھی۔ اسی سال راجندر کمار کے ساتھ اُسکی پہلی فلم ''دیور بھابی'' بھی پردہ سیمیں کی زینت بنی۔

مالاسنہا بڑے بڑے ستاروں کی پسند بنتی جارہی تھی۔ بوٹے سے قد کی یہ لڑکی جو ہر طرح کے رول ادا کرنے میں ماہر ہو چکی تھی۔ 1959 کا سال اُسکے لئے ظفریابی کا سال رہا۔ اسکی ایک نہیں پانچ فلمیں ریلیز ہوئیں، اور سبھی کامیاب رہیں ۔''جعلساز'' میں وہ کشور کمار کے ساتھ مستیاں کرتی ہوئی نظر آئی، جب کہ ''اُجالا'' میں وہ شمی کپور کے مدمقابل تھی۔ شمی کپور اب سی گریڈ ہیرو نہیں تھا وہ اب ایک اسٹار تھا جسکی ہر فلم ہٹ ہو رہی تھی۔ اسی سال اُسکی ایک رومانٹک فلم ''لو میرج'' ریلیز ہوئی جس میں وہ دیو آنند کے ساتھ جلوہ گر تھی۔ پردیپ کمار کے ساتھ ایک اور فلم ''دنیا نہ مانے'' ناظرین کے دلوں کو چھو گئی۔ سب سے زیادہ جس فلم کے لئے اُسے تعریف وتوصیف ملی وہ تھی بی آر چوپڑہ کی فلم ''دھول کا پھول'' جو لیش چوپڑہ کی ہدایت میں بنی تھی اور جسمیں راجندر کمار کے علاوہ اشوک کمار بھی تھا۔ اس فلم کو لیش چوپڑہ نے دل سے بنایا تھا۔ فلم میں اسکی اداکاری کو کافی سراہا گیا۔ اصل میں وہ جذباتی رول کرنے میں جواب نہیں رکھتی تھی۔ ''دھول کا پھول'' بھی ایک جذباتی فلم تھی جس نے ریکارڑ توڑ بزنس کیا۔ اس فلم کا مشہور گانا ''تو ہندو بنے گا نہ مسلمان بنے گا، انسان کی اولاد ہے انسان بنے گا'' قومی ترانے کی طرح بجایا جاتا ہے۔

اس فلم میں دل کو چھونے والی اداکاری کے لئے اُسے 1960 میں فلم فیئر ایوارڑ سے نوازا گیا۔ اسی سال اُسکی چار فلمیں ریلیز ہوئیں۔ ''مٹی میں سونا'' جس میں اُسکا ہیرو پردیپ کمار تھا۔ ''بیوقوف'' جسمیں وہ کشور کمار کے ساتھ مزاحیہ رول میں جلوہ افروز تھی۔ ''میں نشے میں ہوں'' ایک جذباتی فلم تھی جسمیں وہ راجکپور کے ساتھ کلیدی رول میں نظر آئی۔ چوتھی فلم ''پتنگ'' تھی جسمیں جوبلی کمار یعنی راجندر کمار اُسکے مدمقابل تھا۔ یہ چاروں فلمیں کامیاب رہیں۔

مالاسنہا کے ساتھ سبھی ٹاپ کے ہیرو کام کرنے کے خواہش مند تھے۔ 1961 میں اُسکی تین فلمیں ریلیز ہوئیں۔ ''دھرم پتر'' ''مایا'' اور ''سہاگ سیندور''۔ ان تینوں میں سب سے کامیاب فلم ''مایا تھی'' جسکے ہدایت کار ڈی ڈی کشپ تھے اور اسے اپنی مدھر دھنوں سے سلیل چودھری نے آراستہ کیا تھا۔ دھرم پتر ششی کپور کی پہلی ہندی فلم تھی جو ناکام رہی، جب کہ ''سہاگ سیندور'' میں اُسکا ہیرو منوج کمار تھا۔ فلم ٹھیک ٹھاک رہی۔

1962 میں اُسکی چھ فلمیں ریلیز ہوئیں۔ سب سے زیادہ جس فلم کے لئے اُس کے کام کو سراہا گیا وہ فلم تھی ''ان پڑھ''۔ اس فلم میں اُسکا ہیرو دھرمیندر تھا۔ اصل میں یہ پوری فلم اُسی کے کردار کے گرد گھومتی تھی۔ دھرمیندر کی انٹرول سے پہلے ہی موت ہو جاتی ہے۔ اس فلم کا یہ گانا ''آپ کی نظروں نے سمجھا پیار کے قابل مجھے'' صدا بہار نغمہ ہے جسے مدن موہن نے خوبصورت دھن میں باندھا تھا۔ یہ پوری فلم مالاسنہا اپنی دم دار اداکاری کے دم پر اختتام تک لے گئی۔ فلم نے نہ صرف ریکارڑ توڑ بزنس کیا بلکہ اُسکے کام کو بیحد سراہا گیا۔ اسی سال شمی کپور کے ساتھ اُسکی ایک رومانٹک فلم ''دل تیرا دیوانہ'' ریلیز ہوئی جو بیحد کامیاب رہی۔ اسی سال اُسکی ایک اور فلم ریلیز ہوئی جس کا نام ''ہریالی اور راستہ'' تھا۔ اس فلم نے بھی کامیابی کے ڈنکے بجائے۔ اس فلم میں اُسکا ہیرو منوج کمار تھا اور اسے موسیقی سے شنکر جے کشن نے سجایا تھا۔ 1962 سے لے کر 1966 تک اُسکی بہت ساری یادگار فلمیں ریلیز ہوئیں، جن میں او پی رلہن کی

جذباتی فلم ''گہرا داغ'' تھی۔اس فلم میں اُسکا ہیرو راجندر کمار تھا۔بی آر چوپڑہ کی فلم ''گمراہ'' میں وہ اشوک کمار اور سنیل دت کے مدمقابل ایک کلیدی رول میں تھی۔اشوک کمار عمر میں اُسکے باپ کی عمر کا تھا اور وہ اس فلم میں اُسکا شوہر بنا تھا۔ ایک طرف اُسکا عمر رسیدہ شوہر تھا اور دوسری طرف اُسکا جواں سال عاشق۔وہ دونوں کے بیچ پھنسی ہے۔اُسنے اپنی اداکاری سے اس رول کو جاودانی بخشی۔جب دادامنی نے یہ فلم دیکھی تو دادامنی جیسا جید اداکار اتنا متاثر ہوا کہ اُسنے بنگالی میں اُس سے کہا۔ایکی بھالو کام کاج کر چھو یعنی کہ تم بہت اچھا کام کرتی ہو۔

مالاسنہا کو اپنی فلموں میں سب سے عزیز فلم ہے ''جہاں آرا''۔اس فلم کے پرڈیوسر اپنے وقت کے مشہور مزاحیہ اداکار اوم پرکاش تھے۔اوم جی اس فلم کے لئے مینا کماری کو لینا چاہتے تھے۔جب وہ کمال امروہی سے ملے تو اُس نے اوم جی سے معذرت چاہی کہ مینا کماری کے پاس ڈیٹس نہیں ہیں۔اوم جی اس جواب سے بڑے مایوس ہوئے۔اُنکے پاس مینا کماری کا کوئی بدل نظر نہیں آرہا تھا جو اس فلم میں کام کر سکے کیونکہ اس فلم کے مکالمے شستہ اُردو میں تھے۔ایک دن اوم جی کی ملاقات مینا کماری سے ہوئی۔مینا کماری نے اوم جی کو بھاؤ دیا کہ وہ مالاسنہا کو اس فلم میں لے لے کیونکہ وہ ہر زاویے سے ایک مسلم لڑکی لگتی ہے۔اوم جی نے مینا جی کی صلاح مان لی اور مالاسنہا جہاں آرا کے رول کے لئے منتخب کی گئی۔مالاسنہا کے لئے یہ بہت بڑا چیلنج تھا کیونکہ وہ اُردو زبان سے نابلد تھی۔اُسنے خوب محنت کی اور اپنی بہترین اداکاری سے نہ صرف اپنے شائقین اور نہ فلم کے پرڈیوسر اوم جی کو مایوس کیا۔اُس نے اس رول میں جان ڈال دی اور اس کردار کو امر کر دیا۔

مالاسنہا کی ہر طرف طوطی بولتی تھی۔ہر ہدایت کار اور اداکار اُسکے ساتھ کام کرنا چاہتا تھا۔مالاسنہا کی ایسی دھاک تھی کہ سیٹ پر کوئی اُس سے مذاق نہیں کر سکتا تھا۔وہ اپنے ساتھی کلاکاروں کے ساتھ بہت کم گھل ملتی تھی۔وہ جب سیٹ پر آجاتی تھی تو ور کر ایک دوسرے سے کہتے۔''لو گور کھن'' آگئی اور اُسکے بعد سیٹ پر سناٹا چھا جاتا تھا۔کہا جاتا ہے کہ بسواجیت اور مالاسنہا ایک دوسرے کی محبت میں گرفتار ہوئے۔دونوں چونکہ بنگالی میں ہی بات چیت کرتے تھے اس لئے دونوں بہت جلد ایک دوسرے سے گھل مل گئے۔انکی پہلی فلم تھی ''آسرا''۔اس کی فلم بندی کے دوران دونوں ایک دوسرے کے قریب آگئے۔بسواجیت اُس وقت اپنے عروج پر تھا۔بس مشکل یہ تھی کہ بسواجیت شادی شدہ تھا اور اُسکے دو بچے بھی تھے۔وہ ایک کے بعد ایک کامیاب فلم میں ساتھ آئے۔ان دونوں کی جوڑی اتنی کامیاب رہی کہ اُنہوں نے ایک ساتھ دس فلمیں کیں،جن میں ''آسرا''''نائٹ ان لنڈن''''دو کلیاں''''تمنا''''نئی روشنی''''پیار کا سپنا''''پیسہ یا پیار''''جال'' اور ''پھر کب ملوگی'' قابل ذکر ہیں۔سب سے زیادہ ''نئی روشنی'' میں اُسکے کام کو سراہا گیا۔جب یہ افواہیں اُڑنے لگیں تو مالاسنہا نے اسطرح کی خبروں کو جھوٹا قرار دیا۔اُسکا کہنا تھا کہ اُسکی کسی ہیرو کے ساتھ دوستی نہیں رہی۔وہ اپنے کام سے مطلب رکھتی تھی،باقی کچھ نہیں جب کہ حقیقت اس کے اُلٹ تھی۔وہ چاہتی تھی کہ بسواجیت اپنی پہلی بیوی سے طلاق لے جس کے لئے وہ راضی نہیں ہوا اور اسطرح اس پریم کہانی کا انجام بھی وہی ہوا جو نرگس راجکپور کی لو اسٹوری کا ہوا تھا۔

وہ چھبیس سال کی ہو چکی تھی۔اُسکے والد اُسکے پیچھے پڑے تھے کہ وہ شادی کر کے اپنا گھر بسالے۔وہ کسی فلمی اداکار کے ساتھ شادی کرنے کے حق میں نہیں تھے کیونکہ اُن کا ماننا تھا کہ فلمی لوگ بھروسہ مند نہیں ہوتے۔بہتر یہی ہوگا کہ وہ کسی پہاڑی نوجوان سے شادی کر لے۔وہ سنتی تھی اور ٹالتی تھی۔یہ وہ دور تھا جب وہ کامیابی کی معراج پر تھی تبھی اُسے ایک نیپالی فلم کی آفر ملی جس کا نام ''میتا گھر'' تھا۔چونکہ وہ نیپالی نژاد تھی اسلئے اُسنے اس فلم میں کام کرنے کے لئے حامی بھر لی۔اس کا ہیرو ایک نیپالی کاروباری تھا جس کا نام سی پی لوہانی تھا۔وہ ایک دم نیا تھا جب کہ مالاسنہا ایک منجھی ہوئی اداکارہ تھی۔انکی پہلی ملاقات ''میتا گھر'' کے سیٹ پر ہوئی۔اس فلم کے مختلف شوٹنگ شیڈول نیپال کی حسین وادیوں میں مکمل ہوئے۔ان آوٹ ڈور شوٹنگ شیڈول میں مالاسنہا کا دل لوہانی پر آگیا۔جب وہ بمبئی واپس لوٹی تو اُسنے لوہانی کو ایک خط لکھا جسمیں اُسنے اپنے پیار کا اظہار کیا تھا۔لوہانی اتنی بڑی اداکارہ کا خط پا کر اچنبھے میں رہ گیا۔وہ خواب میں بھی سوچ نہیں سکتا تھا کہ مالاسنہا کو اُس سے پیار ہو جائے گا۔لوہانی کی فلم 1966 میں ریلیز ہو چکی تھی اور وہ نیپال میں بیحد مقبول ہو چکا تھا۔اس کے بعد وہ ایک دوسرے سے ملنے لگے۔لوہانی کو مالا کے والد بھی پسند کرنے لگے تھے۔ایک دن اُنہوں نے فیصلہ کیا کہ وہ شادی کے بندھن میں بندھ جائیں۔لوہانی نے یہ شرط رکھی کہ وہ شادی کے بعد فلمی دنیا کو خیر باد کہہ دے گی۔مالاسنہا نے اُسکی یہ شرط مان لی اور فلموں سے تیاگ لے لیا۔

کہتے ہیں کہ چھٹتی نہیں ہے منہ سے یہ کافر لگی ہوئی۔وہ نیپال کی وادیوں میں بے چینی محسوس کرنے لگی۔اس بیچ اُسکے والد کا انتقال ہوا تو وہ اپنے آپ کو ایکدم اکیلی محسوس کرنے لگی۔اسی دوران اُسے فلموں کے آفرس ملنے لگے۔اُسکے شوہر لوہانی کو لگا کہ جل کی مچھلی جل کے بنا نہیں رہ سکتی یعنی وہ فلموں کے بنا نہیں رہ سکتی اسلئے اُسنے اُسے کام کرنے کی اجازت دے دی۔وہ ایک کے بعد ایک فلموں میں کام کرنے لگی۔فرق صرف اتنا تھا کہ اب وہ بطور ہیروئن نہیں بلکہ ایک معاون اداکار کے رول کرنے لگی تھی۔ستر سے لے کے اسی کی دہائی تک اُسکی جو فلمیں ریلیز ہوئیں اُن میں ''چھتیس گھنٹے''''زندگی'' اور ''کرم یوگی'' قابل ذکر ہیں۔

مالاسنہا کو بہت سارے اعزازات سے نوازا گیا۔اُسنے اب تک چار بار فلم فیئر ایوارڈ میں نامزد کیا گیا۔فلمیں ہیں۔''دھول کا پھول'' 1960 ''بہورانی'' 1964 ''جہاں آرا'' 1965 ''ہمالیہ کی گود میں'' 1966۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ ہر بار وہ اعزاز سے محروم رہ گئی جسکا اُسے ہمیشہ افسوس رہا۔'' پیاسا'' میں وہ اسلئے اعزاز سے محروم رہی کہ اُسکے رول کو منفی رول مانا گیا اسلئے اُسے ایوارڈ نہیں ملا جب کہ حقیقت یہ نہ تھی۔آخر کار اُسکی دیرینہ حسرت 2018 میں

پوری ہوئی جب اُسے فلم فیئر کی طرف سے ''لائف اچیومینٹ'' ایوارڈ سے نوازا گیا۔

مالاسنہا نے سو سے زائد فلموں میں کام کیا جن میں ''پیاسا'' ''ان پڑھ'' ''دل تیرا دیوانہ'' ''گمراہ'' ''بہورانی'' ''گہرا داغ'' ''اپنے ہوئے پرائے'' ''جہاں آرا'' ''ہمالیہ کی گود میں'' ''نئی روشنی'' ''آنکھیں'' ''مریادا'' اور ''بابو'' ایسی ناقابل فراموش فلمیں ہیں جنمیں مالاسنہا نے اداکاری کی بلندیوں کو چھولیا تھا۔

مالاسنہا کا محبوب اداکار راجکپور رہا ہے جب کہ من پسند ہیروئینوں میں نرگس اور ودیا بالن ہیں۔ اُنکی پسندیدہ گلوکارہ لتا منگیشکر ہے۔ مالاسنہا کو دادا صاحب پھالکے ایوارڈ کے لئے نامزد کیا گیا تھا لیکن اُسنے یہ اعزاز لینے سے انکار کر دیا۔ وجہ یہ تھی کہ اُسکا نام دیگر ایوارڈ نامزدگان کے ساتھ شائع نہیں کیا گیا تھا۔ بہت کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ مالاسنہا کو ہالی وڈ کی فلموں میں کام کرنے کی آفر ملی تھی جو اُسکے والد نے ٹھکرادی تھی۔ اُسکے والد اُسکا بزنس دیکھتے تھے۔ اُنکا یہ ماننا تھا کہ ہالی وڈ کی فلموں میں ہیروئن کے جسم کا جسطرح استحصال کیا جاتا ہے وہ نہیں چاہتے کہ اُنکی بیٹی کو بھی اُس تکلیف دہ مرحلے سے گزرنا پڑے۔ مالاسنہا ''ڈیرنگ دیوا'' یعنی دلیر دیوی کے نام سے مشہور تھی۔ اسکی وجہ یہ تھی کہ وہ ایسے رول چنتی تھی جنہیں کرنے کے لئے کوئی دوسری ہیروئن تیار نہیں ہوتی تھی۔ جیسے بن بیاہی لڑکی کا ماں بننا۔ یا شادی شدہ ہو کے دوسرے مرد سے جنسی تعلقات رکھنا۔ ایسے رول کرنے کے لئے حوصلہ چاہیے جو بہت کم اداکاروں میں ہوتا ہے۔ مالاسنہا اس طرح کے رول بخوشی قبول کرتی تھی کیونکہ اُسے اپنے کام پر بھروسہ تھا۔ وہ کسی امیج کی قیدی بن کر نہیں رہی۔

مالاسنہا آجکل اپنے شوہر کے ساتھ نیپال میں رہتی ہے۔ اُسکی ایک بیٹی ہے جس کا نام پرتھیبا ہے۔ مالاسنہا نے وہ سب کچھ پالیا جسے پانے کی ہر انسان تمنا کرتا ہے۔ وہ آجکل فلموں سے دور ایک خاموش زندگی گزار رہی ہے۔

- بقیہ -

روشن صدی کی بات

دلچسپ معلوماتی فکر انگیز بلکہ عبرت انگیز بھی ہے جہاں حسن فطرت کا تذکرہ ہے تو مقامی علاقے میں جاری رہنے والے ظلم و جور کی داستان بھی ہے چشم کشا۔ کتاب کا سن اشاعت ہے ۲۰۱۹ اس لئے یہاں عہدرواں کے حوالے سے واقعات کا اور اہل سیاست کا ذکر ہے۔ کتاب ایک فرد سے ہٹ کر بھی تین چار نسلوں کی کہانی کہہ رہی ہے۔ اس کثیر الجہاتی کی وجہ سے اس پر سرسری باتیں کرتے وقت آدمی باآسانی طول کلام کا مرتکب ہوسکتا ہے اور شاید راقم الحروف بھی ہو چکا ہو اس لئے ہم مصنف کو مبارکباد کہتے ہوئے رخصت ہوتے ہیں۔ کتاب الفیصل ناشران تاجران کتب اردو بازار لاہور نے نہایت عمدہ طور پر چھاپی ہے۔

حاشیہ ۱۔ اوپر صفحہ اول پر جس کتاب کا حوالہ موجود ہے وہ ہے علامہ سلیمان منصور پوری صاحب کی '' تاریخ المشاہیر'' ہمارے نزدیک دلچسپ۔ مختصر اور جامع جو مشتمل ہے صرف مسلم اکابرین کے بارے میں سوانحی مضامین پر اور ان میں بھی یہ اہتمام موجود ہے کہ وہ ان شخصیات کی مخصوص و منفرد ذاتی خصوصیات میں سے کسی ایک عادت خصوصیت یا وصف کے اظہار پر اکتفا کرتے ہیں۔ ان اکابرین میں جو منتخب کی گئی شخصیتیں ہیں اُن میں شامل ہیں کتاب کے مطابق یہ عنوانات۔ آئمہ و علماء۔ مشائخ و اصفیا۔ ملوک و وزراء اور شعراء و ادباء۔

دھرنا ہے۔۔۔

بند ہیں سارے رستے، شہر میں دھرنا ہے
آج نہیں مل سکتے، شہر میں دھرنا ہے

بے سوچے سمجھے کیوں گھر سے نکلے تم
اتنا دھیان تو رکھتے، شہر میں دھرنا ہے

گلی گلی میں ہُو کا عالم پھیلانے
میرے ہنستے بستے شہر میں، دھرنا ہے

○

جنید آزر
(اسلام آباد)

رس رابطے

جستجو، ترتیب، تدوین

وجیہہ الوقار (راولپنڈی)

مدیر محترم، سلام ورحمت۔

آپ کی عنایت سے ''چہارسو'' کچھ عرصے سے باقاعدگی سے موصول ہوتا رہا ہے۔ شروع سے ہی آپ کی لگن اور محنت کی معترف رہی ہوں جبکہ اور رسالے یہاں نہیں پہنچ رہے ہیں۔ ''چہارسو'' برابر ملتا رہا ہے۔ بس اس بار ہی مشکلات زیادہ بڑھنے کے سبب سافٹ کاپی آ سکی۔ آپ کی مجلس مشاورت میں قارئین چہارسو اور زرسالانہ کے تحت ''دل مضطرف نگاہِ شفیقانہ'' بڑے منفرد اور لطیف جذبات کے آئینہ دار ہیں۔ خدا کرے چہارسو کو فروغ حاصل ہو۔

حالیہ شمارے میں آپ نے راقم الحروف کو قرطاسِ اعزاز سے نوازا۔ اس عزت افزائی کے لیے آپ کی ممنون ہوں اور تہہ دل سے شکریہ ادا کرتی ہوں۔ بس کوائف میں جو میں نے آسانی کی وجہ سے انگریزی میں بھیجے تھے کچھ غلطیاں ہیں شاید ترجمہ کمپیوٹر نے کیا ہے۔ باقی بہت خوب ہے اور آپ کی مدیرانہ نگاہ کا آئینہ دار۔ میرے جوابات اور (بقول آپ کے) لہجے سے جو وسوسے آپ کے ذہن میں پیدا ہوئے ان کا اظہار اگلے شمارے میں کر دیں۔ مزید ممنون ہوں گی۔ چہارسو یہاں خاصہ مقبول ہے اور لوگوں تک پہنچ رہا ہے۔ اس کا احساس اس مرتبہ بخوبی ہوا۔ محترمہ رینو بہل کے ساتھ کئی لوگوں نے مجھے سافٹ کاپی بھجوائی۔

آپ کا اداریہ ہمیشہ کی طرح پُر مغز ہے۔ دو افسانے پڑھے ایک محترمہ شہناز خانم عابدی کا ''زریاب'' اور دوسرا محترمہ رینو بہل کا ''رشتوں کی کربلا''۔ زریاب کا موضوع خوب ہے۔ زبان بھی رواں اور سلیس ہے لیکن موضوع کا ٹریٹمنٹ اور رپورٹ یا کسی معلوماتی (Informative) مضمون جیسا ہو گیا ہے۔ کہانی پن کا فقدان ہے۔ اگر محترمہ عابدی دھیان رکھیں تو بہت اچھے افسانے پیش کر سکیں گی۔

آج کل جو موضوعات بہت اٹھائے جا رہے ہیں جیسے کرائے کی کوکھ، فرقہ پرستی، لڑکیوں کا حمل میں مار دیا جانا بظاہر محسوس ہوگا کہ یہ بار بار تحریروں میں آ رہے ہیں لیکن ان کے اتنے پہلو ہیں کہ یہ کافی عرصے تک تازہ رہیں گے۔ ہر افسانہ ایک نیا پہلو لے سکتا ہے اور رینو بہل صاحبہ نے بیشک ایک نئے پہلو سے روشناس کرایا ہے۔ پورے افسانے میں کہانی پن برقرار ہے۔ بس ایک کمی ہے وہ یہ کہ تیسرے بچے کا سروگیٹ ماں سے مشابہہ ہونا اگر اس طرف اشارہ کرتا ہے کہ عورت پہلے سے حاملہ تھی (درد بھی پہلے شروع ہوتے ہیں) تو یہ بات حقیقت کے مطابق نہیں ہے۔ ایسا ہونا فطرت کے اصولوں کے منافی ہے۔ سروگیٹ مائیں کافی پہلے سے بڑی چھان پھٹک سے گزرتی ہیں۔ بالفرض محال ایسی صورت میں بارآور بیضہ (Tertidised Ova) داخل کر دیا جاتا ہے تو وہ نشو نما پائے گا۔ اس ایک جھول کے قطع نظر ان غریب، ضرورت مند عورتوں کے حالات اور نفسیاتی کیفیات کی ترجمانی بہت عمدہ اور موثر ہے۔

اس سے قبل ڈاکٹر فیروز عالم صاحب پر آپ کا خصوصی گوشہ تھا۔ میرے دل میں ان لوگوں کے لیے خاص احترام ہے جو کسی مختلف شعبے میں ہونے کے باوجود اردو ادب سے شغف رکھتے ہیں اور اسے اظہار کا ذریعہ بناتے ہیں۔ آپ کے یہاں ڈاکٹر آصف فرخی اور اجمل کمال ایسے ہی لوگوں میں ہے۔ فیروز عالم صاحب سے متعارف ہو کر بہت خوشی ہوئی۔ ان کا مضمون ''چمکتی چاندنی'' معلومات افزا ہے اور بھاچپ بہت دلچسپ۔ میں ایک صاحبہ کو جانتی ہوں جو بچپن میں بھائی جان۔۔۔۔۔ ان کے بڑے بھائی پر یہ عافیت ایسی چسپاں ہوئی کہ ہمیشہ رہ گئی۔ ابھی ان کا انٹرویو پڑھنا باقی ہے۔ مصروفیات بہت ہیں اور چہارسو نہایت وقیع۔

سلامت رہیے۔ اردو کی خدمت یونہی کرتے رہیے۔ میری دعائیں آپ کے ساتھ ہیں۔

ذکیہ مشہدی (پٹنہ)

جانِ برادر، سلام ورحمت۔

ہر بار کی طرح اس بار بھی آپ نے ''چہارسو'' ستمبر، اکتوبر مرحمت فرما کر کرم فرمائی کی جس کے لیے شکر گزار ہوں۔ ہمیشہ کی مانند اس بار بھی میں اور میرے رفقا چہارسو سے فیض یاب ہوں گے۔ آپ جس استقامت کے ساتھ چہارسو جیسا معیاری رسالہ نکال رہے ہیں اُس کی مثال اردو دنیا میں کم کم ملتی ہے۔ توجہ، لگن، محنت اور ایثار و قربانی کے بغیر یہ کام سراسر گھاٹے کا سودا ہے مگر آپ نے گھاٹے کے اس سودے کو زندگی کا مضمون بنا کر عمدہ مثال قائم کی ہے۔

افتخار عارف (اسلام آباد)

گلزار جاوید صاحب، السلام علیکم۔

''چہارسو'' کا تازہ شمارہ حسبِ سابق کمپیوٹر پر پڑھنے کا موقع ملا۔ محترمہ ذکیہ مشہدی کے لیے قرطاسِ اعزاز عمدگی سے سجایا گیا ہے۔ آپ کے تحقیقی و تنقیدی سوالات کے تُرکی بہ تُرکی جوابات پڑھ کر خاصا لطف آیا۔ آپ کی ہمت اور حوصلے کو داد دینا چاہیے۔ آپ کی جگہ کوئی اور مدیر ہوتا تو زیرِ نظر گفتگو کا کچھ نہ کچھ حصہ ضرور حذف کر دیتا۔ ذکیہ مشہدی صاحبہ کی لگی لپٹی کے بغیر مسلسل گفتگو اور اپنے تئیں بے پایاں اعتماد کم کم دیکھنے کو ملا ہے۔ چہارسو کی کامیابی اور درازیٔ عمر کے لیے دلی دعائیں اور نیک تمنائیں پیش کرتا ہوں۔

مرزا حامد بیگ (لاہور)

محترم گلزار صاحب

چہارسو کا تازہ شمارہ بنام محترمہ ذکیہ مشہدی وصول ہوا۔ حسبِ سابق آپ نے انکے متعلق بڑی محنت اور خلوص سے معلومات جمع کی ہیں جو قارئین کے

لئے بہت مفید ہونگی میں ان کے نام سے تو کئی دہائیوں سے واقف تھا پھر بھی اردو کہانی کا بانکپن کے عنوان سے انعام الحق صاحب نے جو معلومات فراہم کی ہیں وہ بہت ہی متاثر کن ہیں۔شمارہ اپنے مشمولات کے لحاظ سے باوقار ہے مگر نہ جانے کیوں مجھے براہ راست پڑھ کر کچھ تلخی کا احساس ہوا۔ایسا لگتا تھا کہ سوال و جواب کے دوران جو باہمی محبت اور خوش خلقی کا ماحول ہوتا ہے اسکا فقدان تھا۔

الطاف فاطمہ کی نگارشات اور انکا نام بڑے عرصے کے بعد میری نظر سے گذرا۔وہ اردو ادب میں ایک یکتا نام ہیں اور انکا ناول ''دستک نہ دو'' جسے اچھے زمانوں میں آدم جی ایوارڈ بھی ملا تھا اور میں نے اسے بہت زوق وشوق سے پڑھا تھا۔نوید سروش کا مہمان، عقیل دانش صاحب کا نوک قلم بھی خوب تھا۔میرے بڑے بھائی یوگندر پال کی نظم، رینو کا افسانہ حسب دستور گرفت میں لے لیتا ہے۔سیما پیروز منجھی ہوئی قلمکار ہیں، وہ اور سلمی اعوان برابر اردو ادب کی آبیاری کر رہی ہیں۔ڈاکٹر ریاض کچھ عرصے سے غائب ہیں۔اللہ کرے چہارسو کی محفل اسی طرح آب وتاب سے قئم رہے۔

فیروز عالم (کیلی فورنیا)

عزیزم گلزار جاوید صاحب، سلام مسنون۔

آپ کی بہت نوازش چہارسو بہت باقاعدگی سے مل رہا ہے۔سچ تو یہ ہے کہ اِس عمدہ خالص ادبی پرچہ کو آپ جس لگن اور اہتمام سے شائع کر رہے ہیں آپ کی ہمت کو سلام ہے۔قرطاس اعزاز چہارسو کا اپنا منفرد سلسلہ ہے۔ ہندوستان کے بہت نامور ادیبوں سے میرا تعارف اسی سلسلے کی وساطت سے ہوا۔ اردو ادب کی اِن قابل فخر ہستیوں کی تخلیقات کو پھر میں نے ڈھونڈ ڈھونڈ کر پڑھا۔تمام پرچے میں نے سینت سینت کر رکھے ہوئے ہیں۔

رسالے کا ایک صفحہ بھی کسی اشتہاری پیسے کا ممنون احسان نہیں۔ ہلکا پھلکا مگر ادبی جواہر پاروں سے سجا بھاری بھرکم پرچہ بہت باقاعدگی سے شائع ہوتا آپ کے اپنے شوق، لگن، توجہ اور جیب کی عنایت سے ادب کے پیاسوں کو نصیب ہوتا ہے۔سلامت رہیں۔شاد رہیں۔

سلمٰی اعوان (لاہور)

محترم گلزار جاوید صاحب' آداب اور احترام

ذکیہ مشہدی نمبر ملا، بہت شکریہ۔اس شمارے میں پڑھا تو بہت کچھ مگر لکھنے بیٹھا تو براہِ راست کے ابتدائیے سے آگے نہیں بڑھ پا رہا۔یہ تخلیق کاری جو خود بڑا بے رحم عمل ہے،اس کے نابغہ روزگار کیا کریں، بقول شبنم رومانی صاحب ''اک دل آزار مسیحا'' ہوتے ہیں، گو یہ انھوں نے زندگی کے لیے کہا تھا مگر کیا کریں، زندگی کو لکھتے لکھتے ہم اسی کی زبان بولنے کے عادی ہو جاتے ہیں۔کسی سرجن کے ہاتھ کے نشتر سے تکلیف ہوتی ہے تو بھی ہسپتال کو چھوڑا تو نہیں جاتا۔میں انٹرویو پڑھ کر آپ کے احساسات کا اندازہ کر سکتا ہوں لیکن میری ناچیز رائے میں اسے اوکھلی میں دیے سر کی طرح سمجھ لینے میں کوئی حرج شاید نہ ہو۔انٹرویو دلچسپ تھا۔بعض جگہ لگا کہ ''گویا یہ بھی میرے دل میں ہے''، بعض جگہ حسرت رہی جاننے کی کہ کیا دل میں ہے اور بعض جگہ سوچنے کی دعوت ملی جو انٹرویو کی کامیابی کی دلیل ہے۔رہی بات کہیں کہیں یہ سوچنے کی کہ کیا انٹرویو کرتے رہنا چاہیے تو یہ انٹرویو اس بات کے حق میں ایک مضبوط دلیل ہی تو ہے۔جی بالکل کرتے رہنا چاہیے۔بلکہ اگر میں کہوں کہ آپ کے بھرپور سوال بھی نشتر کا مزہ رکھتے ہیں تو شاید غلط نہ ہو۔آپ نے بعض الفاظ حذف نہیں کیے، یہ آپ ہی کا حصّہ ہے اور بہت اچھا کیا۔میں اس میں بھی مثبت پہلو دیکھ رہا ہوں اور ذکیہ مشہدی صاحبہ روانی میں لکھ گئیں۔مجھے تو اگلے شمارے میں آپ کے اگلے انٹرویو کا انتظار رہے گا۔

اس بار کے شمارے میں بعض اشعار مزیدار تھے البتہ غزل کے دوسرے حصے میں بعض محلِ نظر بھی تھے۔شریف شیوہ صاحب کی نعت بہت خوب ہے۔سبحان اللہ۔

فیصل عظیم (کینیڈا)

گلزار جاوید صاحب، السلام علیکم۔

''چہارسو'' کا تازہ شمارہ ملا۔پہلی نشست میں ذکیہ مشہدی سے آپ کا مکالمہ پڑھا۔آپ نے ان سے عصرِ حاضر کے ادب بالخصوص افسانے کے حوالے سے فکر انگیز سوالات کیے ہیں۔بعض پر انہوں نے خموشی اختیار کیے رکھّی۔ کشمیر اور ہندتوا کے متعلق آپ نے ان سے کوئی سوال نہیں کیا۔ہوسکتا ہے ان کا جواب بھی خموشی ہی کی صورت میں آتا۔

''ملکی رام لاہوریہ'' ایک نہایتا جذباتی افسانہ ہے۔یہ حقیقت ہے کہ وہ سکھ اور ہندو جو تقسیم سے پہلے لاہور میں پیدا ہوئے یہاں سے ہجرت کے بعد بھی ان کی کچھ جذباتی تحریریں متعدد بار نظروں سے گزری ہیں۔لاہور ایک ایسا سحر ہے جو بعض مقامات پر دلّی اور لکھنؤ سے بھی آگے نکل جاتا ہے۔

دیپک کنول کا میدان غالباً ہندوستان کی فلم نگری ہے۔جانے کہاں کہاں سے وہ ہیرے ڈھونڈ کے لاتے ہیں۔مدھوبالا پر انہوں نے بڑا عمدہ مضمون لکھا ہے۔انیس امروہی نے ہندوستان کی فلمی دنیا کے عظیم کرداروں پر تین کتابیں تحریر کی ہیں۔''پس پردہ'' اور ''وہ جن کی یاد آتی ہے'' انٹرنیٹ پر دیکھی ہیں لیکن تشنگی سی محسوس ہوئی۔دیپک کنول نے اگر اس موضوع پر کوئی کتاب لکھی ہے تو وہ یقیناً عمدہ ہوگی۔

ہارون الرشید (بالاکوٹ)

محترم گلزار جاوید صاحب، السلام علیکم۔

''چہارسو'' ستمبر اکتوبر ۲۰۱۹ء اردو ادب کی کہنہ مشق افسانہ نگار اور ماہر نفسیات ذکیہ مشہدی سے موسوم ہے جن کی فکری وابستگی اور سنجیدگی ان کی تحریروں سے عیاں ہوتی ہے۔ایک حساس دل کی باریک بینی سے اردگرد کے ماحول اور واقعات کا گہری نظر سے مشاہدہ ان کے بیشتر افسانوں کا امتیازی پہلو ہے۔اردو ادب کے حوالے سے وہ اپنی قابل قدر خدمات ہر مختلف اداروں کی جانب سے

''چہارسُو''

اب تک سات اعزازات وصول کر چکی ہیں۔اسی شمارہ میں ان کا افسانہ ''انگوٹھی'' ان کی دلچسپ طرزِ تحریر کی ایک خوبصورت مثال ہے۔''چہارسو'' میں ان کا گوشہ آپ کی ادب شناسی اورادب پروری کا ثبوت ہے۔

شمارہ میں بہت اچھے افسانے شامل کیے گئے ہیں۔رینو بہل کا افسانہ ''رشتوں کی کربلا'' انوکھی اور دلچسپ تحریر ہے جو حقیقی واقعات کا دل اداس کرنے والا منظر نامہ محسوس ہوتا ہے۔غربت اور مجبوری انسان کو کیسے کیسے مشکل کام کرنے پر مجبور کر دیتی ہے۔دوسری طرف کہانی میں ان لوگوں کے مسائل کا ذکر اور انوکھا حل بیان کیا گیا ہے جن کے ہاں اولاد نہیں ہوتی اور جو بچہ گود بھی نہیں لینا چاہتے یا جو اولاد کی دولت سے مالا مال ہیں مگر انہیں زندگی کی ضروریات مہیا کرنے کی استطاعت نہیں رکھتے۔

شہناز خانم عابدی کا افسانہ ''زریاب'' تکنیکی اور جذباتی پہلوؤں کو بہت مؤثر انداز میں بیان کی گئی ایک لاجواب اور قابل تعریف تحریر ہے جس پر حقیقت کا گماں ہوتا ہے۔سیما پیروز کی تحریر کردہ کہانی ''زبیدہ لاج'' میں تصور کی آنکھ سے جو تصویر کشی کی گئی ہے قابل تحسین اور ایک حقیقی واقعہ کا منظر نامہ محسوس ہوتا ہے۔انسان کا اثاثہ ماضی ہی کے گزرے ہوئے لمحات ہوتے ہیں جن کے نقوش گاہے بہ گاہے نظروں کے سامنے آ کر کبھی اداس کر دیتے ہیں تو کبھی سوچوں میں گم۔کہانی پڑھتے ہوئے قاری محسوس کرتا ہے جیسے وہ تمام مناظر اور واقعات کا چشم دیدہ گواہ ہو۔کہانی کا انجام دلچسپ اور مغربی دنیا کی پراگندہ زندگی اور حالات کی عکاسی کرتا ہے۔پرویز شہریار کا افسانہ ''ملکی رام لاہوریہ'' فوزیہ ملک کا ''خالی ہاتھ'' اور ڈاکٹر محمد جمیل کا ''واپسی'' بھی بہت دلچسپ اور خوبصورت تحریریں ہیں جو واقعاتی، جذباتی اور پراسرار واقعات پر بالترتیب مشتمل ہیں اور قاری کو گرفت میں لے لیتی ہیں۔مامون ایمن نے پروین شیر پر ادب کے حوالے سے بہت عمدہ تحریر رقم کی ہے جو:

میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

ڈاکٹر فیروز عالم نے آگاہی کے لیے طبی معلومات کا عام فہم آسان اردو میں جو سلسلہ شروع کر رکھا ہے قابل ستائش ہے۔اس بار انہوں نے ''اولاد سے محرومی'' کے موضوع پر مضمون لکھا ہے۔امید ہے وہ طبی معلومات کا یہ مفید سلسلہ جاری رکھیں گے۔

شاعری میں حافظ عنایت اللہ ناگپوری، نصیر ترابی، رؤف خیر، ڈاکٹر قاسم جلالی، حنیف باوا، ساحر لدھیانوی، ڈاکٹر یوگیندر بہل تشنہ، یونس شرر، مشیر طالب، تسنیم کوثر اور عبداللہ جاوید کے کلام متاثر کن ہیں۔

حج ایک مذہبی فریضہ ہے جس کی ادائیگی کے لیے دنیا کے بیشتر ممالک سے مسلمان مقررہ دنوں میں مکہ مکرمہ پہنچ کر حج کے روحانی ثمرات سے فیض یاب ہوتے ہیں جو ہزاروں لاکھوں لوگوں کی زندگی میں مثبت تبدیلی کا باعث بنتے ہیں۔مذہبی فرائض اور عبادات نہایت حساس اور جذباتی مسئلہ ہے جو ہر فرد کی ذات اور اس کے رب کے درمیان باہمی تعلق کا مظہر ہوتا ہے اور کوئی فرد نہیں جانتا کہ اس کے بارے میں رب کا آخری فیصلہ کیا ہوگا۔اس پسِ منظر میں ''حج پہ حج'' کے عنوان سے جو طنزیہ نظم شائع ہوئی ہے نہایت تکلیف دہ ہے جسے پڑھ کر دکھ ہوا۔

''ایک صدی کا قصہ'' میں اس بار پشاور کے پی کے سے تعلق رکھنے والے دو نامور اداکاروں یوسف خان (دلیپ کمار) اور ممتاز (مدھو بالا) کا تفصیل سے تذکرہ کیا گیا ہے جو بہت معلوماتی اور دلچسپ ہے۔آپ کی اس تمام ادبی کاوش پر دلی مبارک باد پیش کرتا ہوں۔

ڈاکٹر ریاض احمد (پشاور)

مدیرِ محترم، سلام مسنون۔

''چہارسو'' کا موجودہ شمارہ محترمہ ذکیہ مشہدی کے قرطاسِ اعزاز سے مزّین، مختلف النوع مضامین، افسانوں، ادب پاروں، سخنورانہ پیرایوں، رابطوں اور مختصر مختصر سے آراستہ و پیراستہ ہے۔حسنِ ادارت کے اس اسلوب سے ہر کوئی حسبِ ذوق و توفیق استفادہ کر بھی سکتا ہے اور دوسروں کو مستفید ہونے کا موقع بھی فراہم کر سکتا ہے۔

بھلے آپ اسے ہم جیسے بعض قارئین کی کم علمی یا لاعلمی پہ ہی محمول کیوں نہ کیجیے مگر یہ بھی مبالغہ آرائی نہ ہوگی کہ اپنے کرشمۂ قلم سے آپ کئی گمناموں کو ناموروں میں اور کئی بیابانوں کو گلزاروں میں تبدیل کیے دیتے ہیں۔گزشتہ شماروں سے ماخوذ ماں بولی کے ماتھے کا جھومر، جشنِ بیقراری، ایمالائی ڈوسس اور مزاح کا ڈاکٹر عبدالقدیر خان سے متعلق توصیفی تاثرات بھی پوسٹل سروس کے کجروی کی نذر ہو گئے۔

تسنیم کوثر صاحبہ نے کمال تاریخی تناظر سے ذکر کیا۔کیا بات ہے کچھ لمحوں کے لیے گزرے وقتوں کے ورق پلٹنے سے لگے ذکر میرا مجھ سے بہتر کہ۔۔۔

ہیومن سائیکی کا یہ المیہ اور طربیہ بھی ہے کہ جسے یاد رکھنے کی کوشش کرتے ہیں اُسے تو بھول جاتے ہیں مگر جسے بھلانا چاہتے ہیں وہ لاشعوری طور پر یاد رہ جاتا ہے کچھ ایسی ہی متصادم و متضاد کیفیات کے لیے شاید میر تقی میرؔ کہہ گئے:

یاد اُس کی اتنی خوب نہیں میرؔ باز آ
نادان پھر وہ جی سے بھلایا نہ جائے گا!

شگفتہ نازلی (لاہور)

بہار آفریں پیارے گلزار جاوید، السلام علیکم۔

''چہارسو'' بہار گلزار کے سروساماں لے کر جلوہ دے رہا ہے۔مضمرات کی خوشی سے دل سرشار ہے۔اب کے آپ نے پروفیسر ہارون الرشید کی رونق بھی لگا رکھی ہے۔آپ جانیں ہارون الرشید بلند پایہ شاعر ہیں انہیں احمد ندیم قاسمی ''فنون'' میں بڑا مقام دیتے تھے۔ان کا شمار اساتذہ میں ہوتا ہے۔ہر بحر کے شناور ہیں، رباعی بھی کہتے ہیں۔کشمیر کے حالات سے دل گرفتگی ہے۔دعا ہے کہ

اللہ تعالیٰ ہمارے کشمیری بھائیوں کو ظالموں کے شکنجے سے آزاد کرے۔ کشمیر کے خصوص میں تحریریں دل گداز ہیں۔ آنسوؤں سے موتی موتی لکھی گئی ہے۔ آپ نے میری غزل کو عزت دی ہے۔ مثنوی گلزارِ نسیم کی بحر کی اس غزل کے مطلع کا دوسرا مصرع اور طرح کا ہے آخر پر ''ہے'' کی جگہ ''کا'' لکھا گیا ہے۔ قافیہ اور ردیف سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں ''ہے'' ہونا چاہیے۔ دیپک کنول صاحب نے مدھوبالا کی درد بھری کتھا سنائی ہے دل پارہ پارہ ہوا جاتا ہے۔ دلیپ کمار (یوسف خان) کی محبت کی کہانی دردناک ہے۔ قسمت کا کھیل ہے میل نہیں ہوا جدائی ہوگئی۔ مدھوبالا کی قبر پر دلیپ کمار کا ماتم اور بھی روح فرسا ہے۔ دلیپ کمار بیمار تھے اُن کی خیریت معلوم نہیں ہوسکی۔ ''چہارسُو'' کی تحریروں کا متنوع لائق تقلید ہے۔ خدا اسے سلامت رکھے۔

آصف ثاقب (بوئی، ہزارہ)

ڈیئر گلزار جاوید صاحب، سلام مسنون۔

گلزار بھائی ندامت سے لکھ رہا ہوں۔ میں بائی پولر ہوں میرا ذہن ماؤف ہوجاتا ہے پھر لکھ نہیں سکتا۔ یادداشت کمزور پڑ جاتی ہے۔ میرے استاد ابن صفی کو بھی دوبار ذہنی ہسپتال میں رہنا پڑا تھا۔ یہ بے مروتی نہیں ذہنی بیماری ہے۔ کہتے ہیں کہ دماغ میں کیمیکلز کے غیر متوازن ہونے سے ہوتا ہے۔ میں نے اپنے بزرگوں سے پوچھا تھا کہ پرانے گیتوں راگ راگنیوں دیپک ملہار میں ایسی شکتی کیوں ہے؟ انہوں نے بتایا کہ ان میں فنکار کی روح بھی شامل ہوتی ہے۔ میرے افسانوں میں میری روح شامل ہوتی ہے یہی سبب ہے کہ میں کم کم لکھتا ہوں۔

ذکیہ مشہدی کو کافی دنوں سے پڑھ رہا ہوں۔ بہت ہی اچھا لکھتی ہیں۔ شکر ہے کہ چہارسو ایسے ہیرے موتی نکال لاتا ہے۔ تابش خانزادہ سے دوستی ہوگئی ہے۔ کیا غضب کا ناول نگار ہے۔ منظر کشی جزئیات نگاری کا بادشاہ ہے۔ میرا خیال تھا کہ سپیروں کے کسی قبیلے کا فرد ہے۔ وہ تو ڈاکٹر نکلا۔ ذکاہ الرب رباب کا میں عاشق تھا۔ الٹے سیدھے سوال بھی کیا کرتا۔ انہوں نے ہی بتلایا کہ وہ کسی سپیرن کی محبت میں گرفتار ہوکر سپیروں کے ساتھ ہی رہنے لگے تھے۔ ان کی تحریر میں ایسی طاقت وسچائی تھی کہ میں اُن کے سر ہوگیا کہ یہ ایک سچی کہانی ہے۔ جبکہ تابش خانزادہ سے میں کچھ اگلوانے میں کامیاب نہ ہوسکا۔ ٹانسلز کی مانند محبت تو کسی کو بھی ہوسکتی ہے۔

ڈاکٹر فیروز عالم بڑے سادہ مدھر مدھر انداز میں بغیر اصطلاحات کے لکھے جاتے ہیں۔ بڑے بڑے اہم مسائل ان دیکھی بیماریوں کا علاج یوں چٹکیوں میں بتلاتے ہیں۔ چکبست لکھنوی کو بیالیس برس میں ریلوے اسٹیشن پر اسٹروک ہوا تھا۔ کئی ایک معروف تخلیق کار عدم احتیاط کے باعث جان سے گئے۔

آغا گل (کوئٹہ)

گلزار جاوید صاحب، السلام علیکم۔

چار ماہ بعد کچھ پڑھنے لکھنے کے لیے بیٹھنے کے قابل ہوا تو آپ کا ''چہارسو'' (ستمبر، اکتوبر ۲۰۱۹ء) نظر نواز ہوا اور مطالعے سے دلچسپی پیدا ہوتی گئی۔ ذکیہ مشہدی جیسا مشہور نام بھلا کون نہیں جانتا! قرطاسِ اعزاز کے ذریعے انہیں جاننے کا مزید موقع ملا۔ پھر ذکیہ کی افسانہ نگاری پر نامور نقاد شمس الرحمان فاروقی کی تحریر نے صرف چار صفحات میں اُن کے بارے میں بہت کچھ منکشف کردیا جبکہ کہانی سے ملاقات میں آصف فرخی نے واقعی ذکیہ سے باقی پوری ملاقات کروا دی۔ پارسا بی بی کا بگھار اگرچہ کہنے کو تو ناولٹ کا ایک باب ہے مگر دیکھو تو ایک بھرپور ناول کا لطف دے رہا ہے۔

افسانے اس بار بھی آپ کی نگاہ انتخاب کی دلیل ثابت ہوئے۔ ''ملکی رام لاہوریہ'' ایک نامور افسانہ نگار، ادیب وشاعر کے لائق فرزند کا شاہکار تھا۔ ڈاکٹر یحییٰ جمیل کا افسانہ ''واپسی'' شروع سے آخر تک تحیر اور سسپنس سے بھرپور رہا جس کا تسلسل ایک جاسوسی کہانی سے کسی طرح کم نہ تھا۔ ابھی تھوڑی دیر قبل پڑھ کر اٹھا ہوں تو اس وقت رات کے ایک بج رہے ہیں اور فوراً لکھ کر کل پوسٹ کرنے کی لگن میں خط ختم کررہا ہوں۔ گزشتہ شمارے کے بارے میں کچھ تورس رابطے کے ذریعے پتہ چل گیا ہے باقی آپ کے وعدے کے مطابق اگر شمارہ مل جائے تو لطف حاصل کروں گا۔

غالب عرفان (کراچی)

گلزار جاوید بھائی، السلام علیکم۔

''چہارسو کا تازہ شمارہ اپنی ادبی روایت کے ساتھ نظر نواز ہوا۔ سرورق پر ذکیہ سلطانہ مشہدی کی تصویر اور صفحہ نمبر ۳ پر محترمہ الطاف فاطمہ کی مختصر تحریر پڑھ کر کئی گنا زیادہ خوشی ہوئی۔ خطوط کے بعد ''براہِ راست'' کو توجہ سے پڑھا۔ آپ سوالات یقیناً اہلِ قلم کی نگارشات سے نظریۂ فن کشید کر کے تخلیق کرتے ہیں ذکیہ مشہدی صاحبہ کا دو تین سوالوں پر برہم ہونے کا سبب میں یہ سمجھا ہوں کہ وہ سوال کی گہرائی نہیں سمجھ سکیں۔ اور جن سوالوں پر خاموش رہیں؟ وہ مسلم ہیں ہندوستان میں رہتے ہوئے اُن کی سماجی وسیاسی مجبوریاں بھی ہیں۔ آپ نے اعلیٰ ظرفی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اُن کے وہ جوابات بھی شامل کیے ہیں جن میں انہوں نے کچھ ترش باتیں بھی کی۔ ذکیہ مشہدی ایک صاحبِ مطالعہ لکھاری ہیں انہیں زبان وبیان پر عبور حاصل ہے ان کی جو دو چار کہانیاں پہلے پڑھی تھیں جنہوں نے متوجہ کیا تھا ''پارسا بی بی کا بگھار'' (ناولٹ کا ایک باب) پڑھ کر لطف آ گیا ان کی تحریر کلاسیکی نثری ادب کی چمک دمک سے مزین ہے۔ شمس الرحمان فاروقی، ڈاکٹر آصف فرخی، محمد سلیم الرحمان کے مضامین ذکیہ مشہدی کے فکر وفن کے حوالے سے خصوصی اہمیت کے حامل ہیں۔

رینو بہل کا اہم موضوع پر افسانہ ''رشتوں کی کربلا'' ایک کرب ناک حقیقت ہے یہ تلخ حقیقت ہر اُس ملک کی ہے جہاں عام انسان غربت اور جہالت میں پس رہے ہیں۔ جہاں کے حکمران اپنی عیاشیوں میں مست ہیں انہوں نے عوام کے لیے کچھ نہیں سوچا۔ موضوع پر گرفت شاندار ہے۔ ملکی رام لاہوریہ کے نام سے پرویز شہریار کی تحریر متاثر کن ہے مگر اسے افسانہ کہتے ہوئے ذرا سوچنا پڑے گا۔

سیما پیروز کا افسانہ ''زبیدہ لاج'' افسانہ کیا ہے ہماری تہذیبی اور مشرقی شعار کی تصویر ہے جس میں خاندان یک جا ہوتے تھے رشتوں کا تقدس اور گھر کی اہمیت تھی ترقی کے خواب نے سب کچھ بدل کر رکھ دیا ہے۔ کچھ ہماری معاشرتی اور معاشی صورت حال نے بھی مجبور کیا ہے ''صدف'' کا کردار خوب بُنا ہے۔ فوزیہ ملک کا افسانہ ''خالی ہاتھ'' اچھا ہے۔ عبداللہ جاوید، آصف ثاقب، ڈاکٹر قاسم جلال، رؤف خیر، عارف شفیق کی غزلوں میں جدید دنیا کے سیاسی و سماجی مسائل کی سنگینیاں ہیں:

ہوتا ہے ہر روز جہاں انصاف کا خون
ہر بستی میں ایسی ایک کچہری تھی
(عارف شفیق)

عقیدت ہے زبانی جمع و خرچ ان خام کاروں کی
حقیت میں حقیقت کھل گئی بے روح نعروں کی
(رؤف خیر)

نصیر ترابی، زیبا سعید، سحر تاب رومانی، اشرف جاوید، ہارون الرشید اور ڈاکٹر نبیل احمد نبیل کی غزلوں کے اشعار میں جستجو اور اپنائیت کی کیفیت ہے:

اگرچہ کچھ نہیں امکان میں تھا
مگر میں اپنے پاکستان میں تھا
(سحر تاب رومانی)

جہاں میں عشق کیا ٹوٹ کر تو تجھ سے کیا
کہ زندگی کو کہیں مبتلا تو ہونا تھا
(ہارون الرشید)

شوق انصاری کی نظم ''حج پہ حج'' بے عمل اور نمود و نمائش امیر زادوں کے عمرے اور حج اور دکھاوے کی عبادت پر حقیقی طنز ہے۔ تسنیم کوثر کی نظم ''کچھ تو ہیں زمانے کے'' میں عشق کی دبی چنگاری کو ہوا دی ہے۔ ڈاکٹر یوگیندر بہل تشنہ اور یونس شرر کی نظمیں بھی متاثر کرتی ہیں۔ ڈاکٹر فیروز عالم انتہائی مفید اور اہم معلومات بڑی آسانی سے عام قاری تک پہنچا رہے ہیں۔ یوگیندر بہل تشنہ کا یہ کہنا مناسب ہے:

''طبی مضامین کو کتابی شکل دے کر ہر گھر کے لیے لازمی قرار دے دوں۔''

دیپک کنول نے اس بار داستانِ جستجو کامیابی کے بجائے مدھو بالا کی دلیپ کمار صاحب سے داستان عشق سنائی ہے۔ مامون ایمن نے پروین شیر کی لاجواب کتاب ''بے کرانیاں'' کی چند نظموں پر کمال کا تجزیہ کیا ہے گو کہ تجزیہ مختصر ہے۔ ''بے کرانیاں'' کی امتیازی خصوصیت اردو نظم، انگریزی ترجمہ اور دل کش پینٹنگ ہیں۔ کتاب ظاہری باطنی اور معنوی رنگوں سے مالا مال ہے۔ عقیل دانش نے محترمہ رضیہ اسماعیل کی کتاب ''مٹی کی آواز'' پر تعارفی تبصرہ کیا ہے۔

نوید سروش (میر پور خاص)

محترم گلزار جاوید صاحب، سلام مسنون۔

''چہارسو'' حسب معمول ادبی سج دھج کے ساتھ موصول ہو کر سببِ راحت دل و جاں ہوا۔

سب سے پہلے میں مشرف عالم ذوقی صاحب کے مضمون 'اک سپنے کا انت'' میں محترمہ کرشنا سوبتی جی کو زبردست خراج عقیدت پیش کرنا چاہوں گا جنہوں نے اس انسانی اقدار کے تحفظ کی خاطر حکومت ہند کے سامنے بڑے بڑے سول ایوارڈ ''پدم بھوشن'' کو وصول کرنے سے انکار کیا ورنہ عمومی مشاہدہ یہی ہے کہ اکثر ادیب، شاعر ایسے انعامات کے حصول کی خاطر بڑے ہاتھ پاؤں مارتے ہیں۔ بلاشبہ مرحومہ ایک بڑی فنکار اور اس سے بھی بڑی انسان تھیں۔ خدا تعالیٰ اُن پر رحمتیں نچھاور کرے۔

جمیل احمد عدیل صاحب نے ''پوسٹ ماڈرن درویش'' کا کئی پہلوؤں سے جائزہ لے کر بڑے معلوماتی انداز میں تعارف کروایا۔ ڈاکٹر اورنگ زیب نیازی صاحب کی تصنیف یقیناً گراں قدر ہوگی۔ موقع ملا تو ضرور مطالعہ کروں گا۔ محترم انل ٹھکر، محترمہ عذرا اصغر، محترمہ طاہرہ اقبال، جب بشیر مالیر کوٹلوی، محترم حامد سراج اور محترم گلزار جاوید بلاشبہ دور حاضر کی ابجر اور قد آور ادبی ہستیاں ہیں۔ چھے کے چھے افسانے عمدہ تحریریں ہیں۔ جگہ کی قلت کے باعث فرداً فرداً تبصرہ محال ہے۔ لیکن ''برگِ آوارہ''، ''اونچے نیچے لوگ'' اور ''جشنِ بیقراری'' بے حد اثر انگیز اور دل کو چھونے والی تحریریں ثابت ہوئیں۔

ڈاکٹر فیروز عالم صاحب انسانی صحت بارے اور دیپک کنول صاحب بھارتی فلم انڈسٹری کی کسی معروف ہستی کے تذکرے سے ثواب کمانے میں مگن ہیں۔ دونوں حضرات کا بہت بہت شکریہ۔

جناب سید ولی (شاہین) صاحب کو ''چہارسو'' میں متعارف و روشناس کروا کر آپ نے ادبی قارئین پہ بہت بڑا احسان کیا۔ اُن کے احباب اور ہم عصر ادباء نے ان پر جو مضامین رقم کیے اُن میں شاہین صاحب کی علمی و ادبی خدمات اور ان کی شخصیت کے کئی پہلوؤں کی وضاحت ہوئی ہے۔ اردو ادب کے لیے ان کی خدمات بلاشبہ قابلِ ستائش ہیں۔

نیئر اقبال علوی (لاہور)

گلزار جاوید صاحب، آداب۔

پہلی بات تو یہ کہ آپ چہارسو کے ذریعہ جس طرح دلوں کو جوڑنے کا کام کر رہے ہیں اُس کی جتنی بھی داد دی جائے کم ہے مگر خواتین قلمکاروں کو ساتھ لے کر چلنا آپ کی اضافی خوبی ہے جس کے لیے دلی دعائیں قبول کیجیے۔ اس بار آپ کی دعوت اور میری درخواست پر محترمہ ذکیہ مشہدی نے جس بھرپور طریقے اور کم وقت میں قلمی تعاون کیا یہ بھی اردو ادب میں اپنی مثال آپ ہے۔ یقیناً ذکیہ مشہدی کا شمار آج کی بلند پایہ افسانہ نگار خواتین اور مرد کے اختصاص کے بغیر بلند آہنگی سے کیا جاتا ہے۔ آپ نے جس خوبصورتی اور فراخ دلی سے مواد اور سرورق کو سجایا اُسے دیکھ کر دل خوش ہو گیا۔ اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ۔

رینو بہل (چنڈی گڑھ)

..... عالمی اردو ادب .....

''گزشتہ سال ۲۰۱۸ء میں ہم بہت سی ایسی ادبی شخصیات سے محروم ہوگئے جنھوں نے تاریخِ اردو میں ایسے نقوش جاوداں ثبت کیے ہیں جنھیں ہم کبھی فراموش نہیں کرسکیں گے۔ ڈاکٹر سلیم اختر، قاضی عبدالستار، فضیل جعفری، فہمیدہ ریاض، ساقی فاروقی، محمد علوی، پروین عاطف، حامدی کاشمیری، الطاف فاطمہ اور آغا سلیم قزلباش ان میں خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ یہ ایسی ہستیاں ہیں جن پر کئی کتابیں بھی لکھی جائیں تو بھی ان کے فن وشخصیت کا احاطہ نہیں کیا جاسکتا۔ انہوں نے کئی عشرے تک اُردو ادب کی خدمت کی اور تاریخ ادب میں ایک بلند مقام حاصل کیا جہاں بہت کم ادباء کو پہنچنا نصیب ہوتا ہے۔'' ..... نند کشور وکرم

(پون صدی پر محیط جناب نند کشور وکرم کی وسیع المشربی اور ادبی وعلمی خدمات کا سفر بالآخر ۱۲۔ستمبر ۲۰۱۹ء کو تمام ہوا۔ یہ عالمی اردو ادب کا آخری شمارہ ہے جسے وکرم صاحب نے زندگی کے آخری ایام میں ترتیب دیا اور وفات سے چند روز قبل تمام احباب کو اپنے ہاتھوں سے سپردِ ڈاک کر کے سفرِ آخرت پر روانہ ہوگئے۔ بلاشبہ وکرم صاحب جسمانی طور پر ہمارے درمیان موجود نہیں رہے مگر بے پناہ علمی کارناموں کے سبب وہ ہمارے دلوں میں روشنی بن کر زندہ وتابندہ رہیں گے۔)

..... ادارہ

..... جَسّی .....

برسوں سے دل میں یہ خواہش پل رہی تھی کہ ایک ناول بھی تخلیق کروں۔ اللہ نے یہ تمنّا بھی پوری کردی۔ ناول جَسّی آپ کے ہاتھوں میں دعوتِ مطالعہ دے رہا ہے۔ مجھے اپنے پیارے پیارے پنجاب سے بے حد شغف ہے جس کا اظہار میں نے اس ناول میں کیا ہے۔ پنجاب کے لوگ جی بھر کر اور زندہ دلی سے جینے کا ہُنر جانتے ہیں۔ پنجاب کے چھوٹے بڑے موسمی تیوہار مثلاً لوہڑی، بیساکھی اور بسنت وغیرہ دنیا بھر میں مشہور ہیں ان کی بڑی خوبی یہ ہے کہ ان تیوہاروں کا کوئی مذہب نہیں۔ دوسرے الفاظ میں یہ کہ بلا امتیاز مذہب وملّت یہ تیوہار ہر پنجابی مناتا ہے۔ پنجاب میں شادی بیاہ کی رسمیں تو بہت ہی دلچسپ ہوتی ہیں، جیسے دولہا دلہن پر پانی وارنا، چھٹیاں کھیلنا، کنگنا کھیلنا اور چوتھی بہت ہی دلچسپ اور مزے دار رسم ہے ''جاگو'' جو شاید دنیا کے کسی بھی ملک میں نہ پائی جاتی ہو۔ میں نے ان چھوٹی بڑی رسموں اور روایتوں کی اس ناول میں تصویر کشی کی ہے۔ ممکن ہے مجھ سے پہلے یہ کوشش کسی نے نہ کی ہو۔ اسی لیے میں پنجاب کی تہذیب کے ان دلچسپ اور سُنہرے حصّوں کو اردو ادب کی نذر کر رہا ہوں تاکہ یہ رسمیں بھی ادب میں سانس لے سکیں۔ ناول کی تخلیق کے بارے میں بات کریں تو تقسیم کے بعد پنجاب میں بہت کم ناول منظرِ عام پر آئے ہیں۔

.....محمد بشیر مالیر کوٹلوی

اشاعت: ۲۰۱۸ء، قیمت: ۱۵۰ روپے، دستیابی: عرشیہ پبلی کیشنز، دلشاد کالونی، دہلی۔

..... لوح .....

آج کل کے مادّہ پرست کساد بازاری کے دور میں علم وادب کی خدمت بجائے خود ایک کارنامہ ہے مگر جناب ممتاز شیخ نے اہلِ ادب کے لیے قریب سات سو صفحات پر مشتمل سہ ماہی ''لوح'' کی اشاعت جنوری تا جون ۲۰۱۹ء کو ضخامت کے ساتھ نفاست اور دریا کو نہیں بلکہ سمندر کو کوزے میں بند کرنے کی نہایت کامیاب کوشش کی ہے۔ کرم اے شہہ عرب وعجم (حمد ونعت)، محبت جوامر ہوگئی (مادرِ علمی کے لیے)، نہیں منت کشِ تاب شنیدن داستاں میری، قرطاس پہ جہاں دگر بھی ہیں (تراجم)، اب دو عالم سے صدائے ساز آتی ہے (فلم وموسیقی)، یہی تو ٹوٹے دلوں کا علاج ہے (طنز ومزاح)، خال وخط یار کے (خاکہ)، غیبی منظر پار کا، رستہ سخن سوار کا (کافیاں)۔ الغرض علوم وفنون کا ایسا دلکش مجلد خزینہ ترتیب دے دیا ہے کہ جس کی مثال مشکل سے ملے گی۔

.....انوار شریف

اشاعت: ۲۰۱۹ء، قیمت: ۱۰۰۰ روپے، دستیابی: رہبر پبلشرز، اردو بازار، کراچی ودیگر۔

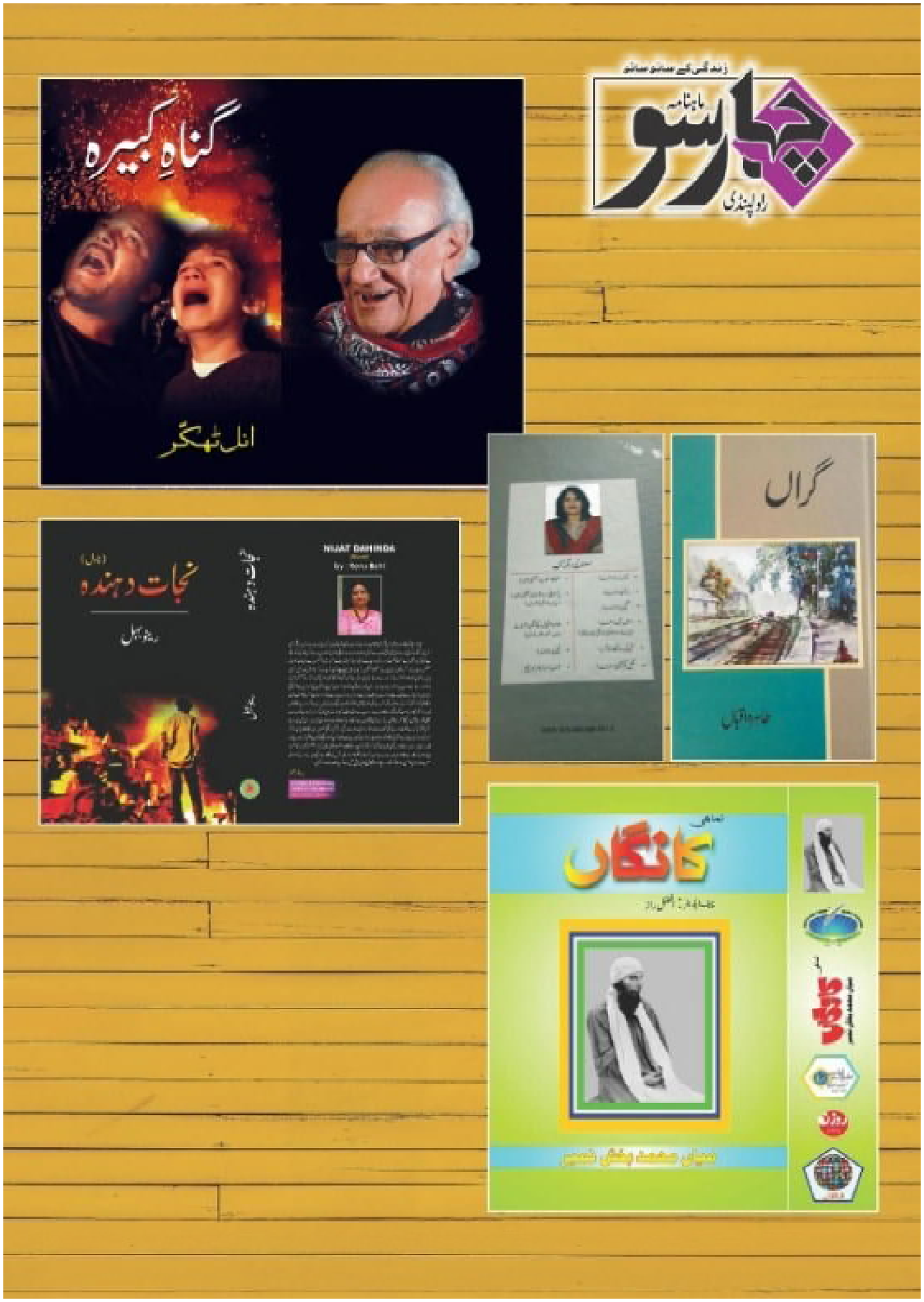

زندگی کے ساتھ ساتھ
ماہنامہ
چہارسو
راولپنڈی
گناہِ کبیرہ
انل ٹھکر
نجات دہندہ
NIJAT DAHINDA
گراں
کانگاں